اسلامی نظامِ حیات

علمی کتاب خانہ ○
کبیر سٹریٹ
اُردو بازار لاہور ۲

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن پشاور و کراچی کے نصاب کے مطابق

اسلامی نظامِ حیات

Acc No. 15087 Date 6/1/11
Section .... Status ....
D.D. Class ....
NAJAFI BOOK LIBRARY

شیخ محمد اقبال

علمی کتاب خانہ
کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور ۲

جدید ایڈیشن

کتاب اسلامی نظام حیات
پبلشر مرکزی کتب خانہ پبلیکیشنز لاہور
پریس الحجاز پرنٹرز لاہور
قیمت :- ۲۷/۵۰ روپے

○

پیش لفظ

ایڈیشن ۱۹۸۴ء

اسلامی نظامِ حیات کے اس جدید ایڈیشن میں نظرِ ثانی کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ مراجع کی حتی الامکان دوبارہ تحقیق اور مواد کی اصلاح کی گئی ہے، زبان و بیان کی درستی و بہتری کے لیے اس عاجز نے ایک بار پھر سعی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

نیازکیش
شیخ محمد اقبال ابن شیخ سکندر دین

ایڈیشن ۱۹۸۶ء

اسلامی نظامِ حیات کے اس جدید ایڈیشن میں مزید نظرِ ثانی کی گئی ہے۔ طلبہ کے نقطۂ نظر سے کچھ ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے۔ شیخ محمد اقبال مرحوم کی جگہ یہ کام اس ناچیز کو کرنا پڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے۔

احقر العباد
پروفیسر خان محمد چادلہ
شعبۂ عربی و اسلامیات
گورنمنٹ کالج۔ لاہور

○

عنوانات

اسلامی نظامِ حیات

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	اسلامی زندگی	
۲	وحدتِ حیات	
۳	اسلامی زندگی کا نظام	
۴	عناصرِ ترکیبی	
۵	ایمان	
۶	ارکانِ اسلام	
۷	اخلاق	۱
۸	آداب	۵
۹	اسلامی تہذیب و تمدن	۷
۱۰	زندگی کے دوائر	۲۲
۱۱	فرد	۲۳
۱۲	تقویٰ	۲۴
۱۳	ذکر	۳۷
۱۴	صبر	۴۹
۱۵	تحمّل	۶۳
۱۶	شکر	۷۵
۱۷	عفو	۸۷
۱۸	عدل	۹۵
۱۹	احسان	۱۰۹
۲۰	تدبّر	۱۱۹
۲۱	خدمتِ خلق	۱۳۰
۲۲	عائلی زندگی (کنبہ)	۱۳۸
۲۳	حقوقِ اولاد	۱۴۶
۲۴	حقوقِ والدین	۱۵۱
۲۵	زوجین	۱۵۹
۲۶	اسلامی نظامِ تعلیم	۱۷۴
۲۷	مسجد	۱۸۵
۲۸	مکتب	۱۹۰
۲۹	استاد اور شاگرد کے حقوق و فرائض	۱۹۶
۳۰	معاشرہ	۲۰۴
۳۱	اقارب	۲۱۰
۳۲	ہمسایہ	۲۱۶
۳۳	شہری	۲۲۴
۳۴	ریاست	۲۳۶
۳۵	امّت	۲۴۵
۳۶	اخوّت	۲۵۲
۳۷	تبلیغ	۲۶۰
۳۸	جہاد	۲۶۸

وحدتِ حیات

اسلام زندگی کو وحدت کے طور پر قبول کرتا ہے۔ زندگی کے بے شک کئی شعبے ہیں لیکن ان کی ایک وحدت ہے، یہ سب شعبے باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر رہتے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے انفرادی اور معاشرتی زندگی کا ایک مشترکہ اور وحدانی نظام ہے اس نظام سے جو رکن الگ اور بے قید ہو جائے وہ بگاڑ کا موجب بن جاتا ہے۔

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے نظری اور عملی ہر دو لحاظ سے ایک کامل نظامِ حیات پیش کیا ہے، اس نظام کے اندر روح بدن سے اور بدن روح سے وابستہ ہو کر زندہ رہتا ہے، اس نظام میں اخلاق قانون پر اور قانون اخلاق پر مبنی ہے۔ فرد ملت سے اور ملت فرد سے قائم ہے، اسلام کی نگاہ میں ہر وہ دل جس کی حرکت اُمت کی دھڑکن پر نہیں ہے ایک بے جان پتھر کے مانند ہے یا اس سے مردہ تر۔

ارشادِ ربانی ہے:

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ط (۳۱ : ۲۸)

ترجمہ:۔ تمہارا پیدا کرنا اور اٹھانا ایک ہی جان کی طرح ہے۔

انسان کے دل میں وحدتِ حیات کا احساس پیدا ہو جائے تو اس کے ذہنی اور جسمانی نظام ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، فکر کے دوائر ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں، فکری انتشار اور ذہنی ابتری معدوم ہو جاتی ہے، انسان نہ صرف اپنا بلکہ ہر شے کا مقام متعین کر لیتا ہے۔ وہ ظلم اور بے اعتدالی سے گریزاں رہتا ہے۔

اِسلامی زندگی کا نظام

عناصرِ ترکیبی

زندگی کے متعدد دائرے ہیں، مثلاً ایک دائرہ فرد کا ہے، ایک گھر کا، ایک معاشرہ کا، ایک حکومت کا۔ یہ دوائر ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں، اسلام نے ان کے لئے کچھ ضوابط مقرر کئے ہیں۔ ان ضوابط کی دو قسمیں ہیں یعنی اخلاقی اور قانونی۔ اگر اخلاق کی آزادی چھین کر اس کو قانون کی چار دیواری میں بند کر دیا جائے تو اس کی روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔ اگر قانون کو اخلاق ہی کے آسرے پر چھوڑ دیا جائے تو قانون کا سارا زور ختم ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کو اپنی حدود میں رکھا جائے اور ایک دوسرے پر بڑھنے کی اجازت نہ دی جائے تو باہم فائدہ رساں رہتے ہیں۔

اسلامی زندگی کا اوّلین نصب العین اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیر عبادت ہے۔ یہ نصب العین عمدہ اخلاق سے حاصل ہوتا ہے۔ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ صَالِحَ الْاَخْلَاقِ[1]

(مجھے صرف اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں)

غور سے دیکھا جائے تو قانون کے مقابلہ میں اصل، مستقل اور دائم حیثیت اخلاق کو حاصل ہے۔ قانون اخلاق کا پاسبان ہے، لیکن اس پاسبان کا وجود اس قدر لابُدی ہے کہ اس میں بھی ایک مستقل اور دائم مقصدیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قانون اخلاق کی فصیل ہے۔ اخلاق کی سالمیت کے لئے اس فصیل کے بغیر چارہ نہیں لیکن فصیل کی پناہ لینے والے جب تک فصیل کی خبر گیری نہ کرتے رہیں یہ کمزور پڑ کر گر جاتی ہے۔ اخلاق کا فرض ہے کہ قانون کی فصیل کی نگہبانی کرے جس طرح اخلاق کے بچاؤ کے لئے قانون کی پناہ ناگزیر ہے، اسی طرح قانون کی حفاظت کے لئے اخلاق کی مدد کے بغیر چارہ نہیں۔

کوئی نظامِ فکر یا نظامِ عمل اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا؟ جب تک اس کے پیروؤں

---

[1] الجامع الصغیر سیوطی وکنوز الحقائق مناوی

کے ذہن میں اس کا کم از کم ایک مختصر خاکہ نہ ہو اور اس خاکے کی افادیت پر ان کا پورا یقین نہ ہو۔ اسلامی نظامِ حیات کی کامیابی کے لئے بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لازم قرار دیا ہے کہ ہر مسلمان کے ذہن میں اس کا بنیادی خاکہ ہو، اور اس پر خالص اور غیر متزلزل یقین ہو۔ ایسے یقین کو دین کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ بنیادی خاکہ ارکانِ اسلام پر مشتمل ہے۔ اس خاکے میں اخلاق اور قانون کا رنگ بھر کر زندگی کا مقدس اور دلآویز نقشہ تیار کیا جاتا ہے۔

الغرض اسلامی زندگی کے مندرجہ ذیل عناصر ترکیبی ہیں:

(۱) اجزائے ایمان (۲) ارکانِ اسلام

(۳) اخلاق (۴) آداب

ان عناصر سے زندگی کی جو صورت قائم ہوتی ہے اس کے خدوخال کو تہذیب کہیں گے۔

۱۔ ایمان

ایمان کے معنی ہیں دل سے ماننا یا تصدیق کرنا۔ ایمان کے پانچ اجزاء ہیں جن کا تعلق عالمِ غیب سے ہے۔ غیب اس عالم کو کہتے ہیں جس کا علم انسان کو براہِ راست حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایمان کے پانچ اجزاء ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان (۲) ملائکہ پر ایمان (۳) آسمانی کتب پر ایمان

(۴) اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان (۵) آخرت پر ایمان

ان پانچ چیزوں کے بارے میں صاف اور صحیح تصور ہونا چاہیئے ورنہ انسان گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اجزائے ایمان تشکیلِ ملت کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُمت کے اذہان میں ان یکساں اور بنیادی تصورات کے ہوتے ہوئے افتراق یا انتشار کا نمودار ہونا ممکن نہیں۔

۲۔ ارکانِ اسلام

ارکانِ اسلام پانچ ہیں:

(۱) کلمۂ طیبہ یا کلمہ شہادت (۲) نماز (۳) زکوٰۃ

(۴) صیام (۵) حج

جس طرح اجزائے ایمان انسان کی جذباتی اور ذہنی دنیا کی بنیاد ہیں۔ اسی طرح ارکانِ اسلام عملی زندگی کی بنیاد ہیں۔

اسلام کے لغوی معنی ہیں، اپنے کو سپرد کر دینا۔ اصطلاح میں اسلام کے معنی ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پیروی کرنا۔ یہ پیروی ارکانِ اسلام کی بجا آوری کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص ارکانِ اسلام کو پورے طور سے بجالانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے دل میں نیکی کے لئے شدید جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے نیکی میں راحت اور مسرت محسوس ہونے لگتی ہے، وہ نیکی محض نیکی کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے انجام دیتا ہے۔ اس کو نیکی پر مجبور کرنے کی حاجت نہیں ہوتی اور نہ اسے گردن سے پکڑ کر برائی سے ہٹانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اجزائے ایمان اور ارکانِ اسلام کی اگر پوری پابندی کی جائے تو دنیا میں قانون اور پولیس کی قطعاً ضرورت نہ ہو۔ لیکن انسان آخر انسان ہے، اس سے لغزشیں اور کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں، اس لئے قانون اور حکومت کی اخلاقی اور انتظامی نگرانی کے بغیر چارہ نہیں۔

۳۔ اخلاق

مفہوم

اَخلاق جمع ہے خُلقُ یا خُلق کی

خُلق کے معنی ہیں: طبع۔

اَخلاق اُن اعمال اور اوصاف کو کہتے ہیں جو طبیعت کا جزو ہو جائیں۔

رذائل سے بچنے اور فضائل سے آراستہ ہونے کا نام حسنِ خُلق ہے۔ مثلاً جھوٹ سے احتراز کرنا اور صداقت کو اختیار کرنا حُسنِ خلق ہے، اخلاق کے رذائل و فضائل کے بارے میں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ صرف رذائل سے بچنا ضروری نہیں بلکہ اسلام ہر اس شے سے دور رہنے کا حکم دیتا ہے جو رذیلت کی طرف مائل کرتی ہے۔ جہاں تک فضائلِ اخلاق کا تعلق ہے یہ ضروری ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی چھوٹا نہ سمجھا جائے۔

اخلاق کے بعض امور ایسے ہیں جن میں اسلام نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے لیکن بعض امور میں قانونی پابندیاں لگا دی ہیں تاکہ لوگ بالکل بے پروا اور بے خوف نہ ہو جائیں۔ یہی قانون اور اخلاق کی حدِ فاصل ہے۔

اسلامی فلسفۂ اخلاق کے امتیازات

اسلام نے اخلاق کا ایک جامع و مانع نظام پیش کیا ہے۔ دیگر ادیان نے بھی اخلاقی نظام پیش کئے ہیں، لیکن اسلام نے جو نظام پیش کیا ہے۔ اس کے کچھ الگ امتیازات و خصائص ہیں مثلاً:

(۱) عمل پذیری (۲) جامعیت (۳) تفصیل (۴) دوام

ان چاروں خصائل کا ہم فرداً فرداً ایک مختصر جائزہ لیں گے۔

۱۔ **عمل پذیری:** اسلام کا اخلاقی نظریہ آسانی سے عمل کے سانچے میں ڈھل سکتا ہے۔ یہ اخلاق دیوی دیوتاؤں کے ہی بس کی چیز نہیں بلکہ عام انسان بھی اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ یہ فلسفۂ اخلاق نہ صرف جناب پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کردار میں نمودار ہوا بلکہ صحابۂ کرام رضؓ بھی اس پر کامیابی سے کاربند ہوئے اور دنیا میں ثابت کر گئے کہ اسلام کا اخلاقی دستور کوئی ایسا دستور نہیں جو عمل کے دائرے میں نہ آسکے۔ اس کی مُو بہ مُو پیروی کی جا سکتی ہے۔

۲۔ **جامعیت:** اسلامی فلسفۂ اخلاق کی جامعیت کے دو پہلو ہیں، یعنی:

(ا) اس فلسفۂ اخلاق پر ہر طبقہ کے انسان عمل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ہمہ گیر دستورِ عمل مہیا کرتا ہے۔ امیر و غریب، بلند و پست، مالک و مملوک، عرب و عجم سب کے لئے اس کی پیروی ممکن ہے۔ اس کا سنگِ بنیاد نیت ہے۔ اللہ تعالیٰ جس چیز کی جزا دیتا ہے وہ نیت اور کوشش ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ

ترجمہ: اعمال تو صرف نیت سے ہیں۔

نیت ہمہ گیر چیز ہے، اس لئے اسلامی دستورِ اخلاق بھی ہمہ گیر ہے۔

(ب) اسلامی فلسفۂ اخلاق انسان کے سب احوال کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ آج دُکھ ہے، کل سُکھ، آج ایک آدمی دوست ہے، کل دشمن، آج دشمن غالب ہے کل مغلوب، غرض زندگی کے احوال بدلتے رہتے ہیں۔ اسلام بتاتا ہے کہ سکھ میں کیا چلن ہونا چاہیئے اور دُکھ میں کیا روش ہو۔ دشمن غالب آجائے تو کیا راستہ اختیار کرنا چاہیئے اور مغلوب ہو تو اس سے کیا سلوک کیا جائے اسلامی فلسفۂ اخلاق ہمیشہ ایک سے طرزِ عمل کی تلقین نہیں کرتا۔ کبھی نرمی، کبھی سختی، کبھی غصہ، کبھی عفو کی حاجت ہوتی ہے۔ اسلام ان سب بدلتے ہوئے احوال کے لئے جامع ہدایات دیتا ہے۔

۳۔ تفصیل : اسلامی فلسفۂ حیات نہایت پُر دامن ہے، زندگی کے کسی جزئیہ سے بے التفاتی نہیں کرتا۔ اسلامی نظامِ اخلاق میں اوّل تو ہر جزئیہ کے بارے میں الگ حکم مل جاتا ہے ورنہ ایسا کلیہ میسّر ہوتا ہے جس کے تحت اس جزئیہ کے خوب و ناخوب ہونے کے بارے میں آسانی سے فیصلہ ہو سکے۔

۴۔ دوام : اسلامی فلسفۂ حیات میں دائمی روح ہے، یہ کسی اور دَور کے احوال پر ہی نظر نہیں کرتا بلکہ قیامت تک کے ادوار کو پیشِ نگاہ رکھتا ہے۔ انسانی فطرت کے بنیادی خصائص چونکہ غیر متبدّل ہیں، اس لئے اس کے نفسیاتی اصول بھی تغیر قبول نہیں کرتے۔ اسلام نے نفسیاتی اصول کو سامنے رکھ کر دستورِ اخلاق وضع کیا ہے جو قیامت تک ہر عہد اور ہر انقلاب میں رہنمائی انجام دے گا۔

اسلامی دستورِ اخلاق کے بنیادی اصُول میں کوئی لچک نہیں۔ ہر دَور کے انسان کو ان کی پابندی لازم ہے البتہ فروع میں اسلامی اصُول کی روشنی میں تبدیلی ممکن ہے تاہم یہ تبدیلی ایسی نہ ہو کہ اسلام کی روح سے ناسازگار ہو جائے۔

اسلام میں اخلاق کی اہمیّت

اخلاق کو اسلام میں کس قدر اہمیّت حاصل ہے، اس کا اندازہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان سے کیجئے کہ مجھے مبعوث ہی اسی لئے کیا گیا ہے کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں۔

اخلاق گویا اسلام کا دوسرا نام ہے۔

حسنِ اخلاق کے بارے میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے نہایت تاکیدی احادیث منقول ہیں۔ مثلاً :

۱۔ اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ (مسلم)

ترجمہ : نیکی حُسنِ خُلق ہے۔

۲۔ تم میں بہترین وہ ہیں جو اخلاقاً بہترین ہیں (متفق علیہ)

۳۔ قیامت کے روز بندے کے ترازو میں حسنِ خلق سے بڑھ کر کوئی شے وزن دار نہ ہو گی، اور یقیناً اللہ تعالیٰ کو ناشائستہ اور بد کلام شخص ناپسند ہے (ترمذی)

۴۔ ایک دفعہ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے کسی نے پوچھا کہ سب سے بڑھ کر کیا چیز جنّت میں لے جاتی ہے؟ فرمایا، اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اور حُسنِ خلق (ترمذی)

۵۔ اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا (ترمذی)

ترجمہ: مومنین میں کامل ترین ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں خوب ترین ہے۔

۶۔ مومن اپنے حسنِ خلق سے روزہ دار نمازی کا درجہ پالیتا ہے۔ (ابوداؤد)

۷۔ ایک بار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو اپنے خلق کو سنوار لے میں اس کے لئے خلدِ بریں میں گھر کا ذمہ لیتا ہوں۔ (ابوداؤد)[1]

جناب ہادی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اُسوۂ حسنہ ہے، آپؐ حسنِ اخلاق کی معراج پر تھے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کا آپؐ سے ارشاد ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (۶۸:۴)

ترجمہ: اور آپؐ یقیناً خُلقِ عظیم پر ہیں۔

ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے پوچھا گیا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلق کیسا تھا۔ آپ نے سائل سے پوچھا، کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ انہوں نے جواب دیا، پڑھتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلق قرآن تھا۔[2]

نیکی

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حُسنِ خُلق اور بِرّ کو ایک چیز قرار دیا ہے[3]۔ بِرّ کو اردو میں نیکی کہتے ہیں۔ اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی ہی ہے جو مومن اور غیر مومن یا منافق میں امتیاز قائم رکھتی ہے۔

نیکی چھوٹی ہو یا بڑی، اس کے اکتساب کے لئے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیئے، کیا معلوم اس دنیا سے کس وقت کوچ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند ارشادات درج ذیل ہیں:

۱۔ نیکی کی کسی بات کو حقیر نہ جان، چاہے یہ تیرا اپنے بھائی سے کھلے چہرے کے ساتھ ملنا ہی کیوں نہ ہو۔[4]

۲۔ آگ سے بچاؤ کرو چاہے کھجور کے ایک ٹکڑے ہی سے ہو۔ اگر یہ بھی نہ ملے تو اچھی بات ہی سہی۔[5]

---

[1] یہ احادیث ریاض الصالحین باب حُسن الخُلق سے لی گئی ہیں۔ [2] مسلم، کتاب الصلوٰۃ
[3] ریاض الصالحین [4] مسلم [5] ریاض الصالحین (بحوالہ مسلم و بخاری) باب کثرۃ طرق الخیر

۳۔ ایک شخص جارہا تھا کہ رستہ میں ایک خاردار شاخ دیکھی۔ اس نے یہ شاخ پرے کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نیکی قبول کی اور اس کی مغفرت فرما دی[1]

نیکی کا تقاضا ہے کہ اس کو پھیلایا جائے۔ سورۃ العصر میں انسانی تاریخ کی طرف توجہ دلا کر یہ زرّیں اصول بتایا گیا ہے کہ وہی لوگ بار آور زندگی گزارتے ہیں جو صاحبِ ایمان اور صاحبِ کردار ہیں۔ نیز ایک دوسرے کو حق اور ثابت قدمی کی تلقین کرتے ہیں۔

اپنی ذات کی شرافت میں محدود رہ جانا کوئی شرافت نہیں۔ مسلمان کو لازم ہے کہ باقی دنیا میں بھی نیکی کا چراغ روشن کرے جس سے خویش و بیگانہ اور دوست و دشمن سب فیض یاب ہوں۔ ہادیِ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا اس پر عمل کرنے والے کی طرح ہے۔

۴۔ آداب

(عربی زبان میں آداب کا لفظ تہذیب کے ہم معنی ہے۔ حدیث کے مجموعوں میں آداب کے حصہ میں جو عنوان ملتے ہیں وہ تہذیب و اخلاق پر بھی حاوی ہوتے ہیں، لیکن اردو میں اس کے معنی محدود ہیں۔ ذیل کی بحث اردو کے معنی کی رو سے ہے)

آداب زندگی کے حسن و قبح میں حد بندی کرتے ہیں۔ ان کے گوناگوں فوائد ہیں، مثلاً:

۱۔ آداب انسان کو یہ تربیت دیتے ہیں کہ اپنے مقام اور دوسرے کے مرتبہ کو بخوبی پہچانے۔ ان میں حد قائم کرے اور اس حد کو پامال نہ کرے۔

۲۔ آداب کا اخلاق سے گہرا تعلق ہے، آداب، اخلاق کے محافظ اور نگران ہوتے ہیں۔ وہ اخلاق کے لئے فصیل اور حصار کا کام دیتے ہیں۔

۳۔ آداب زندگی کی ایک خوشنما اور خوش ترتیب ہیئت قائم کرتے ہیں۔ اسے عرفِ عام میں وضع یا سلیقہ کہا جاتا ہے۔

آداب کے بغیر قوم سلیقہ سے عاری رہ جاتی ہے۔ اس سے امتیازی خصائص رخصت ہو جاتے ہیں۔ ہم آہنگی نہیں رہتی اتحادِ خیال کا جذبہ مٹ جاتا ہے۔ انتشار راہ پالیتا ہے اور قوم بجائے ایک انسانی گروہ کے جنگل کے بھانت بھانت کے جانوروں کا ریوڑ نظر آتی ہے۔ آداب قوم کی ظاہری ہیئت کو قائم کرتے ہیں اور ظاہری ہیئت جماعت میں اتحاد اور یک جہتی قائم کرتی ہے۔

---

[1] ریاض الصالحین (بحوالہ مسلم و بخاری) باب کثرۃ طرق الخیر۔

اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب نماز کے لئے صف بندی ہوتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

صفیں سیدھی رکھو اور پس و پیش نہ کھڑے ہو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔[1]

آداب کے لحاظ سے ملّتِ اسلامیہ ایک منفرد اور ممتاز شان رکھتی ہے۔ اگر وہ اپنے آداب و اطوار سے غافل ہو جائے تو اس شان سے محروم ہو جائے گی۔ جو قوم اپنی شان اور وقار کو خوشی سے کھو دے اس سے قومیت ہی فنا ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفّار سے مشابہت کی ممانعت فرمائی ہے۔

○

سوالات

۱۔ اسلام میں اخلاق کی کیا اہمیّت ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کیجئے۔

۲۔ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کیا ہے؟

۳۔ اخلاق اور قانون میں کیا فرق ہے؟ دونوں ایک دوسرے پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں؟

۴۔ اسلامی زندگی کے بنیادی عقائد اور افکار کیا ہیں؟

○

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصّلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف

اسلامی تہذیب و تمدن

کلچر کا مفہوم تہذیب کے سلسلہ میں آجکل ایک لفظ کا بہت شور سنا جاتا ہے۔ یہ کلچر ہے۔ آیئے اس لفظ کے مضمرات کا بھی ایک جائزہ لیتے چلیں۔

کلچر انگریزی لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی درج ذیل ہیں :

۱۔ زراعت

۲۔ کسی چیز کو تعلیم و تربیت یا نظم و ضبط وغیرہ کے ذریعے احسن یا عمدہ تر بنانا۔

۳۔ اخلاقی یا ذہنی قوتوں کی ترتیب یا نظم و ضبط۔

۴۔ تہذیب۔

۵۔ تہذیب کا ذہنی پہلو۔

۶۔ آداب، اطوار یا مذاق کو سنوارنا۔

۷۔ تہذیب کی تاریخ میں ایک خاص حالت یا مرحلہ۔

۸۔ کسی قوم یا معاشرتی تنظیم کے امتیازی پہلو۔

مذکورہ بالا معانی کی رُو سے کلچر زندگی کی صفائی اور نفاست کا نام ہے۔ قومی سطح پر صفائی اور نفاست کے علاوہ اس میں قوم کے نمایاں خط و خال بھی شامل ہوتے ہیں۔

یہ معنی لُغت کی رُو سے ہیں۔ لیکن جب سے اس لفظ کا دائرہ استعمال پھیلا ہے، اس کے معانی میں بہت وسعت آگئی ہے۔

ابتداء میں کلچر محدود معنی میں مستعمل تھا۔ اس کے بجائے سولائزیشن کے لفظ کا رواج زیادہ تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا میں سولائزیشن پر تو مقالہ موجود ہے لیکن کلچر کا ذکر نہیں۔ یہ اس لئے کہ کلچر پہلے سولائزیشن کا محض ایک پہلو سمجھا جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سولائزیشن کا ہم معنی ہوگیا۔ اب اس سے بھی وسیع تر ہے بلکہ اس سے اس کا اصلی مقام چھین کر اسے اپنے ایک جزو کی حیثیت دے رہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"کلچر متوارث دستکاریوں، مصنوعات، فنی کام کاج، خیالات، عادات اور اقدار پر مشتمل ہے۔ معاشرتی تنظیم کی صحیح سمجھ اسے کلچر کا ایک جزو قرار دے کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کلچر کے مادی سامان بذاتِ خود کوئی مکمل قوت نہیں۔ صنعتوں، آلات، اسلحہ اور دیگر مصنوعات کی تخلیق اور استعمال کی خاطر علم کی ضرورت ہوتی ہے جو بنیادی طور پر ذہنی اور اخلاقی انضباط سے وابستہ ہے۔ اس انضباط کا اصل سرچشمہ مذہب، قوانین اور اخلاقی قواعد ہیں۔"

یہی مقالہ نگار اپنے مضمون میں بتاتا ہے کہ زندگی کے سامان بنانے اور برتنے کے لئے معاشرہ میں تعاون کی ضرورت ہے۔ اس تعاون کے بدولت عملی نظامات وجود میں آتے ہیں جنہیں ادارے کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ادارے ہی کلچر کے حقیقی اجزا ہیں، ان میں استقلال اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ ان اداروں میں گھر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اسی سے نسلِ انسانی کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ کلچر سے رسوم و عادات اور پابندیوں کا بھی بہت تعلق ہے کیونکہ ان کی وجہ سے کلچر کی ہیئت بنتی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار نے کلچر کے مفہوم میں بہت اضافہ کیا ہے۔ وہ اس کو اقتصادی تنظیم، قانون، علم، کھیل، مشاغل، آرائش پر ختم نہیں کرتا بلکہ مذہب کو بھی کلچر میں شامل کرتا ہے۔ حالانکہ اب تک مغرب میں مذہب کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ سمجھا جاتا تھا۔ مقالہ نگار کو جو چیز فرد یا معاشرہ کی تنظیم اور اصلاح و ترقی کے لئے مفید نظر آتی ہے وہ اسے کلچر میں شامل سمجھتا ہے حتیٰ کہ جادو اور شعبدہ بازی کی تعریف میں کئی صفحے سیاہ کر دیئے ہیں۔

یورپ والوں کے ہاں کلچر کا تصور پہلے محدود تھا۔ اب وہ اس میں مذہب اور قانون تک کو شامل کر رہے ہیں۔

الفاظ بارہا معانی بدلتے ہیں یا ان کے معانی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی حال کلچر کا بھی ہے۔ ایک تو یہ محدود لغوی معنی رکھتا ہے جو شروع میں درج ہو چکے ہیں اور ایک اسے اب جدید اور ہمہ گیر معنی ملے ہیں جو ساری زندگی کو محیط ہیں۔

کلچر کے جدید معنی کے لئے عربی اور اردو میں کوئی لفظ نہ تھا۔ البتہ اس کے سابق محدود مفہوم کے لئے ثقافت اور آداب کے لفظ ضرور تھے جو اردو میں بھی درآمد ہوئے۔ کلچر کا جو مفہوم اب یورپ میں ہے۔ اس کے لئے ہمارے پاس کوئی لفظ موجود نہ ہونا چاہیئے تھا۔

دین اور کلچر کلچر کی تعریف میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ ہر قوم کا ایک الگ امتیازی کلچر ہوتا

ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کا بھی ایک جداگانہ امتیازی کلچر ہے۔ ہمارے ہاں اس کے معنی کچھ مختلف ہیں اور فرد سے لے کر جماعت، ریاست اور امت تک کو حاوی ہیں۔ اس چیز کے لئے ہمارے پاس ایک جامع لفظ نظامِ حیات موجود ہے اس کو ہم دین بھی کہتے ہیں کیونکہ دین زندگی کے رستے کا نام ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ یورپ کے لوگ آج مذہب کو کلچر کا سرچشمہ قرار دے رہے ہیں۔ ہم نے چودہ سو برس پہلے دین کو زندگی کا سرچشمہ قرار دیا تھا۔ بہرحال ہمارے ہاں اب بھی دین کا جو تصوّر ہے وہ کسی اور ملّت میں نہیں۔

دیگر زبانوں کے الفاظ قبول کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ ہم کلچر کا لفظ اپنی زبان میں داخل کر کے خسارے میں نہیں رہیں گے۔

اس تالیف میں ثقافت کا لفظ بھی کہیں جگہ آئے گا۔ یہ کلچر کے محدود معنی میں رائج ہے۔ ہم اس کے لئے تہذیب کا لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

تہذیب کا مفہوم

تہذیب کے لُغوی معنی ہیں :
چھانٹنا ، سنوارنا ، خالص کرنا

تہذیب کے لفظ نے آہستہ آہستہ معنی کے کنارے پھیلائے اور وسیع تر مفہوم پیدا کر لیا۔ اب یہ لفظ زندگی کے اطوار، رہن سہن، معاشرت اور سامانِ تمدن کو حاوی ہے۔

ہر قوم یا ملّت کی زندگی کا ایک ظاہری نقشہ ہیئت یا خدوخال ہوتے ہیں جو اسے دیگر اقوام سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس ظاہری نقشہ یا خط و خال کو ہم تہذیب کا نام دیتے ہیں۔

بنیادی لحاظ سے تہذیب کا لفظ کلچر کے زیادہ قریب ہے لیکن آجکل اسے سولائزیشن سے قرب حاصل ہے تاہم اب جس طرح کلچر کو سولائزیشن پر اور سولائزیشن کو کلچر پر پھیلایا جاتا ہے اسی طرح تہذیب کے معنی میں بھی لچک پیدا ہو سکتی ہے اور اسے بھی کلچر کی طرح پوری زندگی کی وسعت دی جا سکتی ہے۔

اچھی اور بری تہذیبیں

تہذیب کا لفظ اپنے لُغوی معنی کے اعتبار سے تو صرف اچھی تہذیب کے لئے استعمال ہونا چاہیئے لیکن اس کا وسیع تر مفہوم چونکہ ساری زندگی پر چھا چکا ہے اس لئے اس کی اچھی اور بُری دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔

اچھی اور بُری تہذیبوں میں نمایاں فرق ہے۔ ذیل میں ہم اچھی تہذیب کے چند اوصاف درج کرتے ہیں، ان سے بُری تہذیب کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔

اچھی تہذیب

اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی۔
مادّیت کا اسیر نہیں ہونے دیتی۔
پاکیزہ رکھتی ہے۔
صحت کی ضمانت دیتی ہے۔
فضول خرچی سے بچاتی ہے۔
رحم دلی سکھاتی ہے۔
غیور بناتی ہے۔
عزت بخشتی ہے۔

دین اور تہذیب

تہذیب کا سرچشمہ دین یا مذہب ہے۔
ہر مذہب ایک خاص مقصدِ حیات اور اندازِ فکر پیش کرتا ہے جو اس کے پیروؤں کی زندگی کو ایک الگ سانچے میں ڈھال دیتا ہے اور اسے ایک ہیئت عطا کرتا ہے یہ ہیئت سادہ ہو یا پُر تصنّع، اس کے کچھ نقش و نگار ہوتے ہیں جنہیں ہم تہذیب کہتے ہیں۔

ہندومت میں کئی دیوتاؤں کو معبود مانا جاتا ہے جن میں سے اکثر کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ شہزادگی کی زندگی گزار رہے ہیں اور انہیں سامانِ طرب سے بہت شوق ہے۔ چونکہ ہر ہندو کا مقصدِ حیات اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنا ہے، اس لئے ان کے ہاں رقص و موسیقی کا نہ صرف رواج ہے بلکہ اسے تقدس بھی حاصل ہے۔ اسی طرح ان کی تہذیب کے دیگر پہلوؤں پر بھی مذہب کا گہرا نقش ہے۔

عیسائیوں نے دین کو دُنیا سے الگ رکھا ہوا ہے، وہ دنیاوی زندگی میں مذہب سے آزاد ہیں، اس لئے مادی مُسرّت اُن کی زندگی کا مقصدِ ثانی بن گئی ہے۔ اُن کے ہاں زندگی کا یہی کمال ہے کہ دنیا کے سامانوں سے جی بھر کے نفع اٹھایا جائے جس چیز سے انہیں لذت یا خوشی حاصل ہو اسے بے کھٹکے تہذیب کا جزو بنا لیتے ہیں۔ رہ گئی آخرت تو اس کی انہیں زیادہ فکر نہیں کیونکہ ان کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام صلیب پر چڑھ کر ان کے سب گناہوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔

تمدّن

مدینہ کا معنی ہے شہر اور تمدّن کا لغوی معنی ہے مدینہ یعنی شہر میں سکونت اختیار کرنا، شہری زندگی کا رہن سہن اختیار کرنا، مہذّب اور شائستہ ہونا۔ اصطلاحی اعتبار سے تمدّن کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے لوازمات اور ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انسان جو کچھ بھی بناتا ہے،

ایجاد کرتا ہے، تیار کرتا ہے وہ سب تمدّن کے تحت آتے ہیں اور تمدّن کے مظاہر ہیں۔ معمولی سے معمولی چیزوں، مثلاً سوئی، بٹن، معمولی آلۂ کار اور پرزے سے لے کر فیکٹریاں، کارخانے، سماجی ادارے، سب چیزیں تمدّن میں شامل ہیں اور ان سب چیزوں سے مل کر تمدّن تشکیل پاتا ہے۔

تہذیب اور تمدّن میں فرق

تہذیب افکار و نظریات سے تشکیل پاتی ہے جب کہ تمدّن ان افکار و نظریات کے عملی اظہار کا نام ہے جیسے انسان کے اعمال کے پیچھے اس کا عقیدہ اور فکر کار فرما ہوتا ہے۔ اسی طرح تمدّن کی بنیاد تہذیب ہے۔ یوں سمجھیے کہ تہذیب معاشرے کے ایمان و عقیدے کا نام ہے اور تمدّن اس کے اعمال ہیں۔ اگر انسان کا ایمان و عقیدہ یا افکار و نظریات اچھے ہوں گے تو اس کے اعمال بھی صالح ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر افکار و نظریات فاسد اور گھٹیا ہوں گے تو اس کے اعمال بھی بُرے ہوں گے۔ یہی حال تہذیب و تمدّن کا ہے۔ اگر تہذیب اچھی ہوگی تو تمدّن بھی اچھا ہوگا اور اگر تہذیب بُری ہوگی تو تمدّن بھی بُرا ہوگا۔ تہذیب و تمدّن میں اس بنیادی فرق کے باوجود بعض اوقات دونوں کو ایک ہی معنی و مفہوم میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔

اسلامی تہذیب و تمدّن

مفہوم

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ہر تہذیب و تمدّن کا سرچشمہ دین یا مذہب ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدّن کے تمام عناصرِ ترکیبی پر مذہب اثر انداز ہوتا ہے بلکہ وہ مذہب سے ماخوذ ہوتے ہیں، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر۔ اسلامی تہذیب و تمدّن سے مراد ایسی تہذیب و تمدّن ہے جس کی بنیاد اور اساس اسلامی تعلیمات کی رُوح ہو، اس کے تمام عناصرِ ترکیبی کا خمیر دینِ اسلام سے اٹھا ہو، اس کے تمام پہلوؤں، معاشرتی، معاشی، سیاسی پر اسلام ہی کا پرتو ہو۔ لوگوں کا رہن سہن، رسوم و رواجات، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی ادارے، فنونِ لطیفہ، تعلیم کا نظام، افکار و نظریات غرض وہ سب چیزیں جو تہذیب کی ذیل میں آتی ہیں وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کی رُوح کے مطابق ہوں۔

اسلامی تہذیب و تمدّن کے اس مفہوم سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ پاکستان، انڈونیشیا، مصر، ترکی، ایران، سوڈان وغیرہ تمام اسلامی ممالک کے لوگوں کے گھر بار، لباس، وضع قطع، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، زبان، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی ادارے، تعلیمی نصاب اور تعلیم کا نظام یکساں، اور ایک سی شکل و صورت کے ہوں گے۔ ان میں یقیناً بڑے اختلافات پائے جائیں گے۔ مقامی

جغرافیائی حالات، آب و ہوا اور دیگر قدرتی عوامل کے اثرات کا پایا جانا ایک فطری بات ہے لیکن ایک بات ضرور ہوگی یا ہونی چاہیئے (اس کی تہذیب و تمدّن کے اسلامی ہونے کے لئے) کہ ان کی بنیاد اسلامی تعلیمات کی روح ہوگی اور ہر اسلامی ملک کی اسلامی تہذیب و تمدّن میں اسلامی تہذیب و تمدّن کی درج ذیل بنیادی خصوصیات (Salient Features) ضرور پائی جائیں گی۔

اسلامی تہذیب کی خصوصیات

اسلامی تہذیب، جس کے عناصر ترکیبی اسلام کے بنیادی عقائد اور ارکان خمسہ ہیں (جن کا ذکر کتاب کے باب اسلامی زندگی میں تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے) مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ خصوصیات اسے دنیا کی دوسری تہذیبوں سے ممتاز کرتی ہیں:

۱۔ توحید

توحید (یعنی خدا کے ایک ہونے) کا عقیدہ اسلامی تہذیب کی اساس ہے۔ اسلامی تہذیب کے جملہ افکار و نظریات پر یہ عقیدہ اثرانداز ہوتا ہے۔ توحید سے مراد ہے کہ ایک خدا کو مانا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ اس کی ذات کی کوئی نظیر، مثال یا شبیہ نہیں ہے، اس لئے ہم نہ اس کا ادراک کر سکتے ہیں اور نہ احاطہ۔ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے مگر ہر جگہ موجود، (علیٰ کُلِّ شَیْءٍ شہید) وہی تمام کائنات کا خالق، وہی مالک، وہی رب العالمین، وہی تدبیر و انتظام کرنے والا، کائنات اسی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چل رہی ہے، ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ ان کو خوب دیکھنے اور سننے والا ہے، وہ اپنے بندوں کے ساتھ رؤوف و رحیم، رحمان، غفور و غفار ہے، ستارالعیوب ہے، توبہ قبول کرنے والا، معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا ہے۔ ہم اس کو اس کی ان صفات کے حوالے سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ایسی صفات والے ایک خدا کو ماننے سے انسان کی شخصیت پر بہت عمدہ، مفید اور اعلیٰ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وہ نڈر، بہادر، غیور، خوددار اور حوصلہ مند بنتا ہے۔ اس کے افکار و نظریات بھی اس عقیدۂ توحید سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ عقیدہ بنی نوع انسان کی توحید کا بھی واحد ذریعہ ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی یاد

تہذیب کے ہر پہلو سے اللہ تعالیٰ کی یاد وابستہ رہنی چاہیئے۔ اسلامی تہذیب میں بنیادی

تہوار دو ہیں، یعنی عیدین۔ ان کے منانے کا بھی عین اسلامی طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت کے جذبہ سے منائی جائیں۔

نشست و برخاست، کھانے، پینے، اور لباس وغیرہ کے آداب کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو۔ کوئی بزم بھی جمی ہو اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کم از کم ایک بار ضرور یاد کیا جائے۔ جھوٹ نہ بولا جائے، عبث گفتگو نہ کی جائے اور نہ بے تحاشہ قہقہے سر کئے جائیں۔

۳۔ سادگی

اسلام سامانِ تعیّش کا روادار نہیں، سادگی پر فخر کرتا ہے۔ جس تہذیب میں بے جا عشرت اور تکلف کو دخل ہو۔ اسے ہم اسلامی تہذیب نہیں کہہ سکتے۔

ہمارے کاروانِ تہذیب کے لئے بانگِ درا ہے:

اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ
(فقر کا مجھے فخر ہے)

فقر سے مراد ہے، اللہ تعالیٰ کا محتاج رہنا، نہ کہ دنیا اور اہل دُنیا کا۔

اسلام ایسی چیزوں کو جزوِ تہذیب بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن میں وقت یا دولت کا زیاں ہو۔ مثلاً دیواروں پر آرائشی کپڑے لگانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے محض نمائش کے لئے کتا بلکہ گھوڑا تک پالنا منع ہے۔ بغیر ضرورت کے بلند مکان بنانے کی ضرورت نہیں۔ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال حرام ہے۔

سادگی سے ہمدردی کی روح پیدا ہوتی ہے۔ جو لوگ عیش و آرام کی سیج رکھتے ہیں انہیں غریبوں کی زندگی اور دکھ سکھ کا اندازہ کیونکر ہو سکتا ہے اور ان میں عوام کی ہمدردی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اندیشہ کا اظہار فرمایا تھا کہ اُمّت مال دار ہو کر دُنیا کی بہار اور زیبائش میں کھو کر ہلاک نہ ہو جائے [1]

عیش و عشرت کی عادت پڑ جائے تو مشکل سے اصلاح ہوتی ہے اور انسان آخر کار تباہی

---

[1] دیکھو مشکاۃ کتاب الرقاق

سے دوچار ہو جاتا ہے۔ وہ تمدّن جو سادگی سے آشنا نہ ہو آفات و مصائب کی قطار اپنے جلو میں لاتا ہے۔ عیاشی کی زندگی دولت کی محبّت کے ساتھ ساتھ زندگی سے بھی محبّت سکھاتی ہے۔ آخرت کی طلب نہیں رہتی اور موت کا سامنا کرنے کی جرأت مٹ جاتی ہے۔ قوم بزدل ہو جاتی ہے اور میدانِ کارزار کی اہل نہیں رہتی۔ تہذیب جس قدر زر و سامان چاہے اسی قدر ہلاکت خیز ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں ہمارے ہاں ایک نہایت اچھا رجحان چلا ہے کہ بعض رسموں پر دولت کی جو بربادی ہوتی ہے اسے بند کیا جائے۔ یہ عین اسلامی جذبہ ہے لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور چیز کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ یورپ سے جو تہذیب آ رہی ہے اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ اس تہذیب کے دامن میں جس قدر دولت ڈالتے جائیے سیر نہیں ہوتی۔ اس نے اقتصادی پریشانی کا ایک عجیب گورکھ دھندا چلا دیا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس کے مقابل اسلامی تہذیب کو مستحکم کیا جائے۔

۴۔ صفائی

بدنی صفائی کا ذہنی صفائی سے گہرا تعلق ہے۔ پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے صفائی کو ایمان کا جزو بتایا ہے۔

اسلام میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ جس کے لئے وضو شرط ہے۔ پنج وقتہ وضو بدن کو صاف رکھتا ہے۔ حتی الامکان مسواک کا حکم ہے۔ لہٰذا نمازیوں کے دانت صاف رہتے ہیں۔ انہیں دانتوں کے ہسپتال جانے کی بہت کم حاجت ہوتی ہے۔ نماز کے لئے لباس صاف ستھرا اور پاکیزہ ہونا چاہیئے۔ لہسن، پیاز یا اور بدبودار چیز کھا کر مسجد میں جانے کی اجازت نہیں۔

اسلام اس بات سے منع کرتا ہے کہ مقدور ہوتے ہوئے بھی آدمی پھٹے خانوں رہے بلکہ زینت کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (۷-۳۲)

ترجمہ: کہہ دیجئے۔ کس نے حرام قرار دیا ہے اس زینت کو جسے اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا۔

زینت سے مراد ناواجب آرائش اور نمائش نہیں۔

سورۃ الاعراف کی آیت ۳۱ میں جہاں ہر نماز کے وقت خوش پوشی کی ہدایت ہے وہاں فضول خرچی کی ممانعت کی گئی ہے۔

۵۔ ہمہ گیری

اسلام صرف ایسی تہذیب کی اجازت دیتا ہے جس میں سب حصہ لے سکیں اور جس سے گروہ بندی کا ظہور نہ ہو۔ اسلامی تہذیب امیر و غریب کے درمیان بیگانگی کی دیوار کھڑی نہیں کرتی۔ اسلام نے جس تہذیب کو پیش کیا ہے۔ اس میں خلیفہ سے لے کر غلام تک سب ایک سطح پر رہتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے بارہ میں مشہور ہے کہ بڑی شان و شوکت والے تھے لیکن اس شان و شوکت میں بھی ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ سائلوں کو کھانے کے وقت اپنے پاس بلاتے اور دسترخوان میں شریک کرکے ان سے گفتگو کرتے تھے۔

۶۔ اخوّت

اسلامی تہذیب کی ایک اہم خصوصیت اخوّت یعنی بھائی چارہ ہے۔ اسلام اپنے پیروکاروں کو باہم رشتۂ اخوّت میں منسلک کرتا ہے۔ قرآن حکیم (سورت الحجرات) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ"، یعنی بے شک مومن بھائی بھائی ہیں۔ اسی طرح نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ یعنی مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ اتنا مضبوط اور گہرا رشتہ شاید ہی کسی اور تہذیب میں ملے۔ ہندو تہذیب میں ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کی تحقیر و تذلیل کی جاتی ہے، کمیونسٹ ایک دوسرے کو کامریڈ (ساتھی) کہتے ہیں مگر یہ اسلام ہی ہے کہ جو اپنے ماننے والوں کو بھائی بھائی بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے خیر خواہ، ہمدرد، غمگسار، مددگار ہوں گے جیسے سگے بھائی عام طور پر ہوتے ہیں۔ اس کی روح پرور مثالیں اس مواخات میں پائی جاتی ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ منورہ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان قائم کی تھی۔

۷۔ مساوات

اسلامی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت مساوات ہے۔ اسلام تمام انسانوں کو برابری کا درجہ عطا کرتا ہے، معاشرے میں کسی کو دوسرے پر۔ رنگ، نسل، زبان، تعلیم، دولت و جائداد، مقام و حیثیت، کسی بھی وجہ سے فوقیت اور برتری حاصل نہ ہوگی۔ قانون سے کوئی

شخص بالاتر نہ ہوگا، حاکم و محکوم، امیر اور غریب، مرد اور عورت سب قانون کی نظر میں یکساں ہوں گے اسلامی مملکت میں رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ بھی مساویانہ برتاؤ کیا جائے گا۔ انسانوں کے مابین جو مساوات اسلام قائم کرتا ہے وہ دنیا میں اور کسی تہذیب میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہندو تہذیب میں ایک ہی مذہب کے پیروکاروں کو باہم مساوی حیثیت حاصل نہیں ہے، غیر مذاہب والوں کے ساتھ مساویانہ سلوک تو بہت دور کی بات ہے۔ چار ذاتوں میں منقسم ہندوؤں میں شودروں کی حیثیت نہایت گھٹیا اور ذلت آمیز ہے۔ شودر اگر اعلیٰ ذات کے ہندو کی کسی چیز کو چھوئے تو وہ اس کے نزدیک ناپاک ہو جاتی ہے اور اس جرم کی اس شودر کو سخت ترین سزا دی جاتی ہے۔ امریکہ میں گورے عیسائی کالے عیسائیوں کو اپنے برابر کا درجہ دینے سے انکاری ہیں۔ یہودی مذہب ایک مخصوص نسل تک محدود ہے۔

۸۔ عالمگیریت

اسلامی تہذیب چونکہ نظریہ توحید پر مبنی ہے اور بنی نوع انسان کی مساوات کی علمبردار ہے اس لئے یہ ایک آفاقی یا عالمگیر تہذیب ہے۔ یہ کسی خاص خطے یا نسل کی تہذیب نہیں ہے، جیسے بابل اور نینوا کی تہذیب تھی، قدیم مصر کی تہذیب، موہنجوداڑو کی تہذیب، یا آج جیسے مغرب کی تہذیب ہے کہ یہ سب تہذیبیں ایک خاص خطے، علاقے یا قوم تک محدود ہیں یا محدود تھیں۔ آفاقی ہونے کا شرف صرف اور صرف اسلامی تہذیب کو حاصل ہے، نہ اس سے پہلے کوئی تہذیب آفاقی تھی، نہ اس کے بعد، نہ آج دنیا میں اسلامی تہذیب کے سوا کوئی تہذیب آفاقی ہے اور نہ مستقبل میں کسی تہذیب کو آفاقی ہونے کا اعزاز حاصل ہوگا۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والا، کسی بھی رنگ یا نسل سے تعلق رکھنے والا اور کوئی بھی زبان بولنے والا ہر فرد مسلمان اسلامی تہذیب کا علمبردار ہے، اسی پر عمل کرنے والا ہے۔

۹۔ اعتدال پسندی

اسلامی تہذیب کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی ہر معاملے میں اعتدال پسندی ہے نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا، یعنی بہترین معاملہ میانہ روی ہے۔ اسلام نے کسی بھی معاملے میں، حتیٰ کہ عبادت اور پرہیزگاری میں بھی انتہا پسندی

سے کام نہیں لیا بلکہ اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اعتدال، توازن اور تناسب ہی خیر ہے، اسی سے حسن ہے، کوئی بھی چیز اگر اس سے محروم ہو جائے تو وہ نقصان دہ اور بدصورت ہو جاتی ہے۔ اسلام نہ تو دنیا کا ہو کے رہ جانے کی اجازت دیتا ہے، اور نہ ہی رہبانیت اور ترکِ دنیا کا روادار ہے۔ نہ کنجوسی کو پسند کرتا ہے اور نہ فضول خرچی کو۔ نہ عبادات سے مکمل رخصت دیتا ہے اور نہ ہی صرف اور صرف عبادت میں سارا وقت گزارنے کی اجازت دیتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے اور انفرادی و اجتماعی ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس تہذیب میں اعتدال کا اصول کارفرما ہوگا وہ خوبصورت تہذیب ہوگی اور جو تہذیب اعتدال اور توازن سے محروم ہوگی وہ بدشکل اور بدصورت تہذیب ہوگی۔

۱۰۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

اسلامی تہذیب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ اور مسلسل تبلیغ کا کام ہوتا رہے گا، یعنی نیکی اور بھلے کام کا حکم یا ترغیب دی جائے گی اور برائی سے منع کیا جائے گا۔ جس تہذیب کا یہ خاصہ ہو اس کا حامل معاشرہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتا، اس میں کبھی برائیوں اور جرائم کا غلبہ یا ان کی بہتات نہیں ہو سکتی۔ تہذیب کے تندرست و توانا رہنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام مسلسل ہوتا رہے۔

۱۱۔ متحرک تہذیب

اسلامی تہذیب کی ایک بہت ہی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک متحرک (Dynamic) تہذیب ہے، یہ جامد اور بے حرکت نہیں۔ آج ہم جن تہذیبوں کو مُردہ یا زائد المیعاد (out dated) تہذیبیں کہتے ہیں وہ ایسی اس لئے ہو گئیں کہ وہ جامد تھیں، ان میں حرکت پذیری نہیں تھی۔ اسلامی تہذیب کے بنیادی اصول اگرچہ تبدیل نہیں ہوتے لیکن اجتہاد کی بدولت نئے عصری اور مقامی تقاضوں کو پورا کرنے کی اس میں زبردست صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا اسلامی تہذیب دنیا کی واحد تہذیب ہے جس کو فنا نہیں۔ یہ کبھی مُردہ، زائد المیعاد یا ختم نہیں ہو گی، بلکہ ہمیشہ قائم رہے گی اور تندرست و توانا رہے گی۔

۱۲۔ عدل و احسان

اسلامی تہذیب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر شعبے میں عدل و احسان کارفرما ہو گا۔ کسی شعبے میں بھی اور کسی سطح پر بھی ظلم و بے انصافی اور استحصال نہ ہو گا۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو صرف عدل و انصاف کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ احسان کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد بار عدل و احسان کا ذکر ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ، (سورہ النحل، آیت: ۹۰)

ترجمہ : یعنی اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

اسلامی تہذیب کی بقاء اور ارتقاء

تہذیب چونکہ زندگی کے ظاہری خط و خال کا نام ہے اسی لئے زمان و مکان کے عوامل اس پر ضرور ایک حد تک اثر انداز ہوتے ہیں لیکن یہ عوامل ان خط و خال کو کلیتہً اکھاڑ کر ان کی جگہ نئے نقش و نگار نہیں لا سکتے کیونکہ تہذیب کا سرچشمہ دین ہے جو غیر متبدل ہے مثلاً اسلامی تہذیب کا تقاضا ہے کہ لباس ایسا پہنا جائے جو عریانی کی ہر جھلک کو بند کر دے اور عبادت میں حارج نہ ہو۔ اس تقاضا میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کی مقرر کردہ حدود کے اندر لباس کی وضع و قطع پر روک ٹوک نہیں۔ کوئی چاہے تو ٹوپی پہنے اور چاہے تو عمامہ باندھے، عورتیں چاہیں تو بڑی چادر اوڑھ لیں اور چاہیں تو برقع پہن لیں۔

ہر ملّت کی تہذیب اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے کہ ایک تو اس کا بنیادی مزاج فنا نہ ہونے پائے اور دوسرے اس مزاج کے موافق ضروری تبدیلی ناممکن نہ ہو یعنی بقاء اور ارتقاء پہلو بہ پہلو موجود ہوں۔ اس کا انحصار درج ذیل عوامل پر ہے۔

۱۔ ملّی غیرت ۲۔ وطنی اثرات

۱۔ ملّی غیرت

تہذیب ملّت کا چہرہ ہے۔ اسی سے ملّت کی شناخت ہوتی ہے۔ کوئی شخص اس چہرہ کو بگاڑنے کی اجازت نہ دے گا۔ اسی سے ملّت کی آبرو قائم ہے۔

جس ملّت کی کوئی امتیازی شان نہ ہو اس کا دنیا میں کوئی وقار نہیں ہوتا اور نہ خود اس کے اندر اتحاد قائم رہ سکتا ہے۔ تہذیب ان بنیادی امتیازات میں سے ہے جو قوم کے اندر اشتراک اور یک جہتی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ یہ احساس خود اعتمادی کا ضامن ہوتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں ہمیشہ طاقت ور اور فاتح قوم کی تہذیب غالب رہی ہے۔ جن اقوام میں برتری اور وقار حاصل کرنے کی تڑپ ختم ہو جائے ان کو اپنی تہذیب کا بھی احساس نہیں رہتا۔ یعنی قومیت اور تہذیب لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے جو قوم اپنی تہذیب کو پامال کر دے وہ ملی روح کو بھی ذبح کرنے سے نہیں شرمائی۔

ملّت کی شان اس کے حال ہی سے نہیں، ماضی سے بھی وابستہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو شاندار ماضی دیا ہو تو اس سے بڑھ کر خوش قسمت قوم کون ہو سکتی ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ وہ خوش قسمت اُمّت ہے جس کا ماضی درخشاں روایات سے بھرپور ہے۔ ان روایات سے ربط توڑ دیا جائے تو ملّی استحکام کے لئے کوئی بنیاد ہی نہ رہے۔ گزشتہ دَور آئندہ عہد کے لئے ترقی کا زینہ مہیّا کرتا ہے ؎

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے (اقبال)

ماضی کے بیش قدر ورثہ کو محفوظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ البتہ اس ورثہ تک ہی محدود رہ جانا ذہنی افلاس کی دلیل ہے۔ اس میں جدید تقاضوں کے موافق مزید اضافہ کرنا چاہیئے۔ یہ شرف اسلام ہی کو حاصل ہے جس نے زندگی کا ایک ایسا نظام عطا کیا ہے جو ماضی سے بھی مضبوط تعلق قائم رکھتا ہے اور ارتقاء کا بھی حامی ہے۔

۲۔ وطنی اثرات

ہر وطن کی جغرافیائی خصوصیات ہوتی ہیں۔ زندگی کو ایک حد تک ان خصوصیات کے بموجب ڈھالنا پڑتا ہے۔ دینِ اسلام میں اتنی وسعت ہے کہ وہ کسی ملک کی جغرافیائی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتا، اس لئے ایک ملّت ہونے کے باوجود مختلف ملکوں میں آباد ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی تہذیب میں ادنیٰ سا فرق ضرور رونما ہو گا۔ عرب کے صحرانشینوں، افریقہ کے حبشیوں، کراچی کے شہریوں اور لندن کے مسلمان انگریزوں کی تہذیب بعینہٖ ایک سی نہیں ہو سکتی تاہم ان سب کی تہذیبیں عین اسلامی رہ سکتی ہیں۔

وطنی تہذیب سے محبت کا یہ مطلب نہیں کہ غیر وطنی تہذیب سے نفرت کی جائے۔ غیر وطنی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ غیر وطنی تہذیب ضروری نہیں کہ غیر اسلامی تہذیب ہو۔

○

سوالات

۱۔ تہذیب سے کیا مراد ہے؟ تہذیب اور کلچر کے فرق کو واضح کریں۔
۲۔ تہذیب اور تمدّن میں کیا فرق ہے؟ دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟
۳۔ اسلامی تہذیب کا مفہوم واضح کریں اور اس کی امتیازی خصوصیات بیان کریں۔
۴۔ اسلامی تہذیب دنیا کی دوسری تہذیبوں سے کیوں ایک بہتر اور زیادہ جاندار تہذیب ہے؟
۵۔ اسلامی تہذیب کے بنیادی افکار و نظریات اور عناصر ترکیبی کیا ہیں؟
۶۔ اسلامی تہذیب کی بقاء و ارتقاء (یا اس کے دائمی ہونے) پر ایک مفصّل نوٹ لکھیں۔

○

زندگی کے دوائر

انسان کی زندگی فرد سے شروع ہوکر لہر در لہر پھیلتی چلی جاتی ہے۔ ایک دائرے سے دوسرا دائرہ پیدا ہوتا ہے اور بالآخر عالمِ اسلام کا دائرہ سب دائروں کو محیط ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے حسبِ ذیل اہم ترین دائرے ہیں:

۱۔ فرد
۲۔ گھر
۳۔ مسجد و مکتب
۴۔ معاشرہ
۵۔ عالمِ اسلام

انسان کی اوّلین حیثیت فرد کی ہے۔ فرد کی اہمیت اسی چیز سے بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ ایمان ایک انفرادی چیز ہے۔ فرد کا واسطہ سب سے پہلے اپنے گھر سے پڑتا ہے۔ یہاں وہ زندگی کا اوّلین درس لیتا ہے۔ پھر مسجد و مکتب سے آشنا ہوتا ہے۔ یہاں دینی و دنیوی دونوں لحاظ سے عملی زندگی کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے سامنے معاشرہ کی وسیع دنیا کھلی ہے۔ جب تک گھر میں تھا تو لطف و محبّت کی صدائیں سُنی تھیں۔ یہاں خشمگیں نگاہوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور ملکی ریاست کی پابندیاں قبول کرنی ہوتی ہیں۔ ان پابندیوں کے اندر اسے اتنی تربیت مل جاتی ہے کہ دنیائے اسلام کے فرد کی حیثیت میں عظیم تر فرائض بجالانے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

آئندہ اوراق میں انسانی زندگی کے ان دوائر کا ہم فرداً فرداً تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

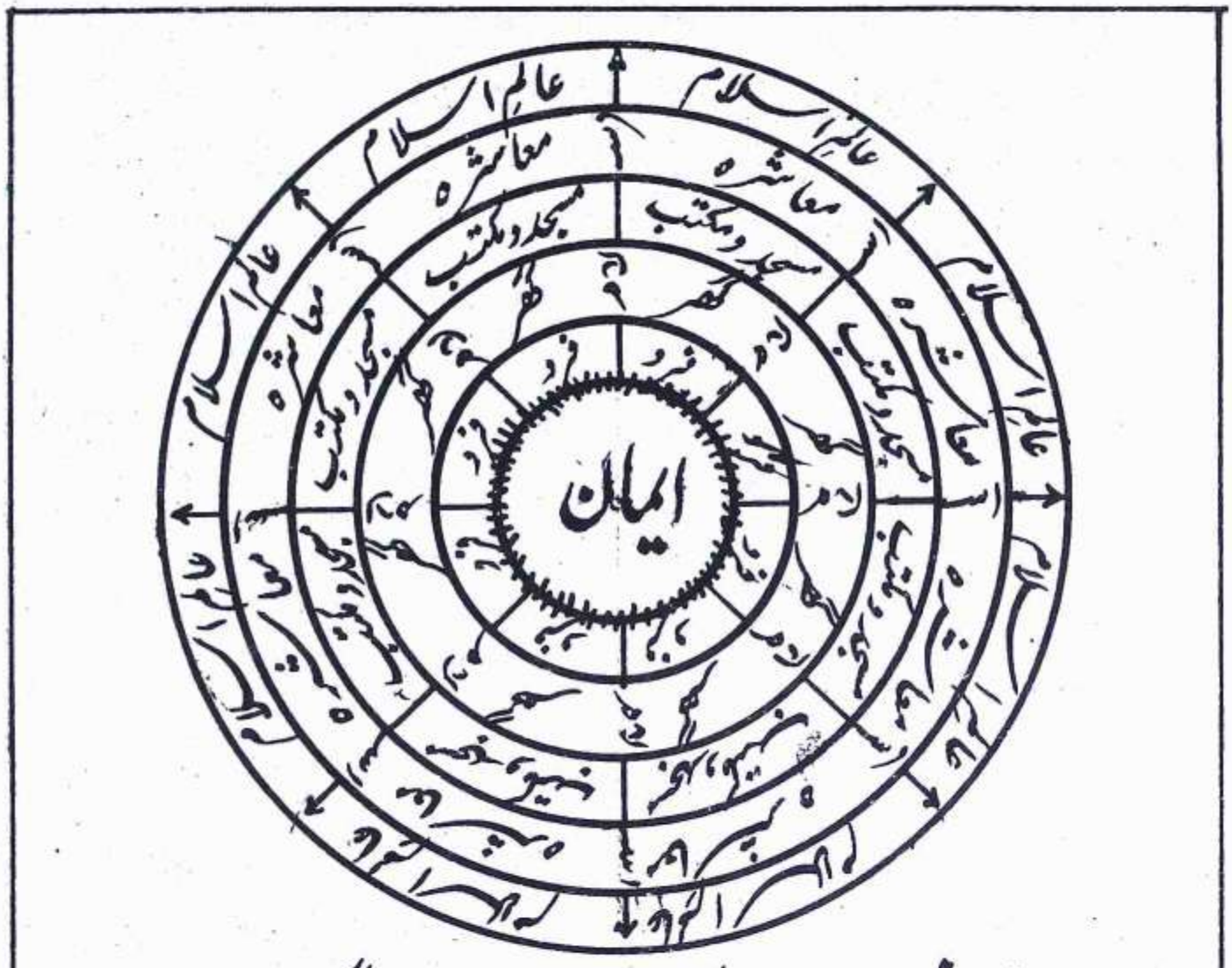

ایمان کی شمع، اِسلام کی شعاعیں اور زندگی کے دوائر

فرد

تقویٰ

مفہوم تقویٰ کا مادہ وَقْیاً ہے جس کے معنی ہیں بچانا یا محفوظ کرنا۔
تقویٰ کے لغوی معنی خود کو تکلیف، نقصان یا مصیبت سے بچانا یا محفوظ کرنا ہیں اس کے ہم مادہ اور ہم معنی لفظ اِتِّقاء اور تُقاۃ ہیں۔

تقویٰ کے لفظ کا عام استعمال لغوی معنی میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنی میں ہے۔ اصطلاح کی رو سے تقویٰ کے دو مفہوم ہیں، یعنی خاص اور عام جن کی مختصر تشریح درج ذیل ہے:

۱۔ خاص مفہوم میں تقویٰ سے مراد ہے، ممنوع چیزوں سے بچ کر رہنا

احکام کی دو قسمیں ہیں، یعنی اوامر اور نواہی۔ امر سے مراد ہے، کام کرنے کا حکم۔ نہی سے مراد ہے، کسی کام یا چیز سے باز رہنے کا حکم۔ نہی کی تعمیل کو تقویٰ اور امر کی تعمیل کو بِرّ کہتے ہیں۔

یہ تقویٰ کا خاص اور ابتدائی مفہوم ہے جو ہمیں اپنی حدود کے اندر رہنا سکھاتا ہے۔ چونکہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا خوف بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اس کا مفہوم آخر یہ ٹھہرا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنی حدود کے اندر رہے۔

قرآنِ حکیم میں خوف الٰہی کے لئے "خَشْیَۃ" کا لفظ بھی آیا ہے لیکن تقویٰ کے لفظ میں وسعت زیادہ ہے۔ حدیث میں تقویٰ کا بنیادی مفہوم ادا کرنے کے لئے وَرَع کا لفظ آیا ہے۔ اس کی ضد عُدوان ہے۔ عدوان کے معنی ہیں: حد سے باہر نکلنا، کسی پر دست درازی کرنا یا کسی کا حق دبانا۔

۲۔ عام مفہوم کے اعتبار سے تقویٰ وہ پختہ ملکہ ہے جو انسان کو ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے خوف پر اور برائی سے احتراز پر راسخ رکھتا ہے۔ یہ زندگی سرتاسر عمل ہے، اس لئے نیک اعمال یعنی بِرّ کے دوران میں بھی تقویٰ کا ہونا ضروری ہے لہٰذا عام مفہوم میں تقویٰ کی اصطلاح صرف نہی کی پابندی تک محدود نہ رہی بلکہ اس میں بِرّ کے معنی بھی شامل ہو گئے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک صحابی رضؓ نے پوچھا کہ خوفِ الٰہی سے لرزیدہ لوگ کون ہوتے ہیں حضورؐ نے فرمایا:

> یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، صدقہ دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ خوف رکھتے ہیں کہ ان کے اعمال اللہ تعالیٰ نامنظور نہ کر دے [1]

---

[1] مشکوٰۃ باب البکاء والخوف

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

دنیا سے اور عورتوں سے تقویٰ رکھو۔[1]

یہاں تقویٰ سے مُراد یہ نہیں کہ دنیا اور عورتوں سے دور رہو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے درمیان میں ایسے کھو نہ جاؤ کہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہ رہے۔

تقویٰ کی اصطلاح کا ابتدائی اور خاص مفہوم تو یہ ہے کہ دل پر ہر وقت خوفِ الٰہی اور اجتناب دنیا کے جذبات غالب رہیں لیکن کامل اور عام مفہوم یہ ہے کہ طلب اور خشیۃ کا حسین امتزاج رہے۔ ایمان خوف اور اُمید کے بین بین ہے۔ قرآنِ حکیم میں مومنین کا یہ وصف بیان ہوا ہے کہ وہ اُمید اور خوف کے ساتھ اللہ کو یاد کرتے ہیں[2] تقویٰ کا یہ عام مفہوم خاص کو بھی شامل ہے۔

ہر ذی حیات چیز کے دل میں رُجا (اُمید) اور خوف کے جذبات بیک وقت کارفرما رہتے ہیں۔ پرندہ دانہ چگنے کے لئے نکلتا ہے تو ایک طرف اس کے دل میں رزق حاصل کرنے کی امید جاگزیں ہوتی ہے اور دوسری طرف ضرر رساں جانداروں کا خدشہ طاری رہتا ہے۔ امید اور خوف کے متحدہ جذبات ہی انسان کو میدانِ زندگی میں اتر کر حادثات اور خطرات سے بچتے ہوئے آگے بڑھے جانے کی راہ دکھاتے ہیں۔ امید صرف آگے بڑھنا جانتی ہے، گرد و پیش پر نگاہ نہیں ڈالتی۔ تقویٰ ماحول کا جائزہ لیتا ہے اور ضرر رساں اشیاء کا رستہ کاٹ کر یا ان کو رستہ سے ہٹا کر جادہ پیما ہوتا ہے یا اگر دیکھے کہ فلاں رستہ میں ہلاکت کی گھاٹی آتی ہے تو اس رستہ سے اجتناب کرتا ہے۔

ایک مثال سے توضیح : حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ کعب الاحبار سے کہا کہ تقویٰ کے بارے میں کچھ بتایئے۔ انہوں نے پوچھا، آپ کبھی خاردار رستہ پر چلے ہیں؟ فرمایا، ہاں! پھر پوچھا کہ آپ نے کیا طریقہ اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں نے بچاؤ کیا اور کپڑے سمیٹ کر چلا۔ حضرت کعب بولے، یہی تقویٰ ہے۔[3]

امید پر خوف کا پہرہ نہ ہو تو انسان عاقبت سے بے پروا ہو کر آخر تباہی کا شکار ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے نیکی اور بدی کی حدود مقرر کر دی ہیں اور بتا دیا ہے کہ اگر وہ

---

[1] ریاض الصالحین باب فضل الزہد ..... حدیث رقم ۲

[2] دیکھو سورۃ السجدۃ ۲۲ - ۱۶

[3] معالم التنزیل بغوی (سورۃ البقرۃ - ۴)

نیکی کی حدود کے اندر رہا تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سُرخرو اور کامگار ہو گا اور اگر وہ ان حدود کو پھاند گیا تو ذاتِ ایزدی اسے عذاب میں گرفتار کرے گی۔ اس تصور کو پختگی اور مضبوطی کے ساتھ دل میں بٹھا لینا عین تقویٰ ہے۔

تقویٰ کے مراتب

امام بیضاوی ؒ نے اپنی تفسیر میں تقویٰ کے درج ذیل تین مراتب بتائے ہیں:

۱۔ جہنم سے ڈر کر اپنا دامن شرک سے بے داغ رکھنا۔ یہ توحیدِ خالص ہے جسے قرآنِ حکیم نے کَلِمَۃَ التَّقْوٰی کہا ہے۔

۲۔ ہر اس فعل یا ترکِ فعل سے اجتناب کرنا جس میں گناہ ہو حتیٰ کہ صغیرہ گناہوں سے بھی بچنا۔ شرع میں اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔ (سورۃ الاعراف کی آیت ۔ ۹۶ میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے)

۳۔ ہر اس چیز سے جو حق سے غافل کرنا چاہے لاتعلق رہنا اور حق کے ساتھ ظاہر و باطن میں دل بستگی رکھنا۔

یہ اعلیٰ ترین تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرمان میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آلِ عمران۔ ۱۰۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے تقویٰ رکھو جیسا کہ اس سے تقویٰ رکھنے کا حق ہے۔

امام غزالی ؒ نے تقویٰ کے چار مراتب بتائے ہیں لیکن درج بالا تقسیم زیادہ قرینِ فہم ہے۔ تقویٰ کا بلند ترین درجہ نازک ترین درجہ ہے اس میں احتیاط رہے کہ کہیں رہبانیت یا ریا دخل نہ پا جائے اور نہ اپنے سے غیر متقی تر شخص سے حسد یا بغض پیدا ہو۔

اہمیت

۱۔ تقویٰ بنیادی حیثیت رکھتا ہے

تقویٰ انسانی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآنِ حکیم اور حدیث میں وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ تقویٰ کا مقام دل ہے تقویٰ ہی پر سب نیک ارادوں اور صالح نیتوں کا مدار ہے۔ تقویٰ نہ ہو تو نیت اور ارادہ پر کوئی پابندی نہ رہے اور انسان کو سوائے برائی کے اور کچھ نہ سوجھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اجسام اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔[1] (کیونکہ دل ہی مخزنِ تقویٰ ہوتے ہیں)

---

[1] ریاض الصالحین پہلا باب بحوالہ

کا فرمان ہے، آگاہ رہو کہ بدن میں ایک بوٹی ہے۔ جب یہ بوٹی سنوری تو بدن سارا سنور گیا، اور جب یہ بگڑی تو بدن سارا بگڑ گیا۔ جان لو کہ یہ (بوٹی) دل ہے[1]

۲۔ تمام عبادات کی اصل ہے

عبادات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن اس بنیاد کی قرارگاہ بھی تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج کے بارے میں جہاں یہ حکم دیا کہ سفر پر چلنے سے پہلے زادِ راہ کا اہتمام کرو وہاں ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا کہ بہترین زادِ راہ تقوای ہے[2] قربانیوں کے بارے میں تنبیہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تک ان کے گوشت اور خون نہیں پہنچتے بلکہ تمہارا تقوای پہنچتا ہے[3] مراد یہ کہ قربانی میں تقوای کی روح کارفرما ہونی چاہیئے۔ روزوں کے بارے میں وضاحت کر دی کہ اس لئے تم پر فرض ٹھہرائے گئے کہ تم میں تقوای پیدا ہو[4] شعائرِ الٰہی کی تعظیم پر یوں روشنی ڈالی کہ یہ تقویٰ کا جزو ہے[5]

۳۔ اخلاق کی روح ہے

اخلاق کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں لیکن اس کی روح بھی تقوای ہے۔ لباس، ستر اور عفتِ نگاہ کے لئے کس قدر ضروری ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس باب میں بھی اصل الاصول یہ بتایا ہے کہ تقوای کا لباس بہترین لباس ہے[6] عفو اور عدل کی تاکید میں یہ دلیل بتائی کہ یہ تقوای کے قریب تر ہیں[7]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں چند منافقین نے قباء کی بستی میں ایک مسجد کے ہوتے ہوئے دوسری مسجد محض اس لئے بنا ڈالی کہ ملّتِ اسلام میں تفرقہ پیدا ہو۔ اس بارے میں وحی نازل ہوئی کہ پہلی مسجد کی بنیاد چونکہ تقوای پر ہے اس لئے اسی میں نماز پڑھی جائے۔ منافقین کی بنائی ہوئی مسجد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جلوا دیا۔ اسے آج تک مسجدِ ضرار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۴۔ تقوای بہترین چیز ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمعہ کا پہلا خطبہ جو قباء کے مقام پر ارشاد فرمایا اس کا

---

[1] بخاری کتاب الایمان — [2] دیکھو سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۷ — [3] دیکھو سورۃ الحج ۳۷

[4] دیکھو سورۃ البقرۃ ۱۸۳ — [5] دیکھو سورۃ الحج ۳۲

[6] دیکھو سورۃ الاعراف ۲۶ — [7] دیکھو سورۃ البقرۃ ۲۳۷ اور سورۃ المائدۃ ۸

مرکزی مضمون تقوٰی تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

میں تمہیں تقوٰی کی تلقین کرتا ہوں کیونکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو جو بہترین تلقین کرسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے آخرت کے لئے آمادہ کرے اور تقوٰی کا حکم دے [1]

ایک صحابی رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ میں سفر پر جارہا ہوں آپ میرے لئے دعا فرمائیے۔ حضورؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ تمہیں تقوٰی کا زادِ راہ دے [2]

۵۔ تقوٰی ہر حال میں مطلوب ہے

اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے وہ ظاہر و باطن سے آگاہ ہے۔ دل میں جب کوئی خیال اٹھتا ہے تو اس سے قبل کہ ہم خود اس سے آگاہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہوتا ہے اس لئے خوفِ الٰہی ہر حال میں ضروری ہے۔ حدیثِ قدسی ہے کہ میں اس بات کا سزاوار ہوں کہ مجھ سے تقوٰی رکھا جائے۔ جس نے مجھ سے تقوٰی کیا اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ جانا اس کے لئے میرے پاس مغفرت ہے [3]

ایک دن حضرت ابوذر غفاری رضؓ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے نصیحت فرمائیے۔ حضورؐ نے جواب دیا۔ میں تمہیں تقوٰی کی تلقین کرتا ہوں کیونکہ یہ پورے دین کا سرآغاز ہے۔ ایک صحابی رضؓ نے عرض کیا کہ میں نے آپؐ سے بہت حدیثیں سنی ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ بعد کی احادیث یاد رکھوں اور پہلی بھول جاؤں، کوئی ایسا کلمہ ارشاد فرمائیے کہ جامع ہو۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ اپنے علم کے مطابق اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہ [4]

تقوٰی کی تربیت

تقوٰی کی تربیت کے لئے سب سے پہلے اس بات کا علم حاصل کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے لئے کیا حدود مقرر فرمائی ہیں بعض طبیعتیں ان پابندیوں کو خوشی سے قبول کرلیتی ہیں لیکن بعض طبائع بتدریج ہی ان کی عادی ہوسکتی ہیں۔ شروع میں طبیعت پر کچھ بوجھ سا پڑتا ہے لیکن آہستہ آہستہ ان پابندیوں میں دل کو

---

[1] طبری
[2] مشکاۃ باب الدعوات فی الاوقات۔ الفصل الثانی
[3] شرح اربعین از ابن حجر
[4] جمع الفوائد حدیث ۲۳۱

سرور آنے لگتا ہے اور خیر و شر کی تمیز مشتبہ باتوں میں بھی خود بہ خود ہونے لگتی ہے بلکہ دل میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جہاں برائی سامنے آئی اس میں اضطراب پیدا ہوا۔

اپنے دل سے فتوای لیں

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک بار ایک صحابی رضؓ سے فرمایا کہ شک میں ڈالنے والی چیز کو چھوڑ اور اس کے عوض ایسی چیز کو اختیار کر جو شک میں نہ ڈالے۔ صحابی رضؓ نے عرض کیا کہ اس کا علم کیسے ہو گا؟ (یعنی میں کیونکر جانوں کہ فلاں چیز مشکوک ہے) فرمایا، جب تو کسی کام کا ارادہ کرے تو دل پر ہاتھ رکھ کیونکہ دل حرام سے مضطرب ہوتا ہے اور حلال سے سکون پاتا ہے۔ اور جان لے کہ متقی مسلمان کبیرہ کے ڈر سے صغیرہ کو (بھی) چھوڑتا ہے[1]۔

تقوای کے تقاضے

تقوای کے حسب ذیل تقاضے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا خوف

۲۔ حدود شناسی ۳۔ صغیرہ گناہ کو حقیر نہ سمجھنا ۴۔ مشکوک چیزوں سے بچنا

۵۔ دوسروں کے حقوق کی پاسداری ۶۔ عدل و انصاف ۷۔ ایفائے عہد

اب ہم ان عنوانوں پر علیحدہ علیحدہ نگاہ ڈالیں گے۔

(اول) اللہ تعالیٰ کا خوف

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیک وقت امید اور خوف کا تعلق رہنا چاہیئے۔ بنیادی تعلق امید کا ہے لیکن اس پر خوف کا پہرہ نہ رہے تو انسان بے پروا اور لاابالی ہو جائے۔ امام غزالی رح لکھتے ہیں کہ خوف ایک چابک ہے جو منزلِ سعادت کی طرف دوڑاتا ہے لیکن خوف اس قدر زیادہ نہ ہو کہ انسان کو مایوس کر دے۔ خوف اور امید کے پلڑے برابر ہونے چاہئیں۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہو جائے کہ سب مخلوق میں سے صرف ایک آدمی جنت میں جائے گا تو میں سمجھوں گا کہ وہ آدمی میں ہوں لیکن یہ اعلان ہو جائے کہ دوزخ میں صرف ایک آدمی داخل ہو گا تو مجھے ڈر پیدا ہو جائے گا کہ وہ آدمی کہیں میں ہی نہ ہوں۔

حدیث میں آیا ہے کہ جنت تم میں سے ہر ایک کے جوتے کے تسمے سے بھی قریب تر ہے،

---

[1] دلیل الفالحین

اور یہی حال دوزخ کا ہے[1] انسان کو زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے نہ دوزخ سے بے خوف ہو جائے اور نہ جنّت سے نا اُمید۔

انسان پر کبھی خوشی کا عالم طاری ہوتا ہے، کبھی ناخوشی کا۔ تقوٰی خوشی کے لمحات کو فنا نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کا تقاضا ہے کہ بالخصوص عالمِ شباب میں اور ایسی حالت میں جب کہ مال و دولت کی فراوانی ہو اللہ تعالیٰ کے خوف کے لمحے خوشی کے وقفوں سے طویل تر ہونے چاہئیں ورنہ خوف اور شادمانی کے درمیان توازن قائم نہ رہ سکے گا، اور غفلت غالب آجائے گی۔

دنیا رنگینیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ آدمی اس کے فریب میں آسانی سے آجاتا ہے۔ اس لئے اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف رہ رہ کر زندہ ہوتا رہے۔

جب آسمان پر بادل گھرتے تو اللہ تعالیٰ کے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا چہرۂ مبارک متغیّر ہو جاتا۔ کبھی گھر سے نکلتے اور واپس تشریف لاتے، کبھی پس و پیش ٹہلتے۔ جب بارش برستی تو آپؐ کی پریشانی دور ہو جاتی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے ایک بار اس کا سبب پوچھا تو فرمایا، کہیں ایسا نہ ہو جیسا کہ قومِ عاد نے گھٹا کو اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہا تھا کہ یہ گھٹا ہم پر بارش لائے گی[2] لیکن ان کے لئے فنا لائی۔

(دوم) حُدُود شناسی

انسان کو نہ صرف اپنے حقوق و فرائض کی حدود سمجھنا لازم ہیں بلکہ دوسروں کی حدود کا بھی دھیان رکھنا ضروری ہے۔

تقوٰی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ انسان اس بات کا علم حاصل کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کیا حدود مقرّر کی ہیں؟ انسان کے حقوق کیا ہیں؟ کیا رخصتیں اور کیا پابندیاں ہیں؟ وہ حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھے کیونکہ قانون اور اخلاق کا انحصار زیادہ تر حلال و حرام کی تعیین پر ہے جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بیان کی ہوئی حدود سے تجاوز کرے۔ وہ تقوٰی سے صریح انحراف کرتا ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ وہ دین سے باہر نہ ہو جائے۔

---

[1] ریاض الصالحین باب الجمع بین الخوف والرجاء [2] مسلم کتاب صلوٰۃ الاستسقاء

اس ضمن میں درج ذیل امور کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔

(ا) اپنے حق سے بڑھ کر طلب کا ہاتھ نہیں پھیلانا چاہیئے۔ بعض لوگ نااہل ہونے کے باوصف بڑے بڑے عہدوں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ یہ تقویٰ کے منافی ہے۔ قرآن حکیم نے متقین کی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ وہ دنیا میں (بغیر اہلیت اور استحقاق کے) عُلُوّ (یعنی بلندی) کے خریص نہیں ہوتے اور نہ فساد چاہتے ہیں[1]

(ب) حفظِ مراتب کا خیال رکھنا چاہیئے۔ جو آدمی عزت کا مستحق ہے اس کی تعظیم کی جائے۔ اس کو ادب بھی کہتے ہیں۔

اسلام نے ادب پر بہت تاکید کی ہے۔ سُورۃُ الحجرات کے پہلے رکوع میں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حکم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سامنے دبی آواز سے بولیں۔ اس آیت میں تقویٰ کا لفظ ادب کا مفہوم ادا کر رہا ہے۔

جناب ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے۔

اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ[2]

ترجمہ: لوگوں کو اپنے اپنے مقام پر رکھو

(سوم) صغیرہ گناہ کو حقیر نہ سمجھنا

بعض لوگ صغیرہ گناہ کے بارے میں عمداً بے پروائی کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کا عذاب زیادہ نہ ہوگا اس لئے مضائقہ نہیں مثلاً تمباکو پینے والے بعض اصحاب اگرچہ اسے گناہ سمجھتے ہیں۔ لیکن صغیرہ جان کر بے خوفی سے اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ صغیرہ گناہ کی بے پروائی کبیرہ میں بھی بے پروا کر سکتی ہے، اور پھر اللہ کا حکم کسی نوعیت کا ہو اللہ کا حکم ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ گناہ کے چھوٹا ہونے کو نہ دیکھ بلکہ اس کو دیکھ جس کی تو نافرمانی کر رہا ہے۔

اجتناب گناہ کی کوشش کے باوصف گناہ ہو جائے تو صغیرہ گناہ کا عذاب کم ہوگا اور کبیرہ کا زیادہ۔ لیکن آدمی صغیرہ گناہ کے بارے میں جان بوجھ کر مستقلاً بے پروا ہو جائے تو کبیرہ کی حد میں داخل ہو جاتا ہے۔

تقویٰ کا تقاضا ہے کہ انسان صغیرہ گناہ سے بھی اسی طرح پہلو بچائے جس طرح کبیرہ گناہ سے

---

[1] دیکھو سُورۃ القصص [2] جمع الفوائد باب التوادد۔ حدیث ۷۸۴۵

پہلو بچاتا ہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ لوگوں کو ان الفاظ میں تنبیہ کی کہ تم بعض ایسے عمل کرتے ہو جو تمہاری آنکھوں میں بال سے بھی باریک تر ہیں۔ حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں ہم ان کو مہلکات میں شمار کرتے تھے۔ [1]

(چہارم) مشتبہ چیزوں سے بچنا

مشتبہ چیزوں سے دور رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو آدمی ایسی چیز پر عمل کر بیٹھے جو اس کے نزدیک تو محض مشکوک ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرام اور نتیجۃً باعثِ ننگ و ذلت ہو۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حلال و حرام واضح ہیں۔ ان کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے جو ان سے بچا اس نے اپنا دین اور اپنی آبرو کو سلامت رکھا اور جو ان میں پڑا وہ حرام میں پڑ گیا۔ اس کی مثال ایک ممنوع چراگاہ کے کنارہ پر ریوڑ چرانے والے گلہ بان کی ہے۔ عین ممکن ہے وہ کسی وقت اس ممنوع چراگاہ میں چرانے لگے۔ جان لو کہ ہر بادشاہ کی خاص کی چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کے محارم یعنی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں ہیں۔ [2]

کہیں سفوف پڑا ہو تو کوئی معقول آدمی بغیر تحقیق کے اسے نہیں پھانکے گا۔ عین ممکن ہے یہ زہر ہو۔ جو کام دل میں تردد پیدا کرے اس سے بچنا چاہیئے۔

اس موضوع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيبُكَ

(جو چیز تجھے شک میں ڈالتی ہے اسے چھوڑ اور اس چیز کو لے جو تجھے شک میں نہیں ڈالتی) [3]

۲۔ بندہ اس وقت تک متقین کے زمرہ میں داخل نہیں ہوتا جب تک وہ کھٹکے کی چیز سے بچنے کے لئے بے کھٹکی چیز کو بھی نہ چھوڑ دے۔ [4]

۳۔ ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک کھجور پڑی ہوئی ملی۔ آپؐ نے فرمایا، اگر مجھے اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقہ کی ہے تو اسے کھا لیتا۔ [5]

آپؐ کو اور اہلِ بیت کو صدقہ کا لینا منع تھا، اس لئے آپ نے کھجور نہ کھائی۔

---

[1] مشکوٰۃ باب البکاء والخوف
[2] اربعین نووی حدیث رقم ۔۶
[3] اربعین نووی حدیث رقم ۔۱۱
[4] ریاض الصالحین باب الورع ۲۹۲
[5] ریاض الصالحین باب الورع۔

(پنجم) دوسروں کے حقوق کی پاسداری

انسان کو چاہیئے کہ دوسروں کے حقوق میں کوتاہی نہ کرے مثلاً کسی کا مال واجب الادا ہو تو ادا کرنے کی کوشش کرے۔ دوسروں کی آبرو اور مرتبہ کا خیال رکھے۔

قرآن حکیم میں تمسقین کی ایک تعریف یہ بتائی کہ ان کے اموال میں سائل اور محروم یعنی نادار آدمی کا حق ہوتا ہے[1] (جس کو وہ ادا کرتے ہیں)۔

امراء اور حکام کے عہدے قوم و وطن کی امانت ہیں، انہیں چاہیئے کہ فرائض پوری طرح ادا کریں۔ ان کے تصرف میں سرکاری اموال ہوں تو ذاتی استعمال میں نہ لائیں۔ ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضؓ کو اپنی خلافت کے دوران میں علاج کے لئے شہد کی ضرورت پڑی۔ شہد بیت المال میں موجود تھا لیکن جب تک مسجد میں جا کر لوگوں سے اجازت نہ لے لی، اسے ہاتھ نہ لگایا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک دفعہ ذاتی ضرورت کے لئے شہد منگوایا۔ معلوم ہوا کہ سرکاری جانوروں پر رکھ کر لایا گیا ہے۔ آپ نے شہد بیچ ڈالا اور رقم سرکاری خزانہ میں جمع کروی۔

(ششم) عدل و انصاف

عدل اور تقوای کا آپس میں کہاں تک تعلق ہے۔ اس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرمان سے ہوتا ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ (۵:۸)

ترجمہ: اور کسی قوم کی دشمنی تم سے یہ نہ کرائے کہ تم بے انصافی کرو۔ انصاف کرو۔ یہ تقوای کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے تقوای رکھو۔

یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ تقوای عدل کا تقاضا کرتا ہے۔

(ہفتم) ایفائے عہد

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں وعدہ نباہنے کی بار بار تاکید کی ہے۔ ایک جگہ یہ بتا کر کہ مشرکین ہر بار عہد شکنی کرتے ہیں فرمایا، یہ لوگ تقوای نہیں رکھتے[2] مراد یہ کہ عہد شکنی تقوای کے منافی ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ بھی ایفائے عہد ضروری ہے۔ وہ خود عہد توڑیں تو اور بات ہے۔ اسلامی ریاست میں جو غیر مسلم آباد ہوتے ہیں ان کو حکومت کی طرف سے حفاظت کا عہد حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] دیکھو الذّٰریٰت ۔ ۱۹ [2] دیکھو سورۃ الانفال آیت ۔ ۵۶

اسلام نے ان کے ساتھ جو مُراعات روا رکھی ہیں ان کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو مار ڈالے تو اس مسلمان کو پوری سزا دی جاتی ہے۔ یہ جماعتی تقویٰ ہے۔

بدر کے میدان میں اسلامی لشکر اور مشرکین کی فوج آمنے سامنے ڈیرے ڈالے تھے۔ دو مسلمان اپنے لشکر کی طرف آ رہے تھے کہ مشرکین نے روک لیا اور اس وعدہ پر چھوڑا کہ وہ ان کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مدینہ بھیج دیا۔

تقوای کی حد

تقوای کی حد یہ ہے کہ آدمی مشتبہ امور سے اجتناب کرے مگر اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں۔ بعض لوگ تقوای کے جوش میں حلال اور مباح چیزیں بھی اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ یہ وہ حد شکنی ہے جس کو قرآن نے رہبانیت کا نام دیا ہے۔ اسلام نے رہبانیت کی اجازت نہیں دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں چند صحابہؓ نے ترکِ دنیا اور تجرّد کا ارادہ کیا تو آپؐ نے انہیں سختی سے روکا۔

قرآن شریف میں ارشاد ہے :

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن ۶۴ - ۱۶)

ترجمہ : اور اللہ سے تقوای رکھو جتنا تم سے ہو سکے۔

اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی جان پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ یعنی رہبانیت سے کنارہ کش رہو۔

تقوای سہل انگاری اور ترکِ دُنیا کے درمیان حدِّ اعتدال کا نام ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بتا رہا ہے کہ آپؐ سراپا جدّ و جُہد تھے۔

تقوای کے ثمرات

تقوای کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اجرِ عظیم ہے۔ قرآنِ حکیم میں متقین کی رفعت کا جگہ جگہ ذکر آیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عاقبت کی کامیابی متقی لوگوں کا حصہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے خُطبۂ قُبا میں فرمایا کہ تقوای آبرو لاتا ہے اللہ تعالیٰ کو خوش کرتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے۔ الغرض تقوای کے بے شمار فائدے ہیں جن سے چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ بصیرت

تقوای انسان میں بصیرت پیدا کرتا ہے جس سے اچھی اور بُری چیز میں خود بخود امتیاز ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا (۸ : ۲۹)

ترجمہ : اے ایمان والو! اگر تم تقوٰی رکھو اللہ سے تو وہ تمہارے لئے (نیک و بد) میں امتیاز پیدا کر دیگا۔

۲۔ عمل کی اصلاح اور گناہوں کی مغفرت

سورۃ الاحزاب (آیت ۷۰، ۷۱) میں اہلِ ایمان سے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تقوٰی رکھو اور درست بات کہو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت کر دے گا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی ولایت، محبّت اور معیّت

قرآنِ حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ تقوٰی کا ثمر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ولایت حاصل ہوتی ہے وہ متقی بندوں سے محبّت رکھتا ہے اور ان کا ساتھ دیتا ہے۔ مثلاً

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ (۴۵ : ۱۹)

ترجمہ : اور اللہ ولی ہے تقوٰی والوں کا

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹ : ۴، ۷)

ترجمہ : اللہ یقیناً تقوٰی والوں کو چاہتا ہے

۴۔ رزق

متقی آدمی بظاہر دنیاوی لحاظ سے خسارے میں نظر آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسے تنگیِ رزق میں مبتلا نہیں ہونے دیتا اور اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا رستہ بنا دیتا ہے۔

قرآن حکیم میں آیا ہے :

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط (۶۵، ۲، ۳)

ترجمہ : اور جو (کوئی) تقوٰی رکھے اللہ سے وہ اس کے لئے (تنگی سے) باہر آنے کا رستہ بتاتا ہے اور اسے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے اندازہ نہیں ہوتا۔

۵۔ بے خوفی، بے غمی اور عظیم کامیابی

متقی اصحاب کو اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسا ہوتا ہے اس لئے انہیں کوئی اندیشہ مغلوب نہیں کر سکتا اور ان کے چہرے پُرسکون رہتے ہیں۔ سورۃ یونس (آیات ۶۲ تا ۶۴) میں اللہ تعالیٰ کے اولیاء کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ :

۱۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صاحبِ تقوٰی ہیں۔

۲۔ خوف اور غم سے محفوظ ہیں۔

۳- ہر دو جہاں میں ان کے لئے بشارت ہے۔

۶- دشمن کی شرارت سے حفاظت

اللہ تعالیٰ کی مدد نئے نئے انداز سے ظہور کرتی ہے اور متقی بندوں کو دشمن کے شر سے بچاتی ہے۔ سورۃ آلِ عمران (۱۲۰ آیت) میں تلقین کی گئی ہے کہ اگر تم ثابت قدم رہو اور تقوای رکھو تو دشمن کی چالبازی تمہیں کچھ بھی ضرر نہیں پہنچائے گی۔

۷- عزت و امتیاز

دنیا پرستوں کے ہاں عزت کا معیار دولت ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت کا معیار تقوای ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (۴۹:۱۳)

ترجمہ: اللہ کے نزدیک تم میں یقیناً سب سے بڑھ کر آبرومند وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

۸- جنت

قرآنِ حکیم کے بعض مختلف مقامات کے مطالعہ سے یہ علم ہوتا ہے کہ جنت متقین کے لئے تیار کی گئی ہے جہاں وہ آرام والے باغوں میں شاد و خرم رہیں گے۔

سوالات

۱۔ تقوای کا مفہوم کیا ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کریں۔
(نوٹ) تقوای کی اہمیت کے ضمن میں اس کے ثمرات بھی بیان کر دیجئے۔

۲- اسلام میں تقوای کی کیا اہمیت ہے؟ اس کے ثمرات و نتائج بیان کیجئے۔

۳- تقوای سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے اس کے اثرات و نتائج بیان کیجئے۔

○

ذِکر

(ذیل میں ذِکر کے بارے میں عمومی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ صوفیۂ کرام تصوّف کی تربیت کے سلسلہ میں ذکر کی بحث کچھ مختلف طور سے کرتے ہیں۔)

مفہوم

ذِکر کے لُغوی معنی ہیں:

بھولی ہوئی چیز کو یاد کرنا، اسے بار بار یاد رکھنا۔

اصطلاح میں ذکر سے مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا۔

ذکر کے مقابل غفلت کا لفظ ہے۔

ذکر کے مراتب

ذکر کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ آدمی ایک فریضہ کے طور سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے۔ اس میں بھی فضیلت ہے لیکن آدمی اس پر پختہ رہے تو آہستہ آہستہ ایک ایسا درجہ آجاتا ہے جس میں انسان کی زبان چاہے خاموش رہے لیکن دل ذِکر الٰہی سے معمور رہتا ہے۔

امام غزالی رحؒ نے ذکر کے چار مرتبے بیان کئے ہیں:

(اول) صرف زبان سے ذکر کرنا۔

(دوم) دل کو جبر اور تکلّف سے ذکر کا عادی بنانا۔

(سوم) قلب میں ذِکر الٰہی کا پختہ ہو جانا اور بغیر کسی تکلّف کے ذِکر کا جاری رہنا۔

(چہارم) قلب کا ذکر میں اس حد تک ڈوب جانا کہ رسمی ذِکر کی حاجت نہ رہے اور کوئی دیگر چیز اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس حالت کو اِستغراق یا فنا کہتے ہیں۔ یہی آخری مقصود ہے اور پہلے تین درجے اس کے لئے ذرائع کا کام دیتے ہیں۔

اہمیت:

۱۔ ذِکر الٰہی سب سے بڑی عبادت ہے

اللہ تعالیٰ نے ذکر الٰہی کو سب سے بڑی عبادت قرار دیا ہے۔

ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط
وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ط

ترجمہ: نماز یقیناً بے حیائی اور بُرائی سے منع کرتی ہے اور
اللہ کی یاد سب سے بڑی ہے

نماز کی اصل روح اللہ تعالیٰ کی یاد ہے۔ نماز کی بنیادی فضیلت بھی ذکرِ الٰہی کی مرہون ہے۔

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کی راہ میں سر کٹانے سے بھی افضل ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز عذابِ الٰہی سے بچانے والی نہیں۔ ایک صحابیؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا، کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا، تو جب اس دُنیا سے سفر کرے تو تیری زبان ذکرِ الٰہی سے تر ہو۔ [1]

۲۔ ذکرِ الٰہی ہر وقت اور ہر حال کے لئے ہے

ذکرِ الٰہی جس قدر بڑی چیز ہے۔ اسی قدر اس میں آسانیاں بھی ہیں۔ نماز ہی کو دیکھو۔ اس میں وقت، وضو اور جماعت وغیرہ ازبس لازم ہیں لیکن عام ذکرِ الٰہی کے لئے ایسی شرطوں اور پابندیوں کی ضرورت نہیں۔ روح کے تار کو ذرا جنبش ہوئی اور سارا بدن توحید کے نغمہ سے جھنجھنا اٹھا۔ بچہ ہو یا بوڑھا، مریض ہو یا تندرست، امیر ہو یا غریب، ہر شخص کی روح اس نغمہ کو الاپ سکتی ہے۔

انسان کسی حال میں رہے اور کسی عمل میں مصروف ہو دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد کو بیدار رکھ سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جہاں یہ حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو۔ وہاں ساتھ ہی یہ بھی ہدایات ہیں کہ

۱۔ اللہ تعالیٰ کو صبح و شام یاد کرو۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کو کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل (ہر حال میں) یاد رکھو۔
۳۔ جنگ کے ہنگامہ میں بھی اسے خوب یاد کرو۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

---

[1] مشکوٰۃ

زبانِ مبارک پر اثنائے جنگ میں یہ دعا رہتی تھی۔
اے اللہ! تو میرا بازو ہے۔ تو میرا مددگار ہے میں تیرے ہی سہارے جہاد کرتا ہوں۔[1]

۳۔ ذکر صدقہ کا قائم مقام ہے

ایک دفعہ نادار مہاجرین ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اہل ثروت بلند درجات اور دائمی آسائش میں ہم سے بازی لے گئے جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، جیسے ہم روزے رکھتے ہیں وہ بھی رکھتے ہیں لیکن ان کے پاس ضرورت سے بیشتر اموال ہیں جن سے وہ حج و عمرہ بجالاتے ہیں، جہاد کرتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، کیا تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جس کی بدولت تم آگے نکل جانے والوں کے برابر ہو جاؤ، بعد والوں سے سبقت لے جاؤ اور تم سے کوئی شخص افضل نہ رہے۔ سوائے اس کے جو تمہاری طرح اس پر عمل کرے۔ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیوں نہیں! آپؐ نے فرمایا، ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کہا کرو۔ چند روز کے بعد یہ اصحاب پھر حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمارے مالدار بھائیوں نے ہمارا ذکر سن پایا اور اب وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ حضورؐ نے جواب دیا، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کردے۔[2]

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبح ہوتی ہے تو انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہو جاتا ہے۔ ہر بار سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے۔ ہر بار الحمد للہ کہنا صدقہ ہے۔ ہر بار لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے۔ ہر بار اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے۔

۴۔ ذکر خدمتِ خلق کا قائم مقام ہے۔

آدمی خدمتِ خلق کے لیے بے تابی رکھتا ہو لیکن معذوری یا مجبوری کی بناء پر یہ فریضہ انجام نہ دے سکے تو حسنِ نیت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیا کرے۔ اس تذکرہ کو اسے خدمتِ خلق کے برابر ثواب ملے گا۔

۵۔ ذکر زندگی کے اواخر میں

زندگی کے اواخر میں انسان کو ذکرِ الٰہی کی طرف اور بھی زیادہ متوجہ ہونا چاہیئے۔ زندگی

---

[1] ترمذی ابواب الدعوات
[2] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم

کی مصروفیات بے شک بدستور قائم رہیں لیکن ان مصروفیات کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی طرف پہلے سے بڑھ کر دھیان رہنا چاہیئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب سُورۃُ النَّصر میں قربِ وفات کی خبر دی گئی تو ساتھ ہی حکم ہوا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تسبیح اور استغفار جاری رکھیں۔ آپؐ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور یاد میں گزرا تھا۔ تاہم اس سورت میں واضح اشارہ تھا کہ زندگی میں جو فرصت باقی ہے اس کو ذکرِ الٰہی کے لیے غنیمت جانیں اور تسبیح و استغفار میں کمی نہ آنے دیں۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال رمضان کے آخری دس روز اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری برس آپؐ نے بیس روز اعتکاف فرمایا۔

ذکر کی شرطیں[1]: ذکر کے لئے دو شرطیں از بس لازم ہیں، یعنی خلوص اور فکر۔

۱۔ خلوص

حقیقی ذکر وہی ہے جس میں خلوص ہو یعنی خالصتہً "محبتِ الٰہی کے سرچشمہ سے جاری ہوا ہو۔ نمائش کو اس میں کوئی دخل نہ ہو۔

۲۔ فکر

مصنوعات کو دیکھ کر ان کے صانع کے بارے میں ایک عمدہ اندازہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کی مخلوقات پر گہری نگاہ ڈالی جائے۔ کائنات کا جس قدر وسیع و عمیق مطالعہ کیا جائے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا احساس اسی قدر قوی سے قوی تر ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

۳ : ۱۹۰، ۱۹۱

---

[1] شرط اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کے قیام کے لئے ضروری ہو یعنی اس کا لازمہ ہو۔ شرط خارجی چیز ہے۔ جو شے کسی چیز کی حقیقت میں شامل ہو اسے جز یا رکن کہتے ہیں۔

ترجمہ: یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور روز و شب کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں نشانیاں ہیں۔ عقل و خرد والوں کے لئے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں پر اور سوچتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ (عالم) باطل پیدا نہیں کیا تو برتر و بالا ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اللہ تعالیٰ کی کائنات کا آج تک اندازہ نہیں ہو سکا۔ اتنا معلوم ہے کہ یہ کائنات بے شمار جہانوں کا مجموعہ ہے۔ ہر جہاں کی بے کراں وسعت ہے اور یہ وسعت دم بہ دم محیر العقول تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان جہانوں میں ایک نظم و ضبط ہے جس میں ذرہ برابر خلل نہیں آتا۔ یہ دیکھ کر انسان ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس غیر محدود نظام کو چلانے والی کوئی صاحب ارادہ ہستی ہے جسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ اس فکر کے ساتھ ہمارے دل میں ذکر کی جو لہر اٹھتی ہے۔ کائنات کی طرح وہ بھی غیر محدود ہونا چاہتی ہے۔ الغرض فکر کے ساتھ ساتھ ذکر بھی پروان چڑھتا ہے۔

ہر انسان اپنی اپنی عقل اور ذہنی استعداد کے موافق موجودات میں غور کرتا ہے۔ ان پر دیباتی کے لئے اونٹ کا قد و قامت ہی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حیرت انگیز نمونہ ہے لیکن سائنس دان کی نگاہ آگے بڑھتی ہے۔ وہ ایمان کی روشنی سے بہرہ ور ہو تو اس کے دل میں جذبۂ توحید اور قوی ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ شہد کی مکھی کی پانچ آنکھیں ہیں اور ہر آنکھ ۲۵۰۰ آنکھوں کا مجموعہ ہے، مکڑی کے بدن میں چار ہزار نالیاں ہیں جن سے چار ہزار تار نکلتے ہیں جو چار نالیوں پر تقسیم ہو کر صرف چار رہ جاتے ہیں۔ ہر تار ریشم کے تار سے ۹۰ گنا باریک تر ہے۔ جب وہ سمجھ پاتا ہے کہ کائنات کے سینے کا ہر راز شہد کی مکھی اور مکڑی کے بدن سے بڑھ کر دقیق اور پیچ در پیچ ہے تو حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے، اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بے اختیار چھلک اٹھتا ہے۔

ذکر و فکر لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ذکر کے پودے کے لئے خلوص کی کشت کے بغیر چارہ نہیں تو فکر کی آبیاری کے بغیر بھی اس کی شاخیں ہری نہیں رہ سکتیں۔ انسان ہی نہیں، جمادات بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ہر وقت ایسی زبان کے ساتھ جسے عام آدمی سن نہیں سکتا تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن جو درجہ انسان کے ذکر کا ہے وہ جمادات کے ذکر کا نہیں کیونکہ ان کے ہاں فکر نا موجود ہے۔

قرآنِ حکیم نے ذکرِ الٰہی کے لئے تفکر لازم قرار دیا ہے۔ وہ اس مقصد کے لئے

مطالعۂ کائنات کی بار بار تلقین کرتا ہے۔ مطالعۂ کائنات کے شوق نے فرزندانِ اسلام کو تجرباتی سائنس کی راہ دکھائی، انہوں نے سینۂ کائنات کے سربستہ راز کھولے۔ سائنس میں ترقی کی انتہائی منزلوں کو چھو لیا۔ یہاں تک کہ البیرونی ایسے سائنس دان راکٹوں کا نظریہ بھی چھوڑ گئے جس سے آج غیر مسلم استفادہ کر رہے ہیں۔ اہل اسلام خود فکر کی طرف سے آہستہ آہستہ غافل ہو گئے۔

ذکر کے طریقے

ذکر کے تین طریقے ہیں:

۱۔ قلبی ۲۔ قولی ۳۔ عملی

۱۔ قلبی ذکر:

حقیقی ذکر وہی ہے جو انسان کے قلب و دماغ اور رگ و پے میں رواں رہے۔ ذکر سے اصل مقصود اللہ تعالیٰ سے روحانی تعلق استوار کرنا ہے۔ اس لئے اگر آدمی فقط زبان سے کلمات ادا کرتا رہے اور دل میں دھیان نہ ہو تو ذکر کا پورا حق ادا نہیں ہوتا۔ صحیح نشاطِ قلبی ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ قولی ذکر:

قولی ذکر میں ریا کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے حتی الامکان دھیمی آواز میں ہونا چاہیئے۔ قولی ذکر نہ صرف انسان کے اپنے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس میں مزید کیف پیدا کرتا ہے بلکہ سننے والوں کو بھی متاثر کرتا ہے اور انہیں بھی ذکر کی دعوت دیتا ہے۔

(ا) کلماتِ ذکر

ذکر اپنے گہرے مفہوم کے لحاظ سے تو دل کے احساس کا نام ہے لیکن اس احساس کو ہم اپنے ذہن میں الفاظ کا جامہ ضرور پہناتے ہیں۔ دل کا اثر زبان پر اور زبان کا دل پر ہوتا ہے۔ اس لئے ذکر کے لئے الفاظ یا عبارات کا ہونا ضروری ہے۔

کلماتِ ذکر میں سب سے پہلے اسماءِ حسنیٰ کا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ (۷ : ۱۸۰)

ترجمہ: اور اللہ کے اچھے نام ہیں پس اس کو ان (ناموں) سے پکارو

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ منقول ہیں۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے ان کو حفظ کیا وہ جنت میں داخل ہو گا[1] یہاں حفظ

---

[1] ترمذی۔ باب جامع الدعوات

کرنے سے مراد ہے، دل و دماغ میں محفوظ رکھنا۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے بارے میں کج روی اختیار نہیں کرنی چاہیئے، یعنی :

و۔ وہی نام لئے جائیں جن کی شریعت نے اجازت دی ہے۔

ب۔ ان کی غلط تاویل نہ کی جائے۔

ج۔ انہیں فاسد اغراض یعنی جادو وغیرہ کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

د۔ ان اسماء کو اگر عبارتوں میں لایا جائے تو یہ عبارتیں جامع اور پر تاثیر ہوں۔

ذکر کی عبارات اتنی ہی گوناگوں ہو سکتی ہیں جس قدر انسانی جذبات اور خیالات کی دنیا ہے۔ تاہم یہ مسلّم ہے کہ بعض الفاظ اور عبارات میں معانی کی گہرائی اور تاثیر زیادہ ہوتی ہے، بعض میں کم، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر زبان و کلام کا اثر شناس کون ہو سکتا ہے۔ اس کو اپنا ذکر بہت مرغوب ہے، اس لئے اس نے ذکر کے بعض الفاظ قرآنِ حکیم میں اور بعض اپنے آخری نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وساطت سے بتا دیتے ہیں۔ اگرچہ ذکر الٰہی کو انہی میں محدود کرنے کا حکم نہیں لیکن ان الفاظ میں تاثیر زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ کو مرغوب ہیں اور اس کے محب و محبوب صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک پہ جاری رہتے تھے۔ ان میں سے بعض کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

تہلیل : لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا یہ افضل ذکر ہے۔
تسبیح : سُبْحَانَ اللّٰہِ کہنا
تحمید : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا
تکبیر : اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا

ان الفاظ میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور نئی ترکیبیں بھی ممکن ہیں لیکن بہترین اذکار وہی ہیں جو ہادیٔ برحق صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے منقول ہیں : مثلاً

ایک دفعہ ایک دیہاتی آیا اور حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے عرض کیا، مجھے ایسا کلام بتایئے جسے میں دہرایا کروں۔ حضورؐ نے فرمایا، تم کہا کرو :

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ [1]

---

[1] ریاض الصالحین (بحوالہ مسلم)، باب فضل الذکر

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیگر عبارات سے بھی ذکر فرمایا کرتے تھے۔

(ب) قرآنِ حکیم کی تلاوت

قرآن حکیم کی تلاوت ایک اعلیٰ اور شیریں ذکر ہے۔ قرآن میں ذکر سے مراد بعض جگہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور بعض جگہ قرآن ہے۔

قرآن حکیم کو اگر سمجھ کر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا ثواب بڑھ جاتا ہے، لیکن اس کی تلاوت کرنے اور سننے میں فی نفسہ بھی اجر اور فضیلت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن حکیم کو خوش الحانی سے تلاوت کیا جائے آپؐ بارہا کسی خوش الحان صحابی رضؓ کی زبان سے فرمائش کر کے قرآنِ حکیم کی تلاوت سنتے تھے۔

آپؐ کا ارشاد ہے: مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَيْسَ مِنَّا

(جو خوش الحانی سے قرآن نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں)[1]

قرآنِ حکیم کے کلمات اللہ تعالیٰ کے کلمات ہیں۔ جسے اللہ سے محبت ہے اسے ان کلمات سے بھی محبت ہو گی اور جس طرح کسی دوست یا رشتہ دار کا خط پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح اسے قرآنِ حکیم کی تلاوت کر کے مسرت ہو گی۔

(ج) دُعا

اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و نیاز سے دعا مانگنا بھی ذکر کی ایک شاخ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ

۱۔ دعا عبادت ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس سے سوال کیا جائے۔

۳۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ سے سوال نہ کرے، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔

(د) اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد

اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد رکھنے کی تاکید خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور حکم دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ پر درود و سلام بھیجا کرو۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز میرے قریب ترین وہ شخص ہو گا جس نے مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھا ہو گا۔[2]

---

[1] ریاض الصالحین۔ باب استحباب تحسین الصوت [2] دیکھو جمع الفوائد کتاب الاذکار

اذکار اور کاروبار (اسے تصوف میں مشاغلہ کہتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کو جس قدر یاد کیا جائے کم ہے، لیکن مطلب یہ نہیں کہ آدمی دنیا کے فرائض چھوڑ کر دن رات وظیفہ خوانی کرے۔ یہ رہبانیت ہے جو اسلام میں روا نہیں۔ ذکر اپنی اصل کے لحاظ سے دل کی یاد کا نام ہے جو دنیاوی کاروبار کے دوران میں بھی رہ سکتی ہے۔ اذکار اور دنیاوی دھندوں کے درمیان ایک جائز تناسب ہونا چاہیئے۔ نہ کاروبار کو برطرف کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اذکار کو۔ دل کی یاد ہر وقت بیدار رہ سکتی ہے اور جہاں تک زبانی یاد کا تعلق ہے جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں ان میں زیادہ طویل اذکار کا حکم نہیں ملتا۔ البتہ جن حضرات کو کاروبار سے فرصت ہو وہ طویل اذکار میں بھی مشغول رہ سکتے ہیں۔

دُنیا کے اشغال انسان کو ذکرِ الٰہی سے منع نہیں کرتے۔ ان دونوں کا باہمی ربط رہ سکتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں بھی اہل ایمان کو تاکید کی گئی ہے کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کرنے پائیں۔ یہاں مراد یہ نہیں کہ تم مال و اولاد سے کٹ جاؤ بلکہ یہ ہے کہ ہر دو فرائض ساتھ ساتھ بنا ہو۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کاروبار کے دوران میں اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور قیامت کے محاسبہ کا خوف رکھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ فریب اور بے ایمانی سے بچے گا اور حلال رزق کھائے گا۔ حضرت احمد بن حنبل رحمہ کا قول ہے کہ گدازِ قلب حلال کمائی سے پیدا ہوتا ہے۔ یادِ الٰہی سے غافل رہنا، دل کا سخت ہونا اور حرام کھانا لازم و ملزوم ہیں۔

۳۔ عملی ذکر:

اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری بھی ذِکر ہے۔ اسے عملی ذکر کہا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کو یاد رکھا چاہے زبان سے ذکر نہ کیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اس نے اسے بھلا دیا چاہے زبانی یاد کرتا رہا [۱]

بعض علماء نے قرآنِ حکیم کے الفاظ: فَاذْکُرُوْنِیْ کے معنی یہ لکھے ہیں کہ اطاعت کے ذریعے میری یاد رکھو [۲]

جماعتی ذکر

انسانی جذبات ایک دوسرے پر تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ مغموم چہرہ کو دیکھ کر

---

[۱] دلیل الفالحین باب الحمد ۷: ۲۰۳ [۲] دلیل الفالحین باب الحمد ۷: ۲۰۳

دل مغموم سا ہو جاتا ہے ۔ بشاش چہرے کو دیکھ کر انبساط ہوتی ہے ۔ جماعتی نفسیات کا یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ لوگ ایک جماعت میں اکھٹے ہوتے ہیں تو ان میں وحدتِ جذبات پیدا ہو جاتی ہے اور لبسا اوقات وہ ان مجمعوں میں اس طرح ایک دوسرے میں گم ہو جاتے ہیں گویا ہر آدمی دوسرے کے جذبات کا اسیر ہے ۔ نیکی کے کام جہاں تک ہو سکے جماعت سے ادا کرنے چاہئیں ۔ تاکہ لوگوں میں نیکی کا میلان بڑھے ۔

ذکر جماعت میں شریک ہو کر کیا جائے تو اس میں ایک تاثیر پیدا ہو جاتی ہے ۔ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ مبارک میں صحابہ کرام رضؓ کے حلقے اکثر مسجد النبی میں نظر آتے تھے ۔ وہ مل کر تسبیح و تحمید وغیرہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجالاتے تھے ۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی گروہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کو ہم نشین ہوتا ہے تو ملائکہ ان کو ڈھانپ لیتے ہیں ، ان پر رحمت چھا جاتی ہے ، ان پر تسکین نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی بزم میں یاد کرتا ہے ۔[1]

ذکر کے ثمرات :

ذکر کے چند نمایاں ثمرات درج ذیل ہیں :

۱ ۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبولیت :

اللہ تعالیٰ کو وہ بندے بہت مقبول ہیں جن کی زبان پر یا دل میں اس کا ذکر جاری رہے ۔ اللہ تعالیٰ کو جو مومن یاد کرے اس کو اللہ تعالیٰ بھی یاد رکھتا ہے ۔

ارشاد ہے : فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (۲ : ۱۵۲)

ترجمہ : پس مجھے یاد رکھو میں یاد رکھوں گا تمہیں

اللہ تعالیٰ کا یاد رکھنا محض یاد رکھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان کو اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیتا ہے ۔ ہر مشکل میں اس کا رفیق اور مددرساں ہوتا ہے ۔ اپنے یاد کرنے والے کو کسی وقت تنہا نہیں چھوڑتا ۔ اس کا ہم نشین بن جاتا ہے اور ہم نشین بھی ایسا کہ شاہ رگ سے بھی قریب تر ۔

حدیثِ قدسی ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے ہمراہ ہوں ۔ جب وہ مجھے یاد کرے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں ۔ وہ مجھے جی میں یاد کرے تو اسے جی میں یاد کرتا ہوں ۔ اگر کسی مجمع میں یاد کرے

---

[1] دلیل الصالحین باب الحمد ۷ : ۲۱۳

تو اس سے بہتر مجمع (یعنی ملائکہ) میں یاد کرتا ہوں[1]

۲۔ اطمینان اور اعصابی قوت :

ارشاد ربانی ہے : اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳ : ۲۸)

ترجمہ : جان لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کا ذکر روح کا نغمہ ہے جو ساز و بہار سے بے نیاز ہے۔ یہ وہ نغمہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتا ہے اور اعصابی قوت کو ایک مرکز پر جمع کرتا ہے۔ اس کا ثمر اطمینان، اور دل جمعی ہے۔

نماز کا ذکر الٰہی سے گہرا تعلق ہے۔ جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یاد یہ احساس زندہ رکھتی ہے کہ ہمارا ربط ایک ایسی ذات سے ہے جو رب ہے، رحیم ہے، کریم ہے اور دُکھ سُکھ میں زندگی کا سہارا ہے۔ اس احساس سے دل میں سکون پیدا ہوتا ہے، پریشانی دور ہوتی ہے اور عزم و حوصلہ کے جذبات ابھرتے ہیں۔

راحت کے سامان تو کارخانوں میں بنتے ہیں لیکن اصل راحت اللہ تعالیٰ کے ہاں سے آتی ہے۔ اگر وہ اس راحت کو روک لے تو زندگی کے سارے سامان کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ آج دنیا میں بعض ایسے سرمایہ دار موجود ہیں جن کی ثروت کا صحیح اندازہ خود ان کو بھی نہیں۔ ان میں سے بعض کی گھریلو زندگی کے حالات سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ بے چینی اور ناآسودگی کی آنچ نے ان کی ہڈیوں کو جلا رکھا ہے۔ موجودہ دور میں تو قلب و روح کا عالمگیر فساد رونما ہے ہی، اگلے وقتوں کے حالات دیکھیں تو ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دولت اور ثروت راحت کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ جب تک اللہ تعالیٰ یہ نعمت نہ بخشے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ دل کی کشائش مال کی فراخی میں اور آنکھ کی روشنی ساز و سامان کے رنگ و روغن میں ہے۔ ان کو سورۂ طٰہٰ میں آگاہ کیا گیا ہے کہ زندگی ان پر تنگ ہو کر رہ جائے گی اور قیامت کے روز وہ اندھے ہو کر آئیں گے۔

اموی خلیفہ عبدالملک بڑی شان و شوکت کا مالک تھا۔ تاہم ایک بار ایک دھوبی کو

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم و بخاری

دیکھا تو بے اختیار کہہ اٹھا کہ اے کاش مجھ کو بھی اس کی سی زندگی حاصل ہوتی۔

موجودہ دور میں اعصابی امراض کثرت سے بڑھ گئے ہیں۔ طبیب ان کا جس قدر علاج ڈھونڈتے ہیں یہ اور زور پکڑتے ہیں۔ اعصابی کمزوری کے ایک حد تک طبّی علاج بھی بے شک ہو سکتے ہیں لیکن اس کی بیخ کنی کا ایک تیر بہ ہدف نسخہ ذکرِ الٰہی ہے۔ ذکرِ الٰہی دل کی قوت ہے، بلکہ حقیقی زندگی ذکر ہی سے ہے۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی اپنے ربّ کو یاد رکھتا ہے وہ گویا زندہ ہے اور جو اسے یاد نہیں رکھتا وہ گویا مردہ ہے۔[1]

۳۔ روحانی پاکیزگی

انسان سچے دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو برائی سے دور رہتا ہے۔ نماز میں چونکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے اس لئے قرآنِ حکیم میں آیا ہے کہ نماز بے حیائی اور برائی سے منع کرتی ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ ذکر روح کی صیقل ہے۔

۴۔ توشۂ جنّت

اللہ تعالیٰ کا ذکر جنّت کا پروانہ ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں ان کے لئے قرآنِ حکیم میں مغفرت اور اجرِ عظیم کا مژدہ آیا ہے۔

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ملاقات اثنائے معراج میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے آپؐ سے فرمایا، میری طرف سے اُمّت کو سلام کہیں اور بتائیں کہ جنّت کی مٹی خوب ہے، پانی شیریں ہے، اس کی سرزمین پھیلے ہوئے میدانوں کی ہے اور اس کے نہال سُبحان اللہ، الحمد للہ، لاالٰہ الااللہ اور اللہ اکبر ہیں[2]

مُراد یہ کہ جنّت کی بہار ذکرِ الٰہی کرنے والوں کے دم سے ہے۔

سوالات

۱۔ ذکر سے کیا مراد ہے؟ اس کے آداب و اقسام بیان کیجئے۔

۲۔ کتاب و سنت کی روشنی میں ذکر کی فضیلت و اہمیّت بیان کریں۔

۳۔ ذکر کے ثمرات و فوائد، قرآن و حدیث کے حوالے سے بیان کریں۔

---

[1] مشکاۃ۔ باب ذکر اللہ عزّ وجل [2] ریاض الصالحین بحوالہ ترمذی

صَبْر

مفہوم : عوام کے ہاں صبر کے بارے میں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ نا طاقتی اور نا چاری سے خوگر ہو جانے کا نام ان کے ہاں صبر ہے لیکن قرآن و حدیث کی رو سے یہ نظریہ غلط ہے۔

صبر کے لغوی معنی ہیں : اپنے کو روکنا، سہارنا یا کسی بات پر قائم رکھنا۔

قرآنی اصطلاح میں اس کا مفہوم لغوی معنی پر ہی مبنی ہے، لیکن وہاں اس کے معنی میں وسعت زیادہ ہے۔

صبر کا تار و پود استقامت اور استقلال سے بنتا ہے۔ ہر شخص میں تحمل اور مقابلہ کا ملکہ طبعاً موجود ہوتا ہے۔ اس ملکہ کو زندہ رکھنا اور اس کا صحیح اور حسب موقع استعمال ہی صبر ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جس کی ہر حال میں ضرورت ہوتی ہے یعنی دشواری میں بھی اور آسانی میں بھی، تموّل میں بھی اور افلاس میں بھی، بے سامانی میں بھی اور حشمت و شوکت میں بھی۔ صبر کے یہ سب مواقع ایک دوسرے سے کم و بیش مختلف ہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم نے موقع موقع کے لحاظ سے کچھ فرق رکھا ہے لیکن بنیادی عنصر استقامت ہر کہیں موجود ہے۔

قرآنی مفہوم :

قرآنِ حکیم کے مطالعہ سے صبر کے مختصراً درج ذیل مفہوم حاصل ہوتے ہیں :

۱۔ ہر حال میں اپنے جذبات پر قابو رکھنا۔

۲۔ مشکلات اور بے سامانی میں تحمل کرتے ہوئے کشائش کا انتظار کرنا۔

۳۔ حالات تقاضا کریں تو دشمن کے مقابلہ پر جان کی بازی لگا دینا۔

۴۔ نیک عمل کا دوام

۵۔ عمل اور دعا کے ثمرہ کا سکون و قرار سے انتظار کرنا۔

صبر کے مراتب :

صبر کے کئی مدارج ہیں جن کا تعلق اس کے مقصود سے ہوتا ہے۔ اگر کسی کام سے مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہو تو یہ صبر کا بلند ترین درجہ ہو گا۔

صبر کا کمال یہ ہے کہ آدمی پر کوئی مشکل یا آزمائش کتنی ہی اچانک کیوں نہ آئے اس کے حواس بجا رہیں اور اعتقاد میں فرق نہ آئے۔ آہستہ آہستہ وقت گزرنے پر تقریباً سب کو قرار آ جاتا ہے، لیکن صحیح معنی میں صابر شخص وہ ہے کہ بڑے سے بڑے صدمے پر بھی نہ گھبرائے۔ جنابِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ صبر صرف وہ ہے جو پہلے صدمہ کے وقت ہو۔[1]

اہمیّت :

صبر کو اس قدر اہمیّت حاصل ہے کہ قرآنِ حکیم میں تقریباً پچاسی مقامات پر صبر کا حکم آیا ہے۔

۱۔ دُنیا صبر کی امتحان گاہ ہے :

کلام الٰہی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق اس کے لئے آزمائشوں کا پیغام ہے اور اس کی آزمائش دکھوں میں ہے۔[2]

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ۳ : ۱۴۲)

ترجمہ: کیا تم نے گمان کر لیا کہ تم جنّت میں داخل ہو چلے۔ حالانکہ اللہ نے ابھی نہیں جانچ لیا تم میں سے ان کو جنہوں نے جہاد کیا اور نہیں جانچا ثابت قدم رہنے والوں کو۔ مُراد یہ کہ مسلسل امتحان کے بغیر جنت نصیب نہ ہو گی۔

۲۔ صبر امید کا چراغ ہے :

صبر کی ضرورت زندگی کے ہر شعبے میں ہے۔ استقامت کے بغیر کوئی مہم پروان نہیں چڑھتی۔ زندگی جہدِ مسلسل ہے۔ وہی شخص کامیاب رہ سکتا ہے جس کی ہمّت ہمیشہ تازہ رہے اور ارادوں پہ مایوسی طاری نہ ہو۔ صبر کا جوہر دل کی روشنی ہے جو ناامیدی کی تاریکی کو چاک کر کے زندگی کے سفر کو تابناک کر دیتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے :

اَلصَّبْرُ ضِيَاءٌ (صبر روشنی ہے)

---

[1] ریاض الصالحین باب الصبر

[2] مثلاً دیکھو سورۃ آل عمران ۱۸۶، سورۃ محمّد ۳۱، سورۃ الدّھر ۲، سورۃ البلد ۴۹

علمی کاوشوں اور سائنسی تحقیقات کے لئے جان کاہی اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایک مسئلہ کے حل کے لئے برسوں محنت اٹھانا پڑتی ہے۔ دنیا میں وہی اقوام علم و حکمت میں ترقی کر سکتی ہیں جن میں استقلال کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو ورنہ دوسروں کی نقالی پر مجبور ہو کر حقیقی زندگی سے محروم رہ جاتی ہیں ؎

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے (اقبال)

یعنی مسلسل کوشش ہی میں زندگی کا راز ہے۔

صبر نہ ہو تو مایوسی دل کو گھیر لیتی ہے اور ایمان کی قوت چھین لیتی ہے۔ مثلاً فقر فضیلت کا وسیلہ ہے لیکن صبر کے بغیر الٹا کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ فقر بعض دفعہ کفر میں ڈھلنے کے قریب جا پہنچتا ہے [1]

۳۔ صبر اور ایمان لازم و ملزوم ہیں

حدیث ہے کہ صبر ایمان کے لئے اسی طرح ہے جس طرح بدن کے لئے سر۔ جب صبر گیا تو ایمان بھی رخصت ہوا۔ [2]

ایک دفعہ ایک صحابی رضؓ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض گزار ہوئے کہ اسلام کی کوئی ایسی بات فرمایئے کہ آپؐ کے سوا اور کسی سے نہ پوچھوں۔ فرمایا، قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ [3]

ترجمہ: (کہہ، میں اللہ پر ایمان لایا (اور) پھر ثابت قدم رہ)

جماعتی صبر

صبر کی جتنی ضرورت انفرادی زندگی میں ہے اس سے زیادہ جماعتی زندگی میں ہوتی ہے صبر کے بغیر اتحاد قائم رہ نہیں سکتا۔

دین و ملت کی خاطر مالی اور جانی ایثار کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہنا چاہیئے۔ اس راہ میں بارہا دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ ناقدری اور دل شکنی کرنے والوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ تاہم کسی حال میں دل نہیں ہارنا چاہیئے۔

---

[1] مشکوٰۃ باب ما ینھیٰ عنہ من التھاجر.... [2] کنز العمال، جزء ۲

[3] ریاض الصالحین باب فی الاستقامۃ

قرآنِ حکیم میں جا بجا صبر کی جگہ جگہ تلقین آئی ہے۔ یہی وہ خو ہے جس سے مسلمان سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ اپنے نفع یا آرام کی خاطر ملت کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مجرم ٹھہرتے ہیں۔ قوم میں جب تک بھلائی کی صلاحیت باقی ہو اس سے کنارہ کشی روا نہیں۔ ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ مومن جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی ایذا پر صبر کرتا ہے اس مومن سے افضل ہے جو لوگوں سے ملاپ نہیں کرتا اور ان کی ایذا پر صبر نہیں کرتا۔[1]

صبر کی شرطیں

قرآنِ حکیم میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اَلْقَوْلُ الثَّابِتُ یعنی پختہ کلمہ سے ثابت قدم رکھتا ہے۔[2] اس سے مراد توحید ہے۔ عقیدۂ توحید جس قدر پختہ ہوگا صبر کا ملکہ اسی قدر مضبوط ہوگا۔ توحید کے ضمن میں درج ذیل عقائد صبر کو بہت قوت دیتے ہیں۔

۱۔ یقین و توکل

اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورے یقین سے بھروسا کر کے میدانِ عمل میں قدم رکھنا چاہیئے۔ انجام اللہ تعالیٰ کو سونپ دیا جائے۔ توکل کا یہی تقاضا ہے۔ یقین کی قوت کسی مشکل کو غالب اور گراں نہیں ہونے دیتی، اس سے مصائب سہل ہو جاتے ہیں۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسے یقین کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے، جو دنیا کے مصائب کو آسان کر دے۔[3]

۲۔ عقیدۂ تقدیر

عقیدۂ تقدیر انسان کو مایوسی سے بچاتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں بھی انسان کی ہمت مضبوط رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔

۳۔ ثوابِ آخرت

اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کامیابی کا اصل معیار نیت ہے جس کا پھل رائیگاں نہیں جاتا۔ نیت کا نیک ہونا ہی اصل کامیابی ہے۔ نیت اگر نیک ہو تو دنیا میں کوشش چاہے ناکام رہ جائے اس کے عوض آخرت میں کامیابی نصیب ہوگی جس شخص کے دل میں یہ عقیدہ بیٹھ جائے وہ کسی ناکامی

---

[1] الجامع الصغیر للسیوطی (المؤمن ...) [2] دیکھو سورۃ آلِ عمران، آیت ۲۷
[3] مشکوٰۃ باب جامع الدعا۔ جامع الصغیر سیوطی

میں بھی ہمت نہیں ہارتا۔

صبر کی تربیت

صبر کی تربیت کے لئے اسلام میں کامل اہتمام کیا گیا ہے مثلاً ہر سال رمضان کے روزے فرض ہیں۔ کوئی شخص روزہ رکھ کر توڑ ڈالے تو کفارہ یہ ہے کہ دو ماہ روزے رکھے۔ صبر کی مزید تربیت کے لئے رمضان کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً نفل روزوں کی ترغیب ہے۔ روزہ سے بھوک پیاس اور دنیا کی مرغوبات کے مقابلہ پر صبر کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔

صبر کی تربیت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی طاقت اور بساط کے موافق ذمہ داریاں اٹھائے اور ان پر پختگی سے کاربند رہے۔ اس سے وہ درجہ بہ درجہ عظیم سے عظیم تر ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ صبر کا وہ مقام آتا ہے کہ پہاڑ بھی سر پر آ پڑے تو پاؤں میں لغزش نہیں آتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ہے کہ جو صبر کرے اللہ تعالیٰ اسے صبر کی توفیق دیتا ہے۔[1] محنت کی خو محنت کو آسان کر دیتی ہے۔ ؎

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں (غالب)

صبر کے تقاضے

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ صبر کے پانچ بنیادی مفہوم ہیں۔ یہی صبر کے تقاضے بھی ہیں۔ ذیل میں ہم ان پر الگ الگ نگاہ ڈالیں گے۔

ہر حال میں اپنے جذبات پر قابو رکھنا

زندگی کے ادوار بدلتے رہتے ہیں۔ انسان کو لازم ہے کہ تنگی ہو یا فراخی، غلبہ ہو یا ضعف، ہر حال اور ہر دور میں ثابت قدم رہے۔ دکھ میں بے تاب و بے قرار نہ ہو۔ سکھ میں پھول کر آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ تنگی میں حوصلہ اور ہمت نہ کھو بیٹھے۔ غلبہ میں ظلم اور فساد برپا نہ کرے۔

ناداری اور افلاس ہی میں صبر و استقامت کا امتحان نہیں، دولت اور آسائش میں بھی انسان کے جذبۂ استقامت کے لئے چیلنج ہوتا ہے۔ دولت کی فراوانی بارہا انسان کو متکبر اور برخود غلط کر دیتی ہے۔ اس لئے امیری کی حالت میں صبر کا دامن تھامے رکھنا اور نیک رہنا اجرِ عظیم کا

---

[1] مشکوٰۃ باب جامع الدعاء و جامع صغیر سیوطی

موجب ہوتا ہے۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کا معاملہ بھی خوب ہے۔ اس کی ساری بات میں بہتری ہوتی ہے۔ یہ بات سوائے مومن کے کسی اور کو حاصل نہیں۔ اس پر اچھا وقت آئے تو شکر ادا کرتا ہے اور اس میں اس کا بھلا ہوتا ہے۔ اگر سخت وقت آئے تو صبر کرتا ہے اور اس میں اس کا بھلا ہوتا ہے [1]

دنیا کے جادو میں نہ آنا صرف اصحابِ صبر کا کام ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندگی کے آخری برسوں میں کل عرب کے فرمانروا تھے۔ تاہم مزاج کے صبر و استقامت کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کی حاجتوں کو ہمیشہ اپنی ضرورتوں پر مقدم رکھا۔ حضورؐ کی زندگی میں آپؐ کے گھر والوں نے شاید ہی دو یا تین روز مسلسل پیٹ بھر کر گندم کی روٹی کھائی ہو۔ مہینہ مہینہ بھر گھر میں چولہا نہیں دہکتا تھا۔ [2]

معاف کرنا: جذبات کے استقلال کے سلسلہ میں عفو کا ذکر بھی ضروری ہے۔ دشمن کو مغلوب کر لینے کے بعد اس سے عدل کرنا یا اسے معاف کر دینا صبر کا عین تقاضا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی تعلیم ہے کہ :

۱۔ بدلہ ہی لینا ہو تو صرف برابر کا بدلہ لو۔

۲۔ صبر کرو اور بخش دو تو بڑے عزم کی بات ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پہلوان وہ نہیں جو (دوسروں کو) پچھاڑ دینے والا ہے۔ پہلوان تو وہ ہے جو غصہ کے وقت خود پر قابو پاتا ہے۔ [3]

فتح مکہ کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے خون کے پیاسوں کو بھی معاف کر دیا۔ آپؐ کے چچا کا قاتل سامنے آیا تو اسے بھی امان دے دی۔ جنگ کے بارے میں اسلام کی ہدایات یہ ہیں کہ عورتوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور نہ کسی پر ظلم کیا جائے۔

وضعداری: اس ضمن میں وضعداری کا ذکر بھی آنا چاہیئے۔ اسلام نے ہمیں شائستہ تہذیب اور شستہ آداب عطا کئے ہیں۔ ان سے ملّت اسلامیہ کا امتیاز قائم رہتا ہے لہٰذا ان پر پختہ رہنا چاہیئے۔ یہی وضع داری ہے۔

بے صبر اور بے حوصلہ لوگ ہر نئے فیشن کے پیچھے بھاگتے ہیں اور بندروں کی طرح

---

[1] ریاض الصالحین باب الصبر [2] صحیح مسلم کتاب الزہد [3] ریاض الصالحین باب الصبر بحوالہ صحیحین

بے سوچے سمجھے اغیار کی نقالی کرتے ہیں۔

(دوم) مشکلات اور بے سامانی میں تحمل کرتے ہوئے کشائش کا انتظار کرنا

آدمی مصائب میں گھر جائے اور مقابلہ کی طاقت اور سامان نہ ہو تو بے تاب یا بے ہمت نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے لَو لگائے، موافق وقت اور کشائش کا منتظر رہے۔ قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ مشرکین کی ایذا رسائی پر صبر کرنا انبیاء علیہم السّلام کا شیوہ رہا ہے[1] یہاں صبر سے یہی مُراد ہے۔ صبرِ ایوبؑ بھی اسی معنی میں آیا ہے[2] دنیاوی مصائب پر آدمی صبر کا اظہار کرے تو ثواب کا موجب ہوتی ہیں اور اگر بے چینی، بے دلی اور بے یقینی کا ثبوت دے تو عذاب بن جاتی ہیں۔ کسی بستی میں طاعون پھیل جائے تو اسلام کا حکم ہے کہ وہاں داخل نہیں ہونا چاہیئے لیکن جو لوگ اس بستی میں موجود ہوں انہیں وہاں سے بھاگنے کی اجازت نہیں۔ طاعون جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا ہے۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیں تو سارے ملک میں جراثیم پھیلا دیں گے۔ اس لئے اسلام طاعون زدہ بستی کے مکینوں کو صبر کر کے وہیں مقیم رہنے کا حکم دیتا ہے کسی کو اس حال میں موت آ جائے تو شہید ہو گا۔

اُسوۂ نبوی :

مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت پر یقین رکھتے ہوئے عزم و ہمت کے ساتھ تحمل کرنا چاہیئے، اللہ تعالیٰ کامیابی کی صورت دکھائے گا۔ ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اس سلسلہ میں بارگاہِ الٰہی سے جو ہدایات ارشاد ہوئی ہیں وہ اُمّت کے لئے بھی چراغِ راہ ہیں مثلاً : (۱) وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (۵۲:۴۸)

ترجمہ : اور اپنے رب کے فیصلہ کا استقلال سے انتظار کریں کہ ہماری آنکھیں آپؐ کی پاسبان ہیں۔

(۲) دشمن کی سخن سازی اور دل آزاری کے بارے میں حکم ملا:

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ

ترجمہ : صبر کریں اس پر جو وہ کہتے ہیں۔

مطلب یہ نہ تھا کہ آپؐ خاموش ہو جائیں بلکہ یہ کہ ان کی ایذاؤں کے سامنے ہمت نہ ہاریں۔

---

[1] دیکھو سُورۃ ابراہیم ۱۱-۱۲ [2] دیکھو سُورۃ صٓ - ۴۴

نبوّت کے ساتویں برس حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو دشمنانِ دین کے ہاتھوں خاندان سمیت ایک گھاٹی میں محصور ہونا پڑا۔ تین برس اسی حال میں گزر گئے۔ سب قریش نے مقاطعہ کر رکھا تھا۔ آپؐ کے خاندان سے خرید و فروخت اور لین دین کی ممانعت تھی۔ کلام کا بھی کوئی روادار نہ تھا۔ فاقوں پر فاقے گزرے لیکن جبینِ نبوّت پر بل نہ آیا۔ مسلسل صعوبتیں آپؐ کے قدم نہ ڈگمگا سکیں۔ دشمنوں کے ولولے آخر سرد پڑ گئے۔ اور قدغن خود بخود ٹوٹ گیا۔

صحابہ کرام رضؓ کا صبر:

صحابۂ کرام رضؓ پر کفارِ مکّہ نے لرزہ خیز ستم ڈھائے مگر انہوں نے انتہائی بے بسی کے عالم میں بھی دل نہ چھوڑا اور نہ ان مصائب سے گلو خلاصی کے لئے عجلت پسندانہ بے چینی دکھائی۔ مکّہ میں صحابۂ کرامؓ پر دشمن کی سختیاں حد سے بڑھ گئیں تو ایک دن حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں عرض گزار ہوئے، کیا آپؐ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد طلب نہیں کرتے اور دعا نہیں مانگتے؟ فرمایا، تم سے پہلے (حق پرستوں پر یہاں تک گزری کہ) ان میں سے آدمی کو پکڑ کر اس کے لئے زمین میں گڑھا کھودتے، اسے گڑھے میں کھڑا کرتے، پھر آرا لاتے، اس کے سر پر چلاتے اور وہ دو ٹکڑے ہو جاتا۔ نیز آہنی کنگھیاں اس کے گوشت اور ہڈیوں میں پھیرتے لیکن یہ بات اس کو دین سے نہ روک سکتی۔ [1]

راہِ حق میں آبلہ پائی کی جو لذت ہے اس سے کیفیت آشنا وہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے اس کی دولت سمیٹی ہے۔ وہ کانٹوں میں اُلجھ کر جینے کے کس قدر متوالے ہوتے ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پیش کش فرمائی کہ مکّہ کا سنگستان میرے لئے سونا کر دے۔ میں نے کہا، یارب! نہیں، بلکہ ایک دن کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ [2] آپؐ کا ارشاد ہے کہ سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کے لیے ہے۔ پھر درجہ بہ درجہ اوروں کے لئے۔ [3] آپؐ نے سب سے بڑھ کر زندگی کے امتحان میں حصہ لیا ہے۔

دنیا کی ہر تکلیف گناہ کی آلائش کو دھوتی ہے۔ ہر دشواری اور ہر بلا مردانِ کار کے لئے دعوتِ عمل اور وسیلۂ قربِ الٰہی ہے۔ یہیں ان کے صبر کے جوہر کھلتے ہیں اور وہ دنیا و آخرت میں

---

[1] ریاض الصالحین باب الصبر [2] ترمذی ابواب الزہد [3] الجامع الصغیر سیوطی (اَشَدّ...)

سرخرو ہوتے ہیں۔ ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت ناگواریوں کے حجاب میں ہے۔[1]

اسلام مصائب کے وقت تحمل کا حکم دیتا ہے۔ فرار کی اجازت نہیں دیتا۔ دکھ سے چھٹکارا پانے کے لئے موت کی آرزو ممنوع ہے اور خودکشی حرام۔ ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں جہاد کیا اور زخم کھایا۔ وہ زخم کا درد سہہ نہ سکا اور رات کو خودکشی کر لی۔ حضورؐ نے فرمایا، یہ جہنم میں جائے گا۔[2]

عزیزوں کی موت پر صبر : عزیزوں کی موت سے دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ لیکن ایسے میں بھی صبر و رضا کے اظہار کا حکم ہے۔ میت پر چیخا پکارنا اور اپنے کو زدوکوب کرنا حرام ہے۔ دل کے جذبات کو کون مٹا سکتا ہے، لیکن بے صبری سے گریز چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ نزع کی حالت میں تھے۔ آپؐ نے انہیں اٹھایا تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تاہم زبان سے یہی فرمایا کہ آنکھیں اشک ریز ہیں اور دل غمگین لیکن ہم زبان سے وہی کہیں گے جس سے اللہ تعالےٰ راضی ہو۔[3] آپؐ عورتوں سے بیعت میں یہ عہد لیا کرتے تھے کہ نوحہ نہیں کریں گے۔[4]

غربت پر صبر : مفلسی انسان کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیتی ہے اور اخلاقی بندشوں کو توڑنے پر اکساتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو جو چیز آمادۂ گناہ کرتی ہے وہ دراصل مفلسی نہیں، طمع ہے جسے اللہ تعالیٰ کے صاحبِ عزم بندے عین فقر و فاقہ میں بھی دبائے رکھتے ہیں وہ قناعت اور خودداری پر حرف نہیں آنے دیتے۔ حدیث کی رو سے مفلس وہ نہیں جس کے پاس مال نہ ہو بلکہ وہ ہے جس کے حساب میں قیامت کے روز کوئی نیکی نہ بچے گی۔[5] فرمان رسالت ہے کہ اس شخص نے فلاح پائی جو اسلام لایا، اس نے ضرورت بھر رزق پایا اور اللہ تعالےٰ نے اسے قناعت دی۔[6]

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس اللہ تعالےٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ مجھے شکستہ دل بندوں کے پاس تلاش کرو۔ حضرت اسماعیلؑ نے پوچھا، یا اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ جواب ملا، صابر فقراء۔

---

[1] ریاض الصالحین باب المجاہدۃ [2] ترمذی کتاب الجنۃ [3] مسلم کتاب الایمان [4] ابوداؤد کتاب الجنائز [5] مسلم کتاب الجنائز [6] دیکھو مجمع الزوائد کتاب القیامت (۹۹۹۱) [7] ترمذی ابواب الزہد

(سوم) حالات تقاضا کریں تو دشمن کے مقابلہ پر جان کی بازی لگا دینا

سرو سامان میسر ہو تو دشمن کا جم کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ بزدلی دکھانا مشرک کا فعل ہے۔ قرآنِ حکیم ان لوگوں کو جو میدانِ جنگ سے فرار کرتے ہیں، عذابِ جہنم کی خبر دیتا ہے[1] حکم ہے کہ تم اپنے سے دس گنا فوج پر غالب نہیں آتے تو کم از کم دُگنا کے مقابل تو ضرور ڈٹ جاؤ۔[2]

جنگ میں ثابت قدمی: قرآنِ حکیم نے بتایا ہے کہ جو لوگ میدانِ جنگ میں ثابت قدمی دکھاتے ہیں وہ سچ کر دکھانے والے اور متقی ہیں۔[3] صابرین کی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ راہِ حق میں نہ سستی کرتے ہیں نہ کمزوری دکھاتے ہیں[4]

جہاد میں ثابت قدم رہنے کا انعام جنت ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جنگ کی تمنّا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے امن کے خواہاں رہو لیکن جنگ آ پڑے تو ثابت قدم رہو اور جان لو کہ جنّت تلواروں کے سایہ تلے ہے۔[5] ایک صحابی رضؓ نے آپؐ سے پوچھا کہ اگر میں جہاد میں مارا جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ فرمایا، ہاں! بشرطیکہ تم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں صابر، طالبِ ثواب اور پیش قدم رہ کر جان دی[6]

سالارِ انبیاء صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک ایک معرکہ میں دشمن کے طوفانی زور و شور کے آگے جس شجاعت۔ اور ثابت قدمی کے جوہر دکھائے ہیں دنیا کی تاریخ میں اس کا جواب نظر نہیں آتا۔ خندق کی جنگ میں تقریباً چوبیس ہزار مشرکین نے مدینہ کو پندرہ روز تک محاصرے میں رکھا۔ مجاہدین کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی۔ موسم سخت خراب تھا اور رسد کی کمی کا یہ حال تھا کہ کئی کئی روز فاقے سے گزر گئے۔ لیکن حضورؐ نے ہمّت نہ ہاری۔ دشمن آخر موسم کی سختی اور غلّہ کی کمی سے بددل ہو کر واپس چلا گیا اور اس طرح اہلِ اسلام کے صبر اور استقامت کے بدولت مشترک حملہ آوروں کو رسواکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آئندہ انہیں مدینہ پر حملہ کی جرأت نہ ہوئی۔

حُنین کے معرکہ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی فوج پہلے ریلہ میں تتر بتر ہو گئی

---

[1] دیکھو سورۃ الانفال۔ ۱۶ [2] دیکھو سورۃ الانفال۔ ۶۵۔۶۶ [3] دیکھو سورۃ البقرۃ ۱۷۷۔ [4] دیکھو سورۃ ال عمران۔ ۱۴۶ [5] ریاض الصالحین باب الصبر [6] ریاض الصالحین باب الجہاد حدیث ۲۹

آپؐ کچھ دیر تنہا رہ گئے لیکن ایسے میں بھی اپنے خنجر کو عین تیروں کی بوچھاڑ میں دشمن کی سمت بڑھاتے رہے۔ آپؐ کے اس لرزہ فگن استقلال نے دشمن کو شکست کی راہ دکھائی۔

(چہارم) نیک عمل کا دوام

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہ عمل سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے جس کو دوام رہے چاہے قلیل ہو[1]

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قرآن حکیم میں ایک جگہ عبادت[2] اور ایک جگہ نماز پر خصوصیت سے پختہ رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ نماز سب عبادات کی جان ہے اور عبادات دیگر اعمال کی بنیاد، لہٰذا سارے اعمال میں صبر یعنی ثابت قدمی کی ضرورت ہے۔

(پنجم) عمل اور دُعا کے ثمرہ کا سکون و قرار سے انتظار کرنا

بے تابی اور کم حوصلگی راہِ حیات کی رکاوٹیں ہیں بے صبرا در عجلت پسند آدمی نہ صرف دنیاوی کام بگاڑ دیتا ہے۔ بلکہ بارہا آخرت کا زیاں بھی کر جاتا ہے اس لئے اسلام اپنے پیروؤں کو تلقین کرتا ہے کہ اعمال کے نتائج اور دُعا کے اثر کے لئے بے تاب نہ ہوں۔

بارہا ہم زندگی میں کسی فاجر اور بے اصول شخص کو دیکھتے ہیں کہ دنیا میں پھل پھول رہا ہے اور پھر اپنے حال پر نظر کرتے ہیں کہ دیانت کے باوصف بعض مرادوں سے محروم ہیں تو دل کو ٹھیس سی لگتی ہے لیکن یہ بات بھولنے کی نہیں کہ جو مراتب دیانت سے حاصل کئے جاتے ہیں، وہ دیرپا ہوتے ہیں۔ غلط شعاروں کے مرتبے جلد یا بدیر چھن جاتے ہیں۔ ان کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ اللہ مست لوگ بے شک آئے دن زمانے کے حوادث سے دوچار رہتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ انہیں بُرے انجام سے بچائے رکھتا ہے۔ جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کی مثال کچی فصل کی ہے۔ ہوا جدھر سے آئے اسے جھکا دیتی ہے۔ جب ہوا ٹھہر جائے تو فصل سیدھی ہو جاتی ہے۔ فاجر کی مثال صنوبر کی ہے جو سخت ہوتا ہے، اور سیدھا کھڑا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے اسے اکھاڑ دیتا ہے[3] حضورؐ نے فرمایا

---

[1] جمع الفوائد باب الاقتصاد فی الاعمال (۱۷۰) [2] دیکھو سورۃ مریم - ۶۵ [3] دیکھو سورۃ طٰہٰ - ۱۳۲۔
[3] بخاری کتاب المرضیٰ۔

ہے کہ جب (مومن) بھی دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا سوال پورا کرتا ہے یا اس سے اس کے برابر دکھ دور کر دیتا ہے جب تک کہ گناہ یا رشتہ شکنی کا سوال نہ کرے [1]

ثمرات

۱۔ صبر کا اجر بے کنار ہے: بشارتِ ربانی ہے:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۹ : ۱۰)

ترجمہ: صبر والوں ہی کو ان کا اجر بغیر حساب کے ملتا ہے۔

اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ صبر کی فضیلت از بس بلند ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر سے بہتر اور کشادہ تر کوئی چیز نہیں [2] حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اس کو مصائب سے آزماتا ہے [3]

۲۔ صبر عبادت ہے:

صبر بندگی کا خوبصورت ترین زیور ہے اور رضا و تسلیم کی ایک روشن علامت۔ مشکلات گھیر لیں اور آدمی اللہ تعالیٰ سے لو لگا کر ان کا پامردی سے مقابلہ کرے اور اس کی نصرت کا منتظر رہے تو اس سے بڑھ کر بندگی اور تسلیم کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

کشادگی کا انتظار سب سے افضل عبادت ہے [4]

۳۔ صبر کامیابی کی ضمانت ہے:

بڑی سے بڑی مشکل یا مہم آ پڑے اور آدمی صبر و سکون سے اس کا مقابلہ کرتا رہے تو آخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ جہاد کا میدان ہو، صنعت و حرفت کی دنیا یا علم و حکمت کی جولان گاہ، جس جگہ بھی صبر کا دامن تھام رکھا جائے وہاں کامیابی قدم چومتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

(۲ : ۱۵۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ مدد چاہو، یقیناً اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔

---

[1] ترمذی ابواب الدعوات [2] دیکھو ترمذی باب الصبر [3] بخاری کتاب المرضیٰ
[4] ترمذی ابواب الدعوات۔

جن کو صبر و حوصلہ کی دولت نصیب ہوتی ہے وہ مشکل کو مشکل نہیں سمجھتے، انہیں زندگی کا نقصان پریشان نہیں کرتا اور وہ دکھ میں بے حال نہیں ہوتے، حوادث میں بھی مسکراتے ہیں اور آزمائش کا سامنا کشادہ دل سے کرتے ہیں۔ ایسی ہی حالت کے بارے میں ارشادِ نبویؐ ہے:

وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ — اور جان لے کہ (اللہ کی مدد) صبر کے ساتھ ہے
وَاَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ — اور یقیناً کشائش دکھ کے ساتھ ہے۔
وَاَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا [1] — اور یقیناً تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔

۴۔ صبر سے گناہ دُھل جاتے ہیں:

صبر کی کامیابیاں اسی زندگی کے لئے نہیں، آخرت کے لئے بھی ہیں۔

زندگی کے آلام سے کون بھاگ سکتا ہے! لیکن ایمان والوں کے لئے یہی آلام اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بہانہ بن جاتے ہیں۔ ہر دکھ کے عوض ان کا کوئی نہ کوئی گناہ مٹتا ہے۔ جو لوگ مصائب پر بے چینی کا اظہار کریں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جائیں ان کے لئے دنیا کا ہر دُکھ آخرت کے دکھ کا موجب ہو جاتا ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ صبر نہ ہو تو افلاس اور بیماری عذاب ہیں اور صبر ہو تو انعام و اکرام۔

حدیثِ قدسی ہے کہ جب میں اپنے مومن بندے کی کسی محبوب شے کو اس سے لے لیتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو اسے جنت سے نوازتا ہوں[2]۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن پر جب بھی کوئی سختی، بیماری، فکرمندی، حزن، ایذا، یا غم آئے یہاں تک کہ اسے کانٹا بھی چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کی کچھ خطائیں معاف کر دیتا ہے[3]۔ اس سلسلہ میں آپؐ کا مزید ارشاد یہ ہے کہ مومن پر جان، مال اور اولاد کی آزمائشوں کا تار بندھا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے پاس جاتا ہے تو اس کی کوئی خطا باقی نہیں رہتی[4]۔

۵۔ صبر والوں کو جنت جلد نصیب ہو گی

انتظار کے لمحے طویل ہوتے ہیں لیکن جو شخص اس دنیا میں نیکی پر ثابت قدم رہے اور فرائض سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب کا منتظر رہے آخرت میں اس کو اجر کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا

---

[1] اربعین نووی حدیث رقم۔ ۱۹ [2] ریاض الصالحین باب الصبر حدیث رقم۔ ۱۰ [3] ریاض الصالحین باب الصبر، حدیث۔ ۱۳۔ [4] ریاض الصالحین باب الصبر، حدیث رقم۔ ۲۶۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فقر والے مہاجرین تونگروں سے پانچ سو برس قبل جنّت میں داخل ہوں گے[1]

سوالات

۱۔ قرآنِ حکیم کی روشنی میں صبر کا مفہوم واضح کیجئے، نیز اس کی فضیلت بیان کریں۔

۲۔ صبر کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم واضح کریں، نیز قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی اہمیّت بیان کریں۔

۳۔ صبر کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی فضیلت و اہمیّت بیان کیجئے۔

۴۔ صبر سے کیا مراد ہے؟ صبر کے ثمرات وفوائد کتاب وسنّت کی روشنی میں بیان کیجئے۔

---

[1] جمع الفوائد کتاب الزہد۔

تحمّل

مفہوم : تحمّل کا مادہ حمل ہے۔ جس کے معنی ہیں : اٹھانا
تحمل کے لغوی معنی ہیں : اٹھانا، برداشت، بردباری۔ یہ اس کے خاص معنی ہیں۔ اس کے عام معنی میں نرمی اور تواضع بھی شامل ہیں۔
تحقیقی نگاہ سے دیکھا جائے تو تحمل کے حسب ذیل مفہوم سامنے آتے ہیں:

(۱) زندگی کے فرائض کو دل کی خوشی سے سنبھالنا۔
(۲) مشکلات کو عزم وہمت سے برداشت کرنا۔
(۳) جلد بازی نہ کرنا۔
(۴) معاشرہ سے ایذاء پہنچے تو تنگ دل یا نالاں نہ ہونا۔
(۵) نرمی یا تواضع سے پیش آنا۔

صبر اور تحمّل میں فرق

تحمل صبر کا جزو ہے۔ صبر میں معنوی وسعت بہت زیادہ ہے۔ یہ ساری زندگی کو حاوی ہے اور ہر حال میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ تحمل کی اس قدر وسعت نہیں۔
تحمل ہمیشہ سہار اور برداشت کا تقاضا کرتا ہے۔ صبر ضرورت پڑنے پر مقابلہ اور غلبہ کی دعوت دیتا ہے۔
تحمل کے لئے بھی اگرچہ ثابت قدمی ضروری ہے لیکن اس کے لئے ثابت قدمی صرف شرط کا حکم رکھتی ہے۔ صبر میں ثابت قدمی رکن ہے۔

تحمّل کے مراتب :

تحمل کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ آدمی اپنی طبیعت پر جبر کرنا سیکھے۔ اس کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ طبیعت میں برداشت کا ملکہ اس حد تک پختہ ہو جائے کہ بڑی سے بڑی مصیبت یا ناگواری کو بغیر کسی جبر یا تکلیف کے برداشت کرے۔ چہرے پر ملال یا پریشانی کا کوئی اثر نمودار نہ ہو۔

اہمیّت :

۱۔ تحمّل کے بغیر فرض ادا نہیں ہو سکتا :

سُورَۃُ الاحزاب میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امانت کو پہلے ارض وسماوات اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن وہ ڈر گئے اور اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ پھر انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ (دیکھو آیت ۔ ۷۲)

یہاں امانت سے مراد خلافتِ الٰہیّہ ہے۔ یہ امانت ہزار در ہزار فرائض کا سرچشمہ ہے۔ جسے اشرف المخلوقات نے دل کی رضا اور خوشی سے اٹھا لیا۔

فرائض کو خوشی سے سنبھالنا، ان کی بجا آوری کے لئے ہمہ تن آمادہ رہنا اور اس سلسلہ میں تکالیف کا بوجھ کھلے دل سے اٹھانا عین تحمّل ہے جس میں یہ ملکہ نہ ہو وہ ذمہ داری سے پہلوتہی کرتا ہے، پھر اسے آہستہ آہستہ ہر حقیقت سے فرار کی عادت پڑ جاتی ہے اور بیوقوفوں کی جنت بسا لیتا ہے۔ دشمن مٹانے کے لئے سر پر آ موجود ہو تو ایسے میں بھی دل کو باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ مصیبت از خود ٹل جائے گی۔ اس کی ایک نمایاں مثال عباسی خلیفہ مامون ہے جو آخر دم تک خوش فہمیوں میں مبتلا رہا اور پھر اچانک ہلاکت کی نذر ہو گیا۔

۲۔ تحمّل نشیب و فراز میں سنبھالتا ہے :

کون ہے جسے عمر بھر عروج یا چین نصیب ہوا ہے۔ زندگی کروٹ بدلتی ہی رہتی ہے۔ آج عروج ہے تو کل زوال، آج خوشی ہے تو کل ماتم۔ تحمّل انسان کو اس قابل رکھتا ہے کہ زوال کے دن آئیں تو مایوس اور نیم جان نہ ہو۔ حوادث کو مردانہ وار سہہ سکے۔

۳۔ نرم مزاجی معاشرتی زندگی کے لئے ضروری ہے :

تحمّل کی مذکورہ بالا اہمیّت اس کے لغوی معنی کے اعتبار سے ہے۔ عام معنی بردباری، نرم مزاجی اور تواضع کے اعتبار سے بھی یہ نہایت اہم ملکہ ہے۔

انسان میں تحمّل نہ ہو تو معاشرہ میں گزر نہیں کر سکتا۔ نازک مزاجی انسان کو اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ دوسروں کی کوتاہیوں یا لغزشوں پر صبر کر سکے۔ وہ بات بات پر اُلجھتا اور بگڑتا ہے۔ وہ الگ تھلگ رہنا پسند کرتا ہے۔ اس لئے حدیث میں یہ وضاحت ہے کہ وہ مومن جو دیگر لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کر کے ان میں مقیم رہتا ہے اس مومن سے اچھا ہے جو ایذاؤں سے بھاگ کر

کنجِ تنہائی میں جا بیٹھتا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ وُہ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ہوتے ہیں۔ اَذِلَّہ جمع ہے ذلیل کی۔ یہ لفظ عربی زبان میں اچھے معنی بھی دیتا ہے یعنی متحمل اور بردبار۔ اس جگہ یہی معنی ہیں۔ مراد یہ کہ ایمان والے لوگ ایمان والوں کے سامنے بردباد ہو کر رہتے ہیں۔

۴۔ تحمّل اور اربابِ اقتدار

تحمّل کی ضرورت ویسے تو ہر شخص کو ہوتی ہے لیکن اس کی سب سے زیادہ اہمیت اربابِ اقتدار کے لئے ہے۔ اقتدار کو کھلی ڈھیل دے دی جائے تو اس میں تکبّر کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اربابِ اقتدار کو تحمّل سے آراستہ رہنا چاہیئے تاکہ عوام سے قریبی تعلق رکھ سکیں، عوامی مسائل سے آگاہ رہیں اور شکایات ان تک بے روک پہنچ سکیں۔

۵۔ تحمّل اور عوام

عوام کو بھی اربابِ اقتدار کے باب میں تحمّل سے کام لینا ضروری ہے۔ حاکم سے غلطی ہو جائے تو اسے اصلاح کا موقع دیا جائے۔ بغاوت سے پرہیز چاہیئے۔ ورنہ ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔

تحمّل کی تربیت

تحمّل کا درس عیش و راحت کے شبستانوں میں نہیں زندگی کے کارزاروں اور خارستانوں میں ملتا ہے۔ فلسفۂ اخلاق کی ہزار کتابیں پڑھ لی جائیں لیکن تحمّل کی تربیت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ طوفان کے تھپیڑوں سے واسطہ نہ پڑے۔ جناب رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے:

حلیم وہ ہے جس نے ٹھوکر کھائی ہے اور صاحبِ حکمت وہ ہے جسے تجربہ حاصل ہے۔[1]

تحمّل کی شرطیں

(۱) دل کی قوّت: تحمّل جبھی پیدا ہو سکتا ہے کہ دل قوی ہو۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

---

[1] مشکوٰۃ۔ باب الحذر

قوی مومن ضعیف مومن کے مقابل میں بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کو عزیز تر ہے۔ اگرچہ دونوں میں بھلائی ہے۔

بعض علماء نے یہاں قوی کے معنی یہ بتائے ہیں کہ وہ لوگوں کی ایذاؤں کا تحمل کرکے ان سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تحمل کے لئے دل کی قوت لابدی ہے۔

(۲) دل کی رضا :

تحمل کے لئے دل کی رضا چاہیئے ورنہ اسے تحمل کے بجائے جبر کہیں گے جس میں کوئی فضیلت نہیں۔ کام ناخوشی یا دباؤ سے انجام دیا جائے تو اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی فرمانبرداری کو طاعت بھی کہتے ہیں۔ لغت کی رو سے طاعت اس فرمانبرداری کو کہیں گے جو دل کی خوشی سے انجام دی جائے۔

(۳) اعتراف حقیقت :

تحمل کے لئے ضروری ہے کہ انسان زندگی کے حقائق کا اعتراف کرے۔ مثلاً بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں، نازل ہوکر رہتا ہے لیکن بعض لوگ اس سے فرار کرنا چاہتے ہیں اور سفید بال اکھاڑ کر یا خضاب سے کالے کرکے جوان بنے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگ زندگی کے ٹھوس تقاضوں کو ہمیشہ ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔ یہ معرکہ کے تصور ہی سے کانپ جاتے ہیں اور دشمن کے آگے جلد ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

تحمل کے تقاضے :

گذشتہ اوراق میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ تحمل کے پانچ بنیادی مفہوم ہیں۔ یہی پانچ مفہوم اس کے تقاضے بھی ہیں جن پر ہم ذیل میں الگ الگ بحث کریں گے۔

(۱) زندگی کے فرائض کو دل کی خوشی سے سنبھالنا :

انسان پر خاندان، معاشرہ، ملک اور دین کی طرف سے بے شمار فرائض عائد ہوتے ہیں ان فرائض کے لئے اپنے اندر اہلیت پیدا کرنی چاہیئے اور ان کا بوجھ اٹھانے کے لئے دل کی

---

[1] دلیل الفالحین باب فی المجاہدہ

خوشی سے تیار رہنا چاہیئے۔ جہاد کا وقت ہو تو کوئی آدمی کوتاہی نہ کرے۔ خدمتِ خلق میں جہاں تک ہو سکے حصہ لے۔ نیکی کی اشاعت اور بدی کے استیصال میں دریغ نہ کرے۔ قومی بہبود کو اپنی بہبود کی طرح عزیز جانے اور بغیر کسی صلہ و ستائش کی تمنا کے ملّی خدمات میں شریک ہو۔ جو قوم ان اوصاف سے بے نصیب رہے وہ کامیابی کی منزل کو ترستی رہتی ہے۔

بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال بیٹھ جاتا ہے کہ قومی امور کے لئے حکومت ہی ذمہ دار ہے۔ ہمیں فکر کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال تباہ کن ہے۔ ہر فرد کو لازم ہے کہ جب بھی موقع ملے قومی فلاح کے کام میں شریک ہو۔

اسلام کے آغاز میں لوگ ہر قومی خدمت کو دینی خدمت سمجھتے تھے اور سرکاری کام بغیر کسی تنخواہ کے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے انجام دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں سرکاری ملازموں کو تنخواہ لینے پر مجبور کیا۔

ذمہ داریوں کے تحمل کے سلسلہ میں دو باتیں مدنظر رہیں

(اوّل) عہدہ و اعزاز کی ہوس نہ ہو۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اس شخص کو جو خود کسی عہدہ کا طلب گار ہو تا عہدہ نہیں دیتے تھے۔

(دوم) کوئی ایسا بوجھ نہ اٹھایا جائے جو اپنی طاقت سے زیادہ ہو ورنہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور بارہا ہمت سرد پڑ جاتی ہے۔ ایک دفعہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا کہ مومن کو زیبا نہیں کہ، اپنے کو ذلیل کرے۔ صحابہ رضؓ نے پوچھا، حضورؐ! وہ کیسے اپنے کو ذلیل کرتا ہے؟ فرمایا، وہ ایسی آزمائش کو چیلنج کرتا ہے جس کے لئے اس میں طاقت نہیں ہوتی [1] ایک صحابیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے کسی عہدہ کی درخواست کی آپؐ نے فرمایا کہ یہ امانت ہے اور قیامت کے روز رسوائی اور ندامت بن کر سامنے آئے گی سوائے اس کے جس نے اس کو لیتے وقت اس کا حق مانا اور اس کے بارے میں اپنے فرائض ادا کئے [2]

قوم کی طرف سے جو عہدہ یا خدمت سونپی جائے اس کا پورا احساس رکھنا چاہیئے۔ غفلت یا تن آسانی تحمل کے منافی ہیں۔ عہدہ کی ذمہ داری کو پوری طرح قبول کرنا اور پھر اس کی بجا آوری کے لئے کامل توجہ اور کوشش صرف کرنا عین تحمل ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ باب جامع الدعاء [2] ریاض الصالحین باب النہی عن سوال الامارۃ

انفرادی یا قومی ذمہ داریوں سے فرار کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ مثلاً بالغ ہونے کے بعد ہر مسلمان کو گھر بسانے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ جو آدمی استطاعت کے باوجود نکاح سے گریز کرتا ہے وہ ایک دینی ذمہ داری سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔

(۲) مشکلات کو عزم و ہمت سے برداشت کرنا :

زندگی میں مشکلات یا مصائب پیش آئیں تو انہیں ہمت و حوصلہ سے برداشت کیا جائے۔ جو آدمی مصیبت کی سہار نہ رکھتا ہو اس سے کسی ایمانداری، وفاداری یا اچھے کارنامہ کی توقع نہیں ہو سکتی۔

اسلام کے آغاز کی داستان پڑھی جائے تو معلوم ہو گا کہ صحابۂ کرامؓ نے اسلام کی راہ میں کس قدر دلدوز مصائب اٹھائے لیکن منزل سے منہ نہ موڑا۔ ان کی قربانیاں آخر رنگ لائیں اور اسلام سارے عرب پر چھا گیا۔

ہجرت کے چوتھے برس کا واقعہ ہے کہ ایک صحابی حضرت خُبَیبؓ نامی کو مشرکین مکہ شہید کرنے کے لئے قتل گاہ میں لے کر چلے تو ابوسفیان نے جو اس وقت کافر تھے ان سے پوچھا، تمہیں اللہ کی قسم! سچ سچ بتاؤ کیا تم نہیں چاہتے کہ اس وقت تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں، ہم آپؐ کا سر قلم کریں اور تم اہل و عیال میں ہو۔ خُبَیبؓ نے جواب دیا کہ مجھے تو یہ بھی قبول نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور میں آرام سے گھر بیٹھا ہوں۔

تحمل کی اسلام میں بڑی بڑی ایمان پرور مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت حسینؓ نے کربلا کے میدان میں تحمل کی جو مثال قائم کی ہے وہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں کل انسانیت کے لئے سرچشمۂ درس ہے۔

امیر عبدالرحمان مرحوم والیٔ کابل کو ہر وقت اپنے ملک کی فکر رہتی تھی۔ ایک دفعہ ان کی ٹانگ کے اپریشن کی ضرورت ہوئی۔ طبیبوں نے کہا آپ کو دو گھنٹے تک بیہوش رکھنا پڑے گا۔ امیر نے جواب دیا، میں اتنی دیر تک اپنے ملک کی فکر سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ تم ہوش کی حالت میں آپریشن کرو۔ ڈاکٹروں نے ان کی ٹانگ کو چیرا پھاڑا اور انہوں نے اُف تک نہ کی۔

(۳) جلد بازی نہ کرنا :

تحمل کا تقاضا ہے کہ آدمی کسی چیز کی خاطر جلد بازی یا عجلت نہ کرے۔ وقار، سکینت اور ضبط و قرار مومن کا خاصا ہے جس سے کسی حالت میں دستبردار نہیں ہونا چاہیئے۔

کوئی کام سونپا جائے تو اسے ٹالنے کو جلد جلد انجام تک نہیں پہنچانا چاہیئے، ورنہ

آدمی سب فرائض سے پیچھا چھڑانے کا عادی ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ تحمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور عجلت بازی شیطان کی طرف سے[1]

اسلام میں ضبط و تحمل کی یہاں تک تلقین ہے کہ اگر نماز باجماعت کا وقت نکل رہا ہو تو شریک ہونے کے لئے بھاگنے کی اجازت نہیں۔

ایک دفعہ عربوں کا ایک وفد جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ لوگ جب مدینہ پہنچے تو نہایت عجلت سے حضورؐ کی خدمت میں روانہ ہوئے۔ لیکن رئیس وفد نے تحمل سے کام لیا۔ سواریوں کیلئے کچھ دیر رک گئے، ان کا سامان سنبھالا، اپنی اونٹنی کے گھٹنے باندھے، عمدہ لباس پہنا اور پھر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور اثنائے کلام میں فرمایا، تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ کو بہت محبوب ہیں یعنی ضبط اور (تأمل آمیز) تحمل[2]

زندگی کی راہ میں مشکلات کا ہجوم ہو جائے تو اس بات کے لئے بے تاب نہیں ہونا چاہیئے کہ ہمارے حق میں فیصلہ جلد کیوں نہیں ہو رہا۔

(۴) معاشرہ سے ایذا پہنچے تو تنگ دل یا نالاں نہ ہونا :

بارہا معاشرہ کے بعض افراد کی طرف سے ناحق تکلیف پہنچتی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اس تکلیف یا ایذاء پر بے حوصلہ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کو خوشی سے برداشت کرے۔

سورۃ الفرقان میں بندگانِ رحمان کی ایک صفت یہ آئی ہے۔

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵ : ۶۳)

ترجمہ : اور جب اکھڑ لوگ انہیں مخاطب کریں تو یہ سلام کہہ دیں۔

مراد یہ کہ اہل ایمان جاہلانہ حرکت کا جواب ویسی ہی حرکت سے نہیں دیتے۔ کوئی اکھڑ شخص تیز کلامی کرے تو اس سے الجھتے نہیں بلکہ اس کے اجڈپن کو فراخدلی سے برداشت کرتے ہیں اور سلام کہہ کر یکسو ہو جاتے ہیں۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تبلیغ پر روانہ ہوتے تو ابولہب پیچھے پیچھے چلتا۔ آپؐ پر مٹی پھینکتا اور آپؐ کے خلاف بولے جاتا۔ لیکن آپؐ اس کی طرف

---

[1] مشکوٰۃ باب الحذر والتأنی [2] ریاض الصالحین باب الحلم

توجہ تک نہ کرتے اور توحید کی دعوت دیئے جاتے تھے۔

کفارِ مکہ کی بدتمیزی کا یہ عالم تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر جاکر ہنڈیا میں گندگی ڈال دیتے یا دروازہ پر غلاظت بکھیر دیتے۔ آپؐ فقط اتنا کہہ کر چپ رہ جاتے: اے بنو عبد مناف یہ کیسا پڑوس ہے؟

امام ابو حنیفہؒ ایک دفعہ مکہ کی ایک مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص منہ ڈھانپے آیا اور امام کو فحش گالی دے کر کہا کہ تم سے فلاں مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا اور تم نے حسن بصری کی رائے کے خلاف فتویٰ دیا۔ آپ نے جواب دیا کہ حسن بصری نے غلطی کی تھی۔ وہ شخص مزید بدزبانی کرنے لگا۔ آپ کے اصحاب اسے مارنے اٹھے۔ آپ نے منع کیا اور گالیاں دینے والے سے فقط اتنا کہا کہ ہاں! اس مسئلہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کا فتویٰ درست ہے، حسن بصری کا فتویٰ غلط ہے۔

(۵) نرمی اور تواضع سے پیش آنا:

تحمل کا تقاضا ہے کہ ہر آدمی سے نرمی اور تواضع کا سلوک رکھا جائے۔ تحمل کا کمال یہ ہے کہ اکھڑ اور ایذا رساں شخص سے بھی نرمی کی جائے۔ قرآن شریف میں ہدایت ہے کہ (دشمن کی) برائی کا دفعیہ خوب اچھی بھلائی سے کرنا چاہیئے۔[1]

طبیعت کو تحمل کا اس قدر خوگر ہونا چاہیئے کہ ناگوار باتوں کو بے تکلف برداشت کر جائے۔ بات بات پر لوگوں سے الجھنا، اور بدخوئی کرنا درست نہیں۔ اس سے اعصاب اور ذہنی صحت پر برا اثر پڑتا ہے اور رسوائی ہوتی ہے۔

بعض لوگ اپنے نظریات کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے جو لوگ علمی معاملات میں تحمل سے عاری ہوتے ہیں وہ نہ صرف علم کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ قوم میں فرقہ بندی کرتے ہیں۔ خود بھی خسارے میں رہتے ہیں اور قوم کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جو شخص نرمی سے محروم ہوا وہ سب بھلائی سے محروم ہوا۔[2]

تحمل معاشرہ اور قوم وملت کی پختگی کی دلیل ہے۔ اس سے انسانی روابط میں وسعت پیدا

---

[1] دیکھو سورۃ المومنون ۲۳ آیت ۹۶ [2] ریاض الصالحین باب الحلم بحوالہ مسلم

ہوتی ہے۔ نرمی، تواضع اور خاکساری کی صفات انسان کی شخصیت کو جاذب اور پرکشش بناتی ہیں۔
جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے،
ملائمت جس چیز میں ہو اسے زینت دیتی ہے۔ [1]
آپؐ نے فرمایا ہے:

يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا — آسانی پیدا کرو اور تنگی نہ کرو
وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا [2] — اور بشارت دو اور لوگوں کو نفور نہ کرو

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بدو مسجد النبیؐ میں آیا اور پیشاب کر دیا۔ لوگ اسے مارنے اٹھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اسے کچھ نہ کہو۔ پیشاب پر پانی کا ایک ڈول بہا دو۔ تم آسانی کرنے کے لئے مامور کئے گئے ہو۔ تنگی پیدا کرنے کے لئے نہیں۔ [3]

ارباب اقتدار اور تحمل:

ارباب اقتدار میں تحمل نہ ہو تو عوام میں محبوب نہیں ہو سکتے اور حکومت کی بنیادوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں رعایا کی شکایات اور مطالبات کے سلسلہ میں تحمل سے کام لینا چاہیئے۔
حضرت عمر فاروق رضؓ رعب انگیز شخصیت کے مالک تھے لیکن تحمل کے موقع پر انتہائی فراخدلی کا ثبوت دیتے تھے۔ ایک دن ایک شخص نے آپ کو سر مجلس بار بار ٹوکا۔ دوسرے آدمی نے اس سے کہا، تم نے حد کر دی۔ اب ختم کرو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، اسے کہنے دو۔ عوام ہمیں نہ ٹوکیں تو ان کا وجود بے سود ہے اور اگر ہم ان کی نہ سنیں تو ہم بے کار ہیں۔
حضرت معاویہ رضؓ ملوکیت کے بانی ہیں تاہم لوگوں کو ان سے آزادانہ گفتگو کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ ایک شخص نے آپ سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ سیدھے چلیں ورنہ ہم آپ کو سیدھا کر دیں گے۔ آپ نے پوچھا۔ کاہے سے سیدھا کرو گے؟ بولا ڈنڈے سے۔ آپ نے کہا تو پھر ہم سیدھے ہو جائیں گے۔

غیر مسلموں سے تحمل:

غیر مسلموں سے صرف انتہائی مجبوری کی حالت میں سختی کرنے کی اجازت ہے ورنہ ان کے ساتھ بھی حتی الوسع تحمل سے پیش آنا چاہیئے۔

---

[1] ریاض الصالحین باب الحلم [2] ریاض الصالحین باب الحلم [3] ریاض الصالحین باب الحلم۔

مدینہ میں ایک منافق عبداللہ نامی رہتا تھا۔ اس کو اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پوشیدہ عداوت تھی۔ جب بھی موقع ملتا۔ اسلام کو زک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ تحمل سے پیش آتے۔ ایک غزوہ سے واپسی کے وقت وہ اسلامی لشکر کے ہمراہ تھا۔ اس نے انصار اور مہاجرین کے درمیان فتنہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ اس کا بیٹا صادق الایمان تھا۔ اس نے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا، اجازت دیجئے کہ اپنے باپ کا سر حاضر کردوں۔ آپؐ نے جواب دیا، اس کے ساتھ نرمی کرو۔ جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے ہم اس کے ساتھ حسنِ سلوک رکھیں گے۔

جنابِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہدِ مبارک میں دشمنانِ اسلام آئے دن اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے۔ بارہا آپؐ کو ان کے خلاف لشکر کشی کا حکم دینا پڑا لیکن آپؐ جب بھی لشکر روانہ فرماتے تو ساتھ ہی تحمل سے پیش آنے کا حکم دیتے تھے۔ جنگِ خیبر کے اخیر میں آپؐ نے حضرت علی رضؓ کو لشکر دے کر بھیجا تو حضرت علی رضؓ نے روانہ ہوتے وقت پوچھا، جنابِ! کیا اس وقت تک تلوار چلاؤں کہ وہ ہماری راہ پر آجائیں۔ فرمایا:

علیؓ! وقار و سکون کے ساتھ جا، جب تو ان کے سامنے آئے تو انہیں اسلام کی دعوت دے اور اللہ تعالےٰ کے حقوق بتا۔ اللہ کی قسم! شخصِ واحد کا تیرے ہاتھ پر اسلام لانا سُرخ اونٹوں سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔

جنابِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عین جہاد کے موقع پر بھی دشمن کے مقابلہ پر انتہائی تحمل کی شان دکھاتے تھے۔ شب خون نہ مارتے، ضعیف العمر اشخاص، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ دیتے۔ دشمن گرفتار ہو جاتا تو جاہلی عربوں کے قاعدے کے خلاف اس کو عذاب میں نہ ڈالتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے حضرت اسامہ رضؓ کے لشکر کو روانہ کرتے وقت دشمن کے بارہ میں حسب ذیل ہدایات دیں۔

خیانت سے بچنا۔
کسی شخص کے اعضا مت کاٹنا۔
آبادیوں کو نہ اجاڑنا۔
ثمردار درخت نہ گرانا
وعدہ فریبی نہ کرنا۔
بچہ، بڈھے اور عورت پر ہاتھ نہ اٹھانا۔
کھجور کا درخت نہ کاٹنا نہ جلانا۔
مویشیوں کو کھانے کی غرض کے سوا ذبح نہ کرنا۔

تم خانقاہ نشین راہبوں کے پاس سے بھی گذرو گے۔ انہیں اپنے حال پر رہنے دینا۔

تحمّل کی حد

تحمّل قابلِ تحسین وصف ہے لیکن اس کو اس حد تک بڑھنے نہ دیا جائے کہ ضعف، اور بے غیرتی میں بدل جائے۔ تحمّل کی بنا قوت پر ہے، کمزوری پر نہیں۔ یہ بہادر اور غیور لوگوں کا وصف ہے، بزدل اور بے غیرت اشخاص کا نہیں۔

جہاں انسان کی حمیت، عزت اور دین پر حملہ ہو رہا ہو وہاں حتی المقدور برائی کا توڑ کرنا چاہیئے۔ مال و دولت کوئی اتنی بڑی چیز نہیں لیکن ڈاکوؤں کے مقابلہ میں اس کی بھی حفاظت لازم ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔[1] پھر دین تو بہت بلند چیز ہے۔ اس کی عزت کے لئے جان پر کھیل جانا چاہیئے۔

کفر و باطل سے مقابلہ آ پڑے تو مسلمان کو اپنی قوت کا پورا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ کفر اپنی اصل کی رو سے شریر ہے، جب تک اس کا توڑ سختی سے نہ کیا جائے شرارت سے باز نہیں آتا ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن! (اقبال)

ثمرات

(۱) تحمّل مشکل کو آسان کرتا ہے: انسان کے شب و روز اس کے لئے نئی نئی آزمائشیں لاتے ہیں۔ انسان میں تحمّل کا مادہ ہو تو مشکل مشکل نہیں رہتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر مشکل کے دامن میں ایک نئی راحت ہے۔ قرآنِ حکیم نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر فرمایا ہے:

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ پس یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے۔
اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے۔

یہ تحمّل ہی ہے جو زندگی کے بوجھ کو آسان کرتا ہے اور زندگی کی تنگ اور بنجر گھاٹی کو

---

[1] الجامع الصغیر سیوطی "من قتل ..."

بے کنار گلزار میں بدل دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کانٹا چبھتا ہے تو اس میں بھی ایک لذت ہوتی ہے۔ دکھ چھوٹا ہو یا بڑا، تحمل اس میں ایک سرور آمیز کیفیت پیدا کرتا ہے۔

تحمل کے فیض کی انتہا نہیں۔ یہ چشمہ اگرچہ اس دنیا میں پھوٹتا ہے لیکن آخرت کو بھی سیراب کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن فرمایا کیا تمہیں نہ بتاؤں کہ آگ پر کون حرام ہوتا ہے اور کس پر آگ حرام ہوتی ہے؟ ہر متواضع، نرم طبع قرب رکھنے والے اور آسانی کرنے والے پر[1] حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جو آدمی چاہتا ہے کہ قیامت کو اس کی منزل بلند ہو اور اس کے درجات رفیع ہوں وہ اس شخص کو جو اس پر ظلم کرتا ہے معاف کر دے، جو اس سے بخل کرتا ہے۔ اس سے سخاوت کرے جو اس سے تعلق توڑتا ہے۔ اس سے تعلق توڑے اور جو اس سے اجڈ بنتا ہے اسے حلم کرے[2]

۲۔ تحمل سے کام درست رہتے ہیں

عجلت سے جو کام کئے جائیں وہ اکثر بگڑ جاتے ہیں جو کام سوچ سمجھ کر تحمل سے انجام دیئے جائیں وہ مفید اور نفع آور ہوتے ہیں۔ تحمل ہی کے بدولت علمی تحقیقات اور سائنسی ایجادات ظہور پذیر ہو سکتی ہیں کیونکہ بعض دفعہ ایک ایک مسئلہ کے حل کرنے میں کئی برس گزر جاتے ہیں۔

سوالات

۱۔ تحمل سے کیا مراد ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس کا مفہوم واضح کریں۔
۲۔ تحمل کا مفہوم واضح کرنے کے بعد قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔
۳۔ تحمل سے انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیا فوائد و ثمرات حاصل ہوتے ہیں؟

○

---

[1] مشکوٰۃ باب الرفق ... [2] کنز العمال جلد ۲

شُکر

مفہوم : اصل لُغت کی رو سے شکر کے معنی یہ ہیں کہ جانور تھوڑے چارے پر بھی فربہ رہے اور مادہ کا دودھ وافر ہو۔[1] اس بنا پر اس کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ تھوڑی سی بھلائی کا بھی خوب اعتراف کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے حسنِ نیت اور حسنِ عمل کا اعتراف کرتا ہے اور خوب اجر دیتا ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم میں وہ اپنے کو شاکر کہتا ہے اور انسان کی اس کوشش کو جو اس کے ہاں مقبول اور اجر یافتہ ہو سعیِ مشکور کا نام دیتا ہے۔[2]

علامہ علی محمد صدیقی لکھتے ہیں کہ شکر کا مفہوم ہے، کسی کی نعمت کا اعتراف کرنا اور اس کی خدمت کا حق ادا کرنا۔[3]

قرآنِ حکیم میں شکر کے مقابل کفر کا لفظ آیا ہے جس کے لغوی معنی ہیں، ڈھانپنا یا چھپانا۔ اللہ تعالیٰ کے منکر کو اس لئے کافر کہتے ہیں کہ وہ حق پر پردہ ڈالتا ہے۔ کفران بھی شکر کی ضد ہے۔ اس کے معنی ہیں، کسی کے احسان کو چھپانا اور اس کا اقرار یا اعتراف نہ کرنا۔ اُردو میں کفرانِ نعمت کی ترکیب عام رائج ہے۔

شکر کے مراتب :

امام غزالی رح لکھتے ہیں کہ شکر کے تین درجے ہیں جن کا مدار نیّت کے فرق پر ہے، یعنی

(۱) اللہ تعالیٰ کا صرف اس لئے شکر ادا کرنا کہ اس نے کوئی دنیوی یا روحانی نعمت عطا کی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اس کے التفات کا ثبوت سمجھنا اور اس بات پر شکر ادا کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی میرے حال پر توجہ ہے۔ اب مزید فضل کرے گا۔

(۳) اس بات پر شکر گزار ہونا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت نے میرے دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد بڑھا

---

[1] لسان العرب [2] دیکھو سُورۃ بنی اسرائیل (اسراء) ۱۹۔ سُورۃ الانسان ۷۶ - ۲۲

[3] دلیل الفالحین باب المجاھدہ۔

دی ہے۔ میرا دل اس کی طرف اور زیادہ جھک گیا ہے۔ اس نعمت کو جائز کام میں لاکر مجھے اللہ تعالیٰ کا مزید قرب حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔
یہ تشکر کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ اسی کو نصب العین بنانا چاہیئے۔

اہمیّت :

اللہ تعالیٰ کی بے کراں نعمتوں کا اعتراف : اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اس نے انسان کی ہر ضرورت مہیّا کر دی ہے۔[۱] انسان کو موزوں، متناسب اور کارپرداز جسم دیا۔ نکتہ رس دماغ، ظلمت شگاف نگاہ اور گرہ کشا خرد دی۔ معیشت کے سامان زمین پر جمع کر دیئے۔ انسان کے لئے فضا کو مسخر کیا۔ لیل و نہار کا نظام بنایا اور سب سے بڑی نعمت یہ ارزاں فرمائی کہ انسان کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان بھی کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اس کی رحیم و کریم ربوبیت کی ایک منوّر نشانی ہے مگر انہی کے لئے جن کے دل صاحب ایمان ہیں ورنہ جن کے دلوں میں کفر کے اندھیرے راج جما چکے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی کوئی رحمت سجھائی نہیں دیتی۔ یہ لوگ دنیاوی ترقی پر پھول کر فخر و تکبّر کرتے اور بغاوت کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ ضرور نہیں کہ سرکشی کے نتائج فوراً آشکار ہوں۔ بعض صورتوں میں کئی برس لگ جاتے ہیں لیکن اس کا انجام بہر حال تباہی اور ہلاکت ہوتا ہے۔ انسان کو امن و سلامتی کی زندگی بھی نصیب ہو سکتی ہے کہ نیت و ارادہ اور قول و فعل سے اپنے رب کے لئے سراپا تشکر ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو بھی تسلیم کرے کہ شکر گزاری کی توفیق دی۔

قرآن حکیم کی متعدد آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مقصود یہ ہے کہ انسان شکر کا اظہار کرے یعنی اس کی ربوبیت کو مانے، عبادت کرے، ٹھیک راہ پر چلے اور اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے سامانوں کو اس کی منشاء و رضا کے موافق کام میں لائے۔
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (۲ : ۱۵۲)
ترجمہ : اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

---

[۱] دیکھو سورۃ ابراہیم آیت ۳۴ اور سورۃ النحل وغیرھا

قرآن حکیم میں جس مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کی معافی کا ذکر ہے وہاں ارشاد ہے:

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ: پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معاف کر دیا تاکہ تم شکر ادا کرو۔

کتنے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے نیک فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کی بخشی ہوئی متاع کو ڈھنگ سے کام میں لاتے ہیں اور دوسروں کو اس سے بہرہ مند کرتے ہیں؟ قرآن میں اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ تھوڑے بندے شکر کا حق ادا کرتے ہیں[1] مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بے کنار رحمت و ربوبیت کے پیشِ نظر انسان کو ساری زندگی عبادت اور نیک اعمال کے لئے وقف کر دینی چاہیئے۔ لیکن قلیل لوگ اس فرض کو پوری طرح انجام دیتے ہیں۔

شکر کی بنیادی حیثیت

شکر انسانی فطرت کا بنیادی کلمہ ہے۔ آدمؑ کی زبان پر سب سے پہلے الحمد للہ کے الفاظ آئے۔ قرآنِ حکیم کا آغاز بھی الحمد سے ہوتا ہے۔ حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جس میں شکر بھی شامل ہو۔ جب تک سارے اعمال شکر کے مرہون نہ ہوں۔ اس وقت تک عبادت بے معنی رہتی ہے۔ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے۔

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۲۰۲)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

شکر کی دائمی حیثیت

شکر اخلاق کا بنیادی ہی نہیں دائمی عنصر بھی ہے۔ صبر، تحمل، خوش خلقی وغیرہ بعض فضائلِ اخلاق کی اہمیت صرف اس دنیا تک محدود ہے لیکن شکر وہ فضیلت ہے جو آخرت میں بھی مقصود رہے گی۔ جنت کے مکین دنیا کی آلودگیوں اور تفکرات سے آزاد رہیں گے اور اللہ تعالےٰ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس وقت رہ رہ کر اللہ تعالےٰ کی حمد کریں گے اور اُن کی ہر دعا ان الفاظ پر ختم ہوگی[2]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

شکر کی کوئی حد نہیں۔ انسان کو نہ صرف مادی اور روحانی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے،

---

[1] دیکھو سورۃ سبا۔ ۱۳ [2] دیکھو سورۃ یونس۔ آیت۔ ۱۰

بلکہ اس نعمت کے لئے بھی سراپا سپاس ہونا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اسے شکر کی توفیق دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رات کو عبادت میں اس قدر قیام فرماتے کہ آپؐ کے پاؤں (سوج کر) پھٹ جاتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضؓ نے پوچھا کہ آپؐ ایسا کیوں کرتے ہیں جب کہ آپؐ کی زندگی کے لئے اوّل سے آخر تک مغفرت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا میں، اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں[1]؟ مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کی کوئی انتہا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہر حال میں مطلوب ہے

اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر وقت انسان پر سایہ فگن رہتی ہے لیکن بعض لوگ اس کی صحیح قدر نہیں پہچانتے۔ ذرا ذرا سے دکھ پر بے صبر اور تنگ دل ہو جاتے ہیں۔ ادنیٰ پریشانی آئے تو جھلا اٹھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے گلے شکوے شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اپنے سے ادنیٰ لوگوں کے حال پر نظر ڈالیں کو سوچیں تو انہیں رحمتِ ربانی کا فوراً احساس ہو۔ شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے پہننے کو جوتے میسّر نہ تھے اور دل میں شاکی تھا کہ مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑتا ہے۔ اسی دھیان میں چلا جا رہا تھا کہ راستے پر ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے۔ اس پر نظر کر کے میں اپنی بے صبری پر نادم ہوا، اور اللہ تعالےٰ کا شکر بجا لایا کہ اس نے مجھے پاؤں عطا کر رکھے ہیں۔ سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے کہ دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں اللہ تعالےٰ اسے شاکر و صابر شمار کرتا ہے ایک یہ کہ وہ جس شخص کو دین میں اپنے سے فائق تر دیکھے اس کی پیروی کرے اور دوسری یہ کہ جب کسی کو دنیوی حالت میں اپنے سے کم تر دیکھے تو اپنے حال پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے۔[2]

بندوں کا شکر

جس طرح اللہ تعالیٰ کا شکر لازم ہے اسی طرح بندوں کا شکر بھی ضروری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص بندوں کا شکر گزار نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کا شاکر بھی نہیں ہوتا۔[3]

شکر کی شرائط:

(۱) **قناعت و اطمینان**: وہی انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس کر سکتا ہے جو ادنیٰ خواہشوں کا غلام نہ ہو۔ حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اسے ہمیشہ مزید کی طلب رہتی ہے،

---

[1] ریاض الصالحین باب فی المجاھدہ [2] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء [3] دلیل الفالحین ۲، ۳۸ باب فی الحث

بجائے شکر کے وہ اپنی بے نصیبی یا کم بختی کا رونا روتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ مال سرسبز وشیریں ہے۔ جو شخص اسے بے طمعی سے حاصل کرے وہ برکت پاتا ہے اور جو شخص اسے طماعی سے حاصل کرے اس کے لئے اس میں برکت نہیں۔ اس (طماع) شخص کی مثال اس کی سی ہے جو کھاتا جائے اور اس کا جی نہ بھرے[1]

سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تونگری کثرت مال سے نہیں بلکہ تونگری تو دل کی تونگری ہے[2] حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے پوچھا کیا ہم فقرائے مہاجرین میں سے نہیں؟ فرمایا، کیا تمہارے بیوی ہے؟ جواب دیا، ہاں! پوچھا، سکونت کے لئے مکان ہے؟ بولا، ہاں۔ فرمایا، تو پھر تم اغنیاء میں سے ہو۔ اس نے کہا، میرے پاس ایک نوکر بھی ہے۔ فرمایا، پھر تم بادشاہوں میں سے ہو۔[3]

قناعت سب سے بڑی دولت ہے۔ یہ دولت انسان کے اندر شکر کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ طمع انسان کو ہمیشہ بے قرار اور ناشکرا رکھتی ہے۔

(۲) تواضع:

شکر اور تکبر ایک دل میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ متکبر آدمی دوسرے کا احسان ماننے میں کسر شان سمجھتا ہے۔ شکر کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے محسن کی کچھ نہ کچھ فضیلت تسلیم کرے لیکن تکبر اس کو مانع آتا ہے۔

تکبر انسان کے دل پر پردہ ڈال کر حق کی شعاعوں کو روک دیتا ہے۔ مغرور شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنا ذاتی کمال سمجھتا ہے۔

جب تک قناعت کی زمین کو تواضع کے پانی سے نہ سینچا جائے شکر کی فصل پیدا نہیں ہو سکتی۔

شکر کا طریقہ

ادائے شکر کے تین طریقے ہیں:

قلبی، قولی، عملی

(۱) قلبی شکر: (۱) اعتراف و ایمان: قلبی شکر سے مراد یہ ہے کہ انسان کے دل میں اس کے محسن کا حقیقی اعتراف ہو۔ محض دکھاوے کے لئے شکر کا اظہار نہ کرے۔ نہ دل سے

---

[1] ریاض الصالحین باب القناعۃ [2] ایضاً [3] جمع الفوائد کتاب الزھد (۹۰ ۹۵)

اس کا شکر گزار ہو اور اس سے ایک قلبی ربط اور اُنس یا محبت پیدا کرے۔
شکر کا سرچشمہ دل ہے۔ دل میں شکر نہ ہو تو زبانی اقرار محض فریب ہوگا۔
ہر محسن کا شکر لازم ہے لیکن سب سے زیادہ شکر اللہ تعالےٰ کا چاہیئے جس کی نعمتوں اور رحمتوں کی انتہا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف حق کا اعتراف ہے جس کے بغیر ایمان قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اعتراف کا دل میں ہمہ وقت تازہ رہنا ضروری ہے۔ قرآن شریف میں کئی جگہوں پر شکر کا لفظ اسی قلبی اعتراف کے معنی میں آیا ہے۔

انسان اللہ تعالےٰ کی کائنات پر نظر ڈال کر غور کرے کہ اللہ تعالےٰ نے میری خاطر کیا کیا سامان پیدا کئے ہیں تو یقیناً اس کا دل شکر کے جذبات سے چھلک اٹھتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سراپا نیاز ہو جاتا ہے اور اس پر یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ مجھے سب نعمتوں کے لئے صرف اللہ تعالےٰ کا منت کش ہونا چاہیئے۔ اس کی ربوبیت میں کوئی شریک نہیں۔

قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا شکر ہے، اور شرک کرنا عین ناشکری ہے۔

اللہ تعالےٰ قرآن حکیم میں انسان کی توجہ بار بار اپنی قدرت کی نشانیوں کی طرف پھیرتا ہے تاکہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف پیدا ہو۔ یہی قلبی شکر ہے۔ یہ شکر فہم اور سمجھ کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ انسان جس قدر صاحب حکمت ہوگا۔ یہ جذبہ اسی قدر گہرا ہوگا۔ چنانچہ امام غزالی رحؒ نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور احسان کے علم کو شکر کا رکن بتایا ہے قرآن حکیم میں بندوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا۔ جبکہ تمہیں کسی چیز کا علم نہ تھا۔ اس نے تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل بنائے کہ تم شکر ادا کرو (دیکھو سورۃ النحل ۷۸) اس کا ایک بنیادی مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سمع و بصر اور عقل سے کام لے کر یہ علم حاصل کر سکتے ہو کہ اس کائنات میں اللہ تعالےٰ نے تم پر بے حد و کنار احسانات کئے ہیں، لہٰذا اس کا شکر ادا کرو۔

(ب) ذکر و فکر : اعتراف و ایمان کے بعد شکر کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ قلب ذکر و فکر سے غافل نہ ہو اور اس میں نیک جذبات پیدا ہوں۔ یہی قلبی شکر کا کمال ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔

(۲) قولی شکر:

احسان مندی کا زبانی اظہار بھی ضروری ہے۔ بعض خود پرست افراد کی نخوت کے لئے زبانی شکر سنگِ گراں ثابت ہوتا ہے اور وہ اس میں اپنی تذلیل سمجھتے ہیں لیکن شکر کا جذبہ جبھی پنپ سکتا ہے کہ نخوت کے بت کو توڑ دیا جائے دل سے اپنے محسن کا احسان مند ہونا اس قدر مشکل نہیں جتنا اس کا برسرِ عام اعتراف مشکل ہے۔ اس حقیقت سے آگاہ رہنا چاہیئے کہ اگر جان بوجھ کر قولی شکر سے گریز کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قلبی شکر بھی بے کار ہوگا۔

قرآنِ حکیم میں زبانی شکر کی تاکید میں ارشاد ہے:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ٥ اور اپنے رب کی نعمت کا ذکر کر۔

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے: جس نے (بھلا کرنے والے کی) ثناء بیان کی اس نے شکر ادا کیا اور جس نے (اس بھلے کو) چھپایا اس نے کفر کیا۔[۱]

اللہ تعالیٰ کے زبانی شکر کی ایک صورت اس کی حمد بیان کرنا ہے۔ حمد کی بے اندازہ فضیلت ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے:

اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ [۲] (حمد شکر کا سرچشمہ ہے)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ الحمد للہ سے عمل کا ترازو بھر جاتا ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ ارض وسماوات کے خلاء کو لبریز کر دیتے ہیں[۳]

اللہ تعالیٰ کے ہر نام سے اس کی رحمت کا ایک کرشمہ جھلکتا ہے۔ جب اسے اس نام سے یاد کیا جاتا ہے تو اس کی رحمت کا ایک پہلو آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ بھی بیانِ شکر کا ایک طریقہ ہے۔

روزی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ آدمی جب کھانے پر بیٹھے تو بسم اللہ سے شروع کرے اور خاتمہ پر الحمد للہ کہے۔ یہ وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں عینِ نیاز کا وقت ہوتا ہے۔ سچے دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے تو اس میں گہرا اثر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے:

---

[۱] ترمذی ابواب البروالصلۃ۔ آخری سے پہلی حدیث [۲] مشکوٰۃ باب ثواب التسبیح … [۳] اربعین نووی حدیث رقم ۲۳۔

کھانا کھا کر شکر ادا کرنے والے کے لئے ایسا ہی اجر ہے جیسا کہ ثابت قدم روزہ دار کیلئے۔[1]

زندگی میں جب کوئی شاندار کامیابی حاصل ہو یا دشمن پر فتح نصیب ہو تو مسرت کے جوش میں آدمی بارہا اللہ تعالیٰ کو بھول بیٹھتا ہے، اور اس گھمنڈ میں آجاتا ہے کہ یہ کامیابی میری ہی محنت اور لیاقت کا پھل ہے۔ ایسے نازک لمحوں میں اپنے جذبات کو سنبھالنا، متواضع رہنا اور کامیابی کے لئے احسانِ الٰہی کا معترف ہونا خلوصِ ایمان اور عزیمت کی دلیل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فتحِ مکہ کے موقع پر شہر میں داخل ہوئے تو رکاب میں دس ہزار سے زائد فوج تھی۔ لیکن ساری فوج نیاز اور سنجیدگی کی تصویر تھی۔ کوئی بینڈ باجے ہمراہ نہ تھے۔ حضورؐ کا سرِ مبارک انکسار سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا ہوا تھا اور زبان مبارک پر شکر کے کلمات رواں تھے۔

(۳) عملی شکر :

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کی اولاد پر اللہ تعالےٰ نے انعامات کی بارش کر دی تھی۔ ان سے ارشاد ہوا :

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ط (سبا ۳۴-۱۳)

ترجمہ : اے آلِ داؤد شکر گزاری سے کام کرو۔

ربّ العالمین کی شکر گزاری کی عملی صورت یہ ہے کہ انسان اس کی بخشی ہوئی چیزوں کو اسلامی طریقے پر کام میں لائے۔ ان کو برباد نہ کرے اور نہ شیطانی مشاغل میں صرف کرے مثلاً

(اوّل) اپنے بدن کا صحیح استعمال کرے

اللہ تعالےٰ نے ہمیں ایسا بدن عطا فرمایا ہے جو نہ صرف فوائد کے لحاظ سے کامل ہے بلکہ دیکھنے میں بھی خوشنما ہے۔ ہمیں اس بارے میں درج ذیل امور کا خیال رکھنا چاہیئے۔

(ا) بدن کی صحت اور صفائی سے غفلت نہ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس ایک صحابی کافی غیر حاضری کے بعد تشریف لائے ان کا چہرہ لاغر ہو چکا تھا۔ حضورؐ نے پوچھا، تم بہت خوش شکل تھے۔ اب وہ صورت

---

[1] الجامع الصغیر سیوطی "اِنَّ للطائم ..."

کیا ہوئی؟ عرض کیا، جناب روزوں نے یہ حال کیا ہے۔ فرمایا، تم پر اپنی جان کا بھی حق ہے۔ اس کو پوری طرح ادا کرو۔[1]

ایک دفعہ ایک صحابی رضؓ حضورؐ کے پاس پھٹے لباس میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا، کیا تم مال رکھتے ہو؟ عرض کیا، ہاں۔ اللہ تعالےٰ نے مجھے بھیڑ بکریاں اور اونٹ سب کچھ دیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا تو ان کا اظہار کرو۔ مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اپنے لباس وغیرہ میں اظہار کرو۔

(ب) جسم کو نیک کاموں میں اور خدمتِ خلق میں لگایا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر روز جب کہ سورج طلوع ہوتا ہے انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ لازم ہو جاتا ہے۔

مراد یہ کہ ہر عضو سے روزانہ کوئی نہ کوئی نیک کام لینا چاہیئے۔ یہ شکر کی ایک عمدہ صورت ہے۔ مثلاً آنکھ سے قرآنِ حکیم کی تلاوت اور مطالعۂ کائنات کرے، زبان سے حمد اور تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے عبادت، خدمتِ خلق اور جہاد کرے۔ سورۃ البقرۃ کی ایک آیت میں اللہ تعالےٰ نے انسان پر اپنا فضل یاد دلا کر یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ اس سے پیوست اگلی آیت میں ارشاد ہے:

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ — اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

مراد یہ کہ جہاد بھی شکر کی ایک عملی صورت ہے۔

(دوم) مال و دولت کا صحیح مصرف:

ہمارا مال و دولت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کی دست گیری کرنی چاہیئے۔ حدیث میں ہے کہ روزِ قیامت کو اللہ تعالیٰ (کسی انسان سے) فرمائے گا، اے ابنِ آدم! میں بیمار پڑا اور تو نے میری عیادت نہ کی، وہ کہے گا، اے میرے رب! میں تیری عیادت کیسے کروں جب کہ تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالےٰ فرمائے گا، کیا تجھے علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ کیا تجھے علم نہیں کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے ہاں پا لیتا۔ اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے

---

[1] اربعین نووی بحوالہ مسلم حدیث رقم ۲۶۔

مجھے نہ کھلایا۔ وہ کہے گا، اے میرے رب! میں تجھے کیسے کھانا کھلاؤں جب کہ تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالےٰ فرمائے گا، کیا تجھے علم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے اسے نہ کھلایا۔ کیا تجھے علم نہیں کہ تو اسے کھانا کھلاتا تو وہ (کھانا) تجھے میرے پاس ملتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے مجھے نہ پلایا۔ وہ کہے گا، اے میرے رب! تجھے کیسے پانی پلاؤں کہ تو خود ربّ العالمین ہے۔ وہ فرمائے گا، تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا اور تو نے نہ پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلاتا تو وہ (پانی) تجھے میرے ہاں ملتا۔[1]

حدیث میں ایک عبرت آموز قصہ آیا ہے جسے یہاں مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ تین اسرائیلی تھے، ایک کوڑھی، دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا۔ لوگ ان سے گھن کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ کو ان کی آزمائش منظور ہوئی اور ایک فرشتہ بھیجا۔ وہ انسانی صورت میں آیا اور ان پر ہاتھ پھیر کر تینوں کو اچھا کر دیا۔ پھر ان کی خواہش کے بموجب ایک کو حاملہ اونٹنی، ایک کو حاملہ گائے اور ایک کو حاملہ بکری دی۔ ان سے ان کے ریوڑ ہوئے اور اتنے بڑھے کہ وادیوں پر چھا گئے۔ اب یہ فرشتہ پہلی صورت میں پھر نمودار ہوا اور مسکین و بے نوا مسافر بن کر ایک ایک کے پاس گیا۔ انہیں اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلا کر سفر میں امداد کے لئے ایک سے اونٹنی ایک سے گائے اور ایک سے بکری مانگی۔ پہلے دو نے انکار کر دیا اور بگڑ کر بولے کہ یہ مال ہم تک پشت در پشت ورثہ میں پہنچا ہے۔ مگر تیسرے شخص نے اللہ کی عنایت کو یاد کیا اور کہا، تو جو چاہتا ہے لے لے۔ فرشتہ بولا۔ تیرا مال تیرے پاس رہے۔ میں صرف آزمائش کے لئے آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہوا اور تیرے ساتھیوں سے ناراض۔[2]

بندوں کا عملی شکر یہ ہے کہ جس نے بھلائی کی ہو اس کی خدمت اور مدد میں کوتاہی نہ کرے۔

شکر کے مفہوم میں جو عملی عناصر زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کا ذکر آ چکا ہے، مگر حق یہ ہے کہ اس لفظ کی دنیا بہت وسیع ہے اور انسان کے پورے کردار کو دامن میں لئے ہوئے ہے۔ حق پرستی شکر ہے اور باطل پرستی کفران۔ قرآنِ حکیم میں ناشکرے بندوں کو تنبیہ ہے کہ تم بحر و بر کی ظلمتوں میں گھر جاتے، تو اللہ تعالیٰ کو زبان اور دل سے پکارتے ہو اور کہتے ہو کہ اس نے

---

[1] مسلم کتاب البرّ والصلہ، فضل عیادۃ المریض [2] بخاری کتاب الانبیاء، حدیث ابرص و اقرع و اعمیٰ۔ مسلم، کتاب الزھد حدیث الابرص .....

ہمیں بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ان ظلمتوں ہی سے نہیں ہر دکھ سے بچا لیتا ہے تو پھر شرک کرنے لگتے ہو۔ (دیکھو سُوْرَۃُ الانعام۔ آیت ۶۳، ۶۴) ایک اور مقام پر ایسی ہی مثال دے کر فرمایا کہ انسان بڑا ناشکرا ہے (دیکھو سورۃ بنی اسرائیل آیت ۶۷)

ثمرات

شکر کے بے اندازہ فضائل اور ثمرات ہیں۔ ان کا مختصراً تذکرہ درج ذیل ہے:۔

(۱) دنیوی عذاب سے بچاؤ:

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھروں کی بارش ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو اس عذاب سے بچا لیا (سورہ القمر آیت ۳۵) میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرکے ارشاد ہے:

كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ (۵۴ : ۳۵)

ترجمہ: جو ہمارا شکر ادا کرے ہم اس کو اسی طرح اجر دیتے ہیں۔

(۲) دنیوی ترقی

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مومنانہ طریق سے فائدہ اٹھانا شکر ہے جس نے شکر کے اس راز کو پا لیا۔ وہ منزل پہ منزل مارتا چلا جائے گا۔ راہ کی ہر مشکل اس کے آگے آسان ہو جائے گی۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ جن افراد اور اقوام نے دل و دماغ کی قوتوں اور مادی سامانوں سے درست کام لیا۔ انہوں نے ترقی کی حیرت انگیز رفتار دکھائی۔ ان کے قویٰ ہی نئی جلا پا گئے۔ ان کے بدنوں میں ہر لمحہ تازگی آتی گئی اور ان کے ساز و برگ کے انبار بڑھتے ہی گئے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم نے شکر ادا کیا تو تمہیں اور بڑھاؤں گا[1]

(۳) آخرت میں درجات:

شکر گزار بندوں کے آخرت میں بلند درجات ہوں گے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی بندے کا بیٹا مر جائے تو اللہ تعالےٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے، کیا تم نے میرے بندے کے لختِ جگر کی روح قبض کر لی؟ فرشتے اثبات میں جواب دیتے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کیا تم نے اس کے دل کا ثمرہ نوچ لیا؟

---

[1] دیکھو سُوْرَۃُ ابراہیم ۱۴-۷

وہ پھر اثبات میں جواب دیتے ہیں تو ان سے پوچھتا ہے، میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ اس نے تیری حمد بیان کی اور اِنا للہ و انا الیہ راجعون کہا۔ یہ سُن کر اللہ تعالیٰ فرمان دیتا ہے کہ میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔[1]

---

[1] ریاض الصالحین کتاب حمد اللہ تعالیٰ

سوالات

۱۔ شکر سے کیا مراد ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کریں۔
۲۔ شکر کا مفہوم اور اس کی اقسام اور صورتیں بیان کریں۔
۳۔ شکر کے فوائد و ثمرات قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کریں۔

○

عَفْوٌ

مفہوم : اصل لغت کے اعتبار سے عفو کے معنی ہیں :

۱۔ (ا) رہنے دینا ، چھوڑ دینا ۔

(ب) بڑھ جانا زائد ہونا ، بچ جانا ۔ قرآنِ حکیم میں ایک مقام پر عَفْوٌ کا لفظ بچت کے معنی میں آیا ہے۔

۲۔ (ا) مٹ جانا (ب) مٹا دینا ۔

عام استعمال میں عفو کے معنی ہیں کسی کی خطا پر اسے نہ پکڑنا یا چھوڑ دینا۔ اردو میں کہتے ہیں۔ معاف کر دینا۔ یہ مغفرت کے قریب قریب ہے۔

عفو کے مراتب : عفو کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ معاف کرتے وقت طبیعت پر کچھ جبر کرنا پڑے۔ اوسط یہ کہ آدمی دل کی خوشی سے معاف کرے۔ اعلیٰ ترین مرتبہ یہ ہے کہ ممکن ہو تو عفو کے ساتھ احسان بھی کرے۔ نبیِّ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جب ہجرت فرمائی تو اہلِ مکّہ نے مہاجرین کے مکانوں پر قبضہ کر لیا۔ فتحِ مکّہ کے بعد حضورؐ نے یہ مکان انہی کے قبضہ میں رہنے دیئے۔

حضرت حسین رضؓ کا ایک غلام تھا۔ ایک دن وہ آپؓ کے لئے وضو کا پانی لایا۔ آپ وضو سے فارغ ہوئے اور غلام نے سامنے سے کوزہ اٹھایا تو اتفاق سے کوزہ حضرت امام حسین رضؓ کے چہرۂ مبارک سے ٹکرا گیا۔ جس سے آپ کے ایک دانت کو صدمہ پہنچا۔ آپ نے غلام پر نگاہ ڈالی۔ اور اس کے بعد یوں مکالمہ ہوا :

غلام : (اپنی خطا پر گرفت کے خوف سے)

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ (اور غصّہ کو دبانے والے)

حسین رضؓ : میں نے اپنا غصہ فرو کر دیا ۔

غلام : وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط (اور لوگوں کو معاف کرنے والے)

حسین رضؓ : میں نے تجھے معاف کیا ۔

غلام : وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (اور اللہ محسنین کو چاہتا ہے)

حسین رضؓ: جا سکتے ہیں۔ تم فی سبیل اللہ آزاد ہو۔

غلام : اور میری آزادی کا پروانہ ؟

حسین رضؓ: تلوار اور ڈھال دیتا ہوں۔ ان کے سوا مجھے گھر میں کسی چیز کا علم نہیں۔ یہ اعلیٰ ترین عفو ہے۔

اہمیّت :

(۱) عفوؔ صفت الٰہی ہے :

عفوؔ ایک عظیم اخلاقی فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو اس صفت سے متصف بتایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام عَفُوٌّ (بہت معاف کرنے والا) ہے۔ اس کے مترادف غَفّار اور سَتّار کے لفظ ہیں۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ باربار اپنی طرف سے عفو و مغفرت کا اعلان کرتا ہے اور ان لوگوں کو جو اس کی رحمت سے مایوس ہو جائیں کافر گردانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عفو کا اندازہ کرنا انسانی فہم کے بس میں نہیں۔ انسان جب سچے دل سے توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف کر کے اسے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیتا ہے۔ حدیثِ نبویؐ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے اس سوار سے بھی بڑھ کر خوش ہوتا ہے جو دشت میں تھا اور اس کی سواری بھاگ گئی۔ اس پر کھانے پینے کا سامان تھا وہ مایوس ہو کر درخت کے سایہ میں پڑ گیا۔ پھر اچانک کیا دیکھا کہ سواری اس کے پاس کھڑی ہے۔[۱]

(۲) اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرتا ہے جو اس کے بندوں کو معاف کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مغفرت بے حد و بے کنار ہے۔ حدیثِ قدسی ہے کہ اے ابنِ آدم! تو زمین کو اپنی خطاؤں سے بھر کر بھی میرے پاس آئے اور مجھے اس حال میں ملے کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو تو میں زمین کی وسعت کے برابر کی مغفرت کے ساتھ تیری طرف توجہ کروں گا۔[۲] لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعتیں اسی کے لئے ہیں جو اوروں کی خطاؤں اور ایذاؤں سے درگزر کرتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ پیر اور جمعرات کے روز جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور ہر اس شخص کی مغفرت ہو جاتی ہے جو کچھ بھی

---

[۱] ریاض الصالحین باب التوبہ [۲] اربعین نووی حدیث ۔ ۴۲

شرک نہیں کرتا۔ سوائے اس آدمی کے جس کی اپنے مسلمان بھائی سے عداوت ہو، کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کی صلح کا انتظار کرو۔ ان کی صلح کا انتظار کرو۔ [1]

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا ایک خالہ زاد بھائی مسطح نامی تھا۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے اسے یتیمی میں پرورش کیا تھا۔ اس کے بعد بھی اس کی ہمیشہ امداد فرماتے رہے۔ انہوں نے حضرت صدیقہؓ کے دل کو ایک صدمہ پہنچایا جس پر انہوں نے قسم کھائی کہ آئندہ مسطح کو خرچ نہ دوں گا۔ اس پر سورۃ النور کی ایک آیت نازل ہوئی جس میں ہدایت ہے کہ اصحابِ فضل کو چاہیئے کہ اہلِ قرابت اور مساکین و مہاجرین سے درگزر کریں۔ اخیر میں ارشاد ہے۔

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ط (۲۴ : ۲۲)

ترجمہ: کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہاری مغفرت کرے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے یہ آیت سنتے ہی کہا، ہاں میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ میری مغفرت کرے۔ اس کے بعد انہوں نے مسطح کا خرچ اٹھا لیا۔

(۳) عفو ایمان والوں کی صفت ہے

قرآنِ حکیم میں اہلِ ایمان کی ایک صفت یہ ہے:

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ترجمہ: جب غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں۔ ۴۲ : ۳۷

(۴) عفو دوست و دشمن سب کیلئے مطلوب ہے

عفو کا حکم اہلِ اسلام ہی کے درمیان نہیں، غیر مسلموں کے ساتھ بھی حتی الوسع عفو سے کام لینا چاہیئے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ (۴۵ - ۱۴)

ترجمہ: (اے نبیؐ!) ایمان والوں سے کہیئے کہ بخش دیں ان کو (بھی) جو اللہ (کی رحمت کے دور کی آس نہیں رکھتے (یعنی کافر ہیں)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک مقام پر خطاب ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝

ترجمہ: عفو اختیار کریں۔ نیکی کی تلقین کریں اور جاہلوں سے یکسو ہوں۔ (۷ : ۱۹۹)

---

[1] ریاض الصالحین باب النہی عن التباغض .....

زندگی کا یہ سنہری اصول ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کی دلآزاری اور نقصان رسانی سے دل پریشان نہیں کرنا چاہیئے۔ ہر مسلمان نیکی کا مبلغ ہوتا ہے۔ اگر وہ بات بات پر لوگوں سے الجھتا رہے تو کسی شخص کو اپنے پیغام سے متاثر نہیں کر سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبلیغ کے لئے طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے سرداروں نے آپؐ سے گستاخانہ کلام کیا۔ انہوں نے شہر کے اوباشوں کو آپؐ کے خلاف اکسایا۔ وہ بازار کے دونوں طرف بیٹھ گئے۔ جب حضورؐ وہاں سے گزرے تو آپؐ پر پتھر پھینکے۔ بدن مبارک سے خون جاری ہوگیا۔ آپؐ شہر سے باہر تشریف لائے تو جبرئیل امین حاضر ہوئے اور کہا، آپ فرمائیں تو یہ پہاڑ طائف والوں پر گرا دوں۔ آپؐ نے فرمایا، نہیں مجھے توقع ہے کہ ان کی اولاد سے اہلِ ایمان اٹھیں گے۔

مکہ فتح ہوا تو آپؐ نے سب اہلِ شہر کو معاف کر دیا حالانکہ انہوں نے آپؐ پر ستم ڈھانے میں کمی نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے چچا کے قاتل کو بھی معاف کر دیا۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہا جنگی قیدیوں کو بغیر فدیہ کے رہا فرما دیا کرتے تھے۔

حدیث نبویؐ ہے کہ مسلمانوں کا افضل ترین اخلاق عفو ہے۔ ایک اور حدیث ہے کہ اللہ کا کوئی بندہ اس وقت تک صاحبِ فضیلت نہیں ہوتا جب تک کہ تعلق توڑنے والوں سے تعلق نہ جوڑے، ظلم کرنے والے کو معاف نہ کرے اور جس نے اس سے بخل کیا تھا اسے عطا نہ کرے۔[1]

(۵) عفو قاتل کے لئے :

کوئی آدمی کسی کو قتل یا زخمی کر دے یا اسے مارے پیٹے تو قرآنِ حکیم کا یہ حکم ہے کہ اس سے انتقام لیا جائے۔ اسے قصاص کہتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے قصاص کی اس قدر اہمیت جتائی ہے کہ قصاص کو زندگی کا سرچشمہ بتایا ہے لیکن یہاں بھی یہ حکم ہے کہ مجرم کو ماخوذ تو ضرور کیا جائے لیکن مظلوم اسے معاف کرنا چاہے تو حکومت بھی جانے دے۔ معاف کرنے والے اور اس طرح باہمی تعلقات کی اصلاح کرنے والے کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔

---

[1] تفسیر نیشاپوری

(۶) غصہ کا دبانا :

غصہ اور بغض کا دیو انسانیت کو پامال کر دیتا ہے۔ اس کی جلو میں تباہی اور تخریب کے صف بہ صف لشکر آتے ہیں۔ اس دیو کو زنجیروں میں مقید رکھنا چاہیئے۔ قرآن حکیم میں الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ یعنی غصہ دبانے والوں اور اَلْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ یعنی لوگوں کو معاف کرنے والوں کو متقین میں شمار کیا گیا ہے جن کی جزا جنت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی مسلمان کو روا نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین روز سے بڑھ کر تعلق قطع رکھے[1] آپؐ نے ایک بار ایک نبیؑ کی مثال سنائی جس کو اس کی قوم نے زخمی کر کے اس کا خون رواں کر دیا۔ لیکن نبیؑ کا یہ حال تھا کہ ادھر چہرے سے خون پونچھ رہا تھا اور ادھر اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا کہ اے اللہ میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ وہ نادان ہیں۔[2] ایک صحابیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی کہ مجھے نصیحت فرمائیے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، غصہ نہ کیا کر۔ صحابیؓ کو اس نصیحت کی گہرائی کا علم نہ تھا۔ برابر اپنا سوال دہراتے گئے۔ لیکن حضورؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کر۔

غصہ کو آدمی قابو میں نہ رکھے تو حواس کھو بیٹھتا ہے اور بارہا ایسی ناکردنی حرکت کر جاتا ہے جو قانون کی نگاہ میں قابل گرفت یا اخلاق کی نگاہ میں قابل نفرین ہوتی ہے بلکہ بارہا تو بے لگام غصہ ایمان ہی کو ڈبو دیتا ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

غصہ ایمان کو اس طرح بگاڑتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو۔

عفو کی حد

انسان کے اندر دفاع کا قدرتی جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس پر حملہ کیا جائے تو مقابلہ کرتا ہے اور جو اسے نقصان پہنچائے اس سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ یہ جذبہ انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ اس لئے اس کو نابود نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ حکیم میں اس جذبہ کو تصرف میں رکھنے والوں کو الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ کہا گیا ہے۔ یعنی غصہ کو دبانے والے نہ کہ مٹانے والے۔ دفاع کا یہ جذبہ اعتدال کے اندر ہو تو گوناگوں منافع کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے بغیر انسان میں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو بچانے کی لگن کبھی پیدا نہیں ہو سکتی اور مردانہ جذبات اس سے رخصت ہو

---

[1] ریاض الصالحین باب النہی عن التباغض ... الخ [2] ریاض الصالحین باب العفو ... الخ [3] مشکوٰۃ باب الغضب

جاتے ہیں۔ اس کے صحیح استعمال کے لئے درج ذیل نکات کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔

(۱) جذبۂ دفاع کو افراط و تفریط سے بچایا جائے۔ اگر یہ بہت بڑھ جائے تو آدمی پر ہر وقت خود پرستی کا بھوت سوار رہتا ہے۔ وہ مغرور ہو جاتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ بات بات پر بھڑک اٹھتا ہے اور مجنونانہ حرکات کرتا ہے۔ اس جذبہ کو اس قدر گھٹایا بھی نہ جائے کہ انسان بزدل ہو جائے اور مردانگی کا جوہر کھو بیٹھے۔ انفرادی اور قومی خودداری کے لئے اس کا موجود رہنا لازمی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو اعتدال میں رکھا جائے۔

(۲) اس جذبہ کو اعتدال میں رکھ کر اس عمدگی سے بروئے کار لایا جائے کہ اس سے بلند مقاصد حاصل ہوں اور اس کی وجہ سے دیگر انسانوں کے اخلاق پر مفید اثر پڑے۔

عَفْو سے مراد یہ نہیں کہ آدمی کسی وقت انتقام ہی نہ لے۔ بعض حالات میں انتقام نہایت ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی ایسا جرم کر بیٹھے جس کی اللہ تعالیٰ کے قانون میں سزا مقرر ہے یا کسی پر ظلم کرے تو حکومت کو حق نہیں کہ اسے معاف کر دے۔ یہاں عدل کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔

آئے دن کی زندگی میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عَفْو کا بعض طبائع پر الٹا اثر پڑتا ہے۔ وہ انتقام کے مستحق ہوتے ہیں۔ جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک میں یہود کے چند قبیلے مدینہ میں آباد تھے۔ اسلام کے یہ دشمن بڑے کینہ پرور تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں تک ہو سکا ان سے مروّت کا سلوک کیا۔ لیکن جب دیکھا کہ اچھے سلوک پر یہ لوگ الٹا اور دلیر ہو رہے ہیں۔ اور ان کی شرارت پھیلتی ہے تو آپ نے مجبور ہو کر انہیں ایسی سزا دی جس کے وہ مستحق تھے۔

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ عَفْو کی بھی ایک حد ہے، لیکن جہاں تک عَفْو کی حدود کا تعلق ہے حق یہ ہے کہ اس کے کنارے اس قدر وسیع ہیں کہ اسے آسانی سے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ عفو میں یہی خوبی ہے کہ محدود ہوتے ہوئے بھی نہایت وسیع ہے۔ اس کی ساری خوبی اور کشش اس کی وسعت میں ہے۔ یہ ہمیشہ ملحوظ رہے کہ جہاں بھی عَفْو سے کوئی فائدہ ممکن ہو اور دینی یا اخلاقی حدود پر زد نہ پڑے وہاں اس سے کبھی دریغ نہیں ہوتا۔

ثمرات:

(۱) **معاشرہ کی سالمیت:** انسانی معاشرہ اسی صورت میں سالم رہ سکتا ہے کہ افراد

ایک دوسرے سے تعلق نہ توڑیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دوسرے کی خطاؤں اور قصوروں کو دل میں جگہ نہ دیں۔ کون ہے جس سے خطائیں سرزد نہیں ہوتیں۔ اگر ہر شخص دوسرے کی خطا پر دل میں گرہ ڈال لے تو کشیدگی بڑھتی رہے گی اور اصلاح کی صورت نظر نہ آئے گی۔

عفو کے چھینٹے کینہ کی آگ کو بجھا دیتے ہیں۔ معلّم برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ایک دوسرے کو معاف کرو، تمہارے باہمی کینے رفع ہو جائیں گے[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ کوئی بندہ بھی اللہ عزّ وجلّ کے نزدیک اس غصّہ کے گھونٹ سے افضل گھونٹ نہیں پیتا جسے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے دباتا ہے[2]

عفو سے محبّت کی دنیا میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دشمن دوست ہو جاتے ہیں پہلے ان کی یاد اور ملاقات سے رنج و ملال کی تلخی پیدا ہوتی تھی، اب راحت اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ غصّہ کا وبانا زہر کا گھونٹ پینے کے برابر ہے۔ لیکن اس زہر کے گھونٹ کا بعد میں اتنا میٹھا اثر ہوتا ہے کہ عمر بھر اس کی شیرینی کا مزا نہیں جاتا۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ دودھ یا شہد کے ہر گھونٹ سے غصّہ کا گھونٹ بہتر ہوتا ہے[3]

عفو کے بدولت ایثار کا جذبہ قوت مند ہوتا ہے۔ ایثار وہ جذبہ ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی معاشرہ کی صفوں میں ضعف رونما نہیں ہو سکتا۔

(۲) عزم و حوصلہ کی تربیت اور کامرانی

اقوام کی کامرانی اور ظفر مندی کی پہلی شرط عزم و حوصلہ ہے۔ عزم و حوصلہ کا ایک سرچشمہ عفو کی صفت ہے۔ بلکہ عفو، عزم و حوصلہ کا دوسرا نام ہے۔ قدرتی بات ہے کہ جس اخلاقی صفت کو جتنا بروئے کار لایا جائے وہ اتنی ہی قوی ہوتی جاتی ہے۔ عفو سے جس قدر کام لیا جائے فراخ حوصلگی کی اتنی ہی تربیت ہوتی ہے۔

سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہے:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۲:۴۳)

ترجمہ: اور جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو بے شک یہ عزم کے کاموں میں سے ہے۔

عزم و حوصلہ انسانی قوتوں کا ایک بڑا سرچشمہ ہے۔ اس سے استقامت اور شانِ مردانہ

---

[1] کنز العمال جلد ۲۔ باب العفو۔ [2] مشکوٰۃ باب الغضب [3] کنز العمال جلد ۲۔

میں کمال پیدا ہوتا ہے جو انسانی شرف اور اعزاز کا مدار ہے۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ عفو کے عوض بندے کی قوت بڑھاتا ہے[1] ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اے ربّ! تیرے نزدیک غالب ترین بندہ کون ہے؟ جواب ملا، جس نے قدرت پائی تو بخش دیا۔[2]

(۳) تبلیغ اسلام :

اسلام کی تبلیغ میں مسلمانوں کے کردار کو بہت دخل ہے۔ ایک وقت تھا کہ غیر مسلم اقوام اہلِ اسلام کے کردار ہی کو دیکھ کر ان کے دین پر فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ اکثر یوں ہوا کہ مسلمانوں نے جب کوئی ملک فتح کیا تو عفوِ عام کا اعلان کر دیا اور سب کو امان دی۔ غیر مسلم یہ شانِ رحمت دیکھ کر جوق در جوق دین اسلام سے وابستہ ہو گئے۔ انسان کے کردار میں سے کسی صفت کا اتنا گہرا اثر نہیں پڑتا جتنا عفو کا۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی مغفرت

اس موضوع پر کئی آیات اور احادیث گزر چکی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی کو بخشتا ہے جو اوروں کو بخشے۔ سورۃُ المائدۃ (آیت ۔ ۴۵) میں بتایا گیا ہے کہ مظلوم اگر قصاص معاف کر دے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔

سوالات

۱۔ عفو کا مفہوم واضح کیجئے۔ نیز کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی فضیلت و اہمیت بیان کیجئے۔

۲۔ عفو سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

۳۔ عفو سے کیا مراد ہے؟ اس کے فوائد و ثمرات بیان کیجئے۔

---

[1] ریاض الصالحین باب التواضع حدیث رقم (۲) [2] کنز العمال جلد دوم باب العفو۔

عَدْل

مفہوم : عدل کے لغوی معنی ہیں :

سیدھا کرنا ۔ برابر تقسیم کرنا ۔ توازن قائم کرنا ۔

دو چیزوں میں مساوات قائم کرنا ، برابر رکھنا ۔

انصاف کا لفظ بہت حد تک عدل کا ہم معنی ہے ۔ انصاف کے لغوی معنی ہیں : کسی چیز کو دو برابر کے نصف حصّوں میں بانٹنا ۔[1]

حضرت داتا گنج بخشؒ لکھتے ہیں کہ عدل کے معنی ہیں : کسی چیز کو اس کے صحیح موقع و محل میں رکھنا ۔ اس کی ضد ہے ظلم کا لفظ جس کے معنی ہیں (کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کے لائق نہ ہو ۔[2]

امام غزالیؒ کے ہاں بھی یہ معنی ملتے ہیں ۔

عدل کے ساتھ ایک اور لفظ اعتدال ہے جو عدل ہی سے نکلا ہے ۔ اس کے لغوی معنی ہیں ، میانہ روی ۔ یہ عدل کا وسیع تر مفہوم ہے ۔ اس لحاظ سے عدل کے مقابل جور کا لفظ ہوگا جو حد سے نکلنے کے معنی دیتا ہے ۔

احادیث میں بجائے اعتدال کے اقتصاد کا لفظ آیا ہے ۔ قرآن حکیم میں عدل کے لئے قسط کا لفظ بھی ملتا ہے ۔

اہمیّت

۱ ۔ عدل کائنات کی جان ہے :

عدل نظامِ عالم کی جان ہے ۔ یہ وہ اصول ہے جس کے سہارے کائنات کا سارا کارخانہ چل رہا ہے ۔ ہر شے ایک مقرر مقدار میں ہے ۔ کائنات کے سب اجزاء ایک مکمل توازن میں ہیں ۔ اس توازن کو قرآن حکیم میزان کے نام سے بھی یاد کرتا ہے ۔

---

[1] ان معانی کے لئے دیکھئے لسان العرب ، سورۃ الانفطار اور سورۃ الانعام ۔۱

[2] کشف المحجوب ۔

اجزائے عالم کے درمیان ایک پائیدار توازن ہے۔ یہ توازن قائم نہ رہے تو کائنات کا نظام ٹوٹ جائے، مقداروں میں غیر طبعی کمی بیشی ہو، ایک شے دوسری کے دائرہ عمل میں داخل ہونے لگے، چاند سورج کے حلقہ میں آجائے، سورج مریخ کی دنیا میں دخیل ہو اور کائنات کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے مگر اللہ تعالیٰ کی عدل پرور حکمت نے ہر چیز کی مقدار کانٹے کے تول رکھی ہے اور اس کا دائرہ عمل متعین کر دیا ہے۔

انسانی بدن بھی عدل ہی کا مرہون منت ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

يَآيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ (۸۲: ۷، ۸)

ترجمہ: اے انسان کس چیز نے تجھے بھول میں ڈال دیا۔ تیرے رب کریم کے بارے میں جس نے تجھے خلق کیا، پھر تجھ میں ہمواری پیدا کی، پھر تجھ میں عدل (توازن) کا نظام پیدا کیا۔

۲۔ عدل صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے

عدل انسان کو سیدھی راہ پر چلاتا ہے اور افراط و تفریط یعنی کمی بیشی کرنے سے بچاتا ہے۔ اسے عام لغت میں اعتدال کہتے ہیں۔ سُورَةُ النَّحْلِ (آیت۔ ۷۶) سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے بدن کو نیکی میں لگائے رکھنا، بیکار نہ بیٹھنا اور دوسروں پر بوجھ نہ بننا عدل کا عین تقاضا ہے۔ اس سے آدمی صراطِ مستقیم پر قائم رہتا ہے۔

۳۔ قرآن کی تعلیم عدل کی تعلیم ہے

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ط (۶: ۱۱۵)

ترجمہ: اور تیرے رب کا کلمہ صدق اور عدل میں پورا ہے۔

لہٰذا قرآن حکیم پر عمل کرنا عدل ہے اور گناہ کا مرتکب ہونا ظلم۔ قرآن حکیم میں گناہ کو اپنی ذات پر ظلم کرنے کے برابر بتایا گیا ہے۔

۴۔ امتِ مسلمہ وسطی امت ہے

اعتدال اور میانہ روی کی اسلام میں جو اہمیت ہے اس کے اندازہ کے لئے یہی جان لینا کافی ہے کہ اسلام کا ایک نام دینِ اعتدال بھی ہے اور امتِ اسلامیہ کو قرآن حکیم میں اُمَّتِ وَسَطِ یعنی وسطی امت بھی کہا گیا ہے۔

حُدود :

عدل کے بغیر بے شک انسانی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا لیکن بعض معاملات میں احسان کا اصول عدل سے بڑھ کر مفید رہتا ہے۔ قرآنِ حکیم سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر تم پر کوئی ظلم کرے تو بے شک برابر کا بدلہ لو لیکن معاف کر دو تو بہتر ہو گا۔ یہ احسان ہو گا۔ احسان کی اجازت صرف مظلوم کو ہے۔ حاکم عدالت اپنی طرف سے کسی ظالم کو معاف نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت رحمت ہے۔ وہ بے شک عادل ہے لیکن عدل اس کی بڑی صفت نہیں۔ عیسائیت اور اسلام میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت عدل ہے اور مسلمانوں کے نزدیک رحمت۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ اسلام کو دنیا میں جب فاتحانہ عروج حاصل ہوا تو وہ ہر قوم کے لئے رحمت کے سفیر ثابت ہوئے۔

عدل کی شرطیں :

عدل کے لئے درج ذیل شروط کا ہونا ضروری ہے :

۱۔ شرعی حدود کا علم :

جب تک شرعی حدود یعنی حرام و حلال اور جائز و ناجائز کا فرق معلوم نہ ہو عدل کے رستہ پر قائم رہنا مشکل ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دین کے بنیادی احکام سے باخبر رہے۔ اسے علم ہو کہ صراطِ مستقیم کیا ہے تاکہ ادھر ادھر بھٹک نہ سکے۔

۲۔ حرص سے گریز :

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حرص سے بچ کر رہو کہ حرص نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا۔ انہیں اس بات پر اکسایا کہ ایک دوسرے کا خون بہائیں۔ اور جان و مال اور آبرو وغیرہ کو حلال جانیں [1]

۳۔ راست گوئی :

امام غزالی لکھتے ہیں کہ سچ بولنے سے دل میں راستی اور استقامت آتی ہے اور آدمی اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ دروغ گوئی دل میں کجی پیدا کرتی ہے جو انسان کو اعتدال کے رستہ سے دور کر دیتی ہے، اس لئے دل میں جھوٹے خیالات کو جگہ نہیں دینی چاہیئے اور سچ بولنا چاہیئے۔

---

[1] ریاض الصالحین باب تحریم الظلم .... حدیث رقم ۱

۴۔ عدل کا نظام قائم کرنا :

حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ عدل کا نظام قائم کرے یعنی اسلامی قوانین کا نفاذ کرے۔ دیانتدار عدلیہ، انتظامیہ، پولیس اور احتساب وغیرہ کا اہتمام ہو۔

عوام کا بھی فرض ہے کہ معاملات میں نہایت احتیاط برتیں اور ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیں جن میں کسی فریق کو بد دیانتی کی سوجھے مثلاً قرض کا کوئی معاملہ طے کرنا ہو تو قرآنی ہدایت کے مطابق اسے سپرد تحریر کیا جائے اور گواہ قائم کر لئے جائیں۔

عدل کے شعبے

عدل کے دو بڑے شعبے ہیں :

انفرادی اور اجتماعی

ان شعبوں کی حدود کو پہچاننے اور ان کے اندر رہے بغیر عدل کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ جماعتی عدل میں بھی انفرادی عدل ہی کی روح کارفرما ہوتی ہے لیکن علمی لحاظ سے ان شعبوں میں الگ الگ بحث کرنے سے زیادہ وضاحت حاصل ہوگی۔

(۱) انفرادی عدل :

انفرادی عدل کو صرف ایک لفظ اعتدال یا میانہ روی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

کامیابی کا راز اعتدال میں ہے۔ عبادات، روزمرہ کے کام کاج اور کھانے پینے وغیرہ کے باب میں اعتدال پر قائم رہنا ازبس ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی کے کسی شعبہ میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ نہ بدنی صحت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ روحانی ترقی کی صورت نظر آتی ہے۔ انسان الٹا بدنی اور روحانی امراض میں گرفتار ہو کر تنزل کے گڑھے میں آ جاتا ہے۔

زندگی کے سب شعبوں میں اعتدال

زندگی کے بے شمار شعبے ہیں۔ ان میں اعتدال ضروری ہے۔

آدمی کسی ایک شعبہ میں اتنا نہ کھو جائے کہ دیگر شعبوں کی خبر ہی نہ رہے۔ مثلاً طالب علم کا فرض ہے کہ حصولِ علم کے ساتھ ساتھ بدنی صحت کا بھی خیال رکھے۔ نہ پڑھائی میں اس قدر مشغول ہو کہ صحت تباہ کر ڈالے اور نہ صحت کا اس قدر فریفتہ ہو کہ سارا وقت کھیل کود میں ضائع کر دے۔

اسلام بدنی اور روحانی اعمال میں پورے اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ عبادات اور دنیاوی معاملات کے درمیان توازن کے بغیر چارہ نہیں۔ اسلام نہ یہ اجازت دیتا ہے کہ دنیا کے کام کاج چھوڑ کر محوِ عبادت رہو اور نہ اس بات کو حلال قرار دیتا ہے کہ دُنیا کی مصروفیتوں میں کھو کر اپنے ربّ سے بے خبر ہو جاؤ۔ اسلام میں رہبانیت بھی ناروا ہے اور قارونیت بھی حرام۔ رہبانیت یہ ہے کہ آدمی دُنیا کو ترک کر دے اور ریاضت اور نفس کشی کو مایۂ زندگی بنالے۔ قارونیت یہ ہے کہ آدمی صرف مادی ترقی ہی کو انسانی ترقی کی معراج سمجھ لے۔ انسان مادہ اور روح کے درمیان اعتدال کا رشتہ قائم کرلے تو نہ رہبانیت باقی رہتی ہے۔ نہ قارونیت۔ بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بھی قائم رہتا ہے اور بندوں سے بھی۔

طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہ اٹھانا۔

دنیاوی کاروبار ہو یا عبادات، حد سے زیادہ بوجھ اٹھانا خود کو ہلاک کرنا ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

عَلَيْكُمْ بِمَا تُطِيقُونَ [1] یعنی صرف طاقت بھر بوجھ اٹھاؤ۔

جو لوگ شب و روز عبادت میں مصروف رہ کر ہڈیاں سُکھا لیتے ہیں وہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے انحراف کرتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عبادت کے اعتدال کو سنت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ بے جا سختی اختیار کرنے والے ہلاک ہوتے ہیں۔ [2]

جذبات و میلانات میں اعتدال

جذبات اور میلانات کو اعتدال میں رکھے بغیر اخلاقی فضیلت پیدا نہیں ہو سکتی اور آدمی بدلتے ہوئے حالات میں خود کو سنبھالنے سے قاصر رہتا ہے۔ دولت کی بہار آئے تو عشرت میں گم ہو جاتا ہے، ناداری کی خزاں میں در بدر ہاتھ پھیلا کر رسوا ہوتا ہے۔ کمزور پر رعب گانٹھتا ہے۔ اور طاقتور کے آگے گردن جھکا دیتا ہے۔ زندگی میں اس کا موقف ہوتا ہے نہ مقام۔ ہوا کا ہر تیز جھونکا اسے اڑائے جاتا ہے۔ جو فیشن پسند آیا اسے اپنا لیا اور جس قوم کی معیشت میں کچھ آب و تاب دیکھی۔ اس کی تہذیب بلکہ بد تہذیبی پر بھی لٹو ہو گئے۔ یہ تمام بے راہی اور گمراہی

---

[1] ریاض الصالحین باب الاقتصاد فی العبادۃ حدیث رقم۔ ۱ [2] ایضاً۔ حدیث رقم۔ ۳

اعتدال سے دست بردار ہونے کا نتیجہ ہے۔

اخلاقی فضائل کی روح اعتدال ہے :

اخلاق کا کوئی شعبہ بھی ہو اعتدال ہی پر پختہ رہنے سے اس میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً

(ا) گزران کے معاملہ میں نہ بخیلی کی اجازت ہے، نہ عیاشی اور فضول خرچی کی۔ بلکہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان رہنا ہے۔ اسی کو سخاوت کہتے ہیں۔ سورۃ الفرقان (آیت ۔ ۶۷) میں بندگانِ رحمٰن کا ایک وصف یہ بتایا گیا ہے کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول نہیں اڑاتے، نہ تنگی کرتے ہیں۔ اس کے درمیان ان کی سیدھی گزران ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :

اَلْاِقْتِصَادُ فِی النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِیْشَةِ [1]

ترجمہ : (خرچ میں اعتدال رکھنا آدھی گزران ہے)

مراد یہ کہ :

جس نے اعتدال سے خرچ کیا اس نے آدھی زندگی کی کامیابی ساتھ ہی پالی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے رب کی بارگاہ میں دعا کیا کرتے تھے کہ مجھے فقر و غنا دونوں حالتوں میں اعتدال عطا فرما۔ [2]

(ب) دشمن سے مقابلہ آ پڑے تو نہ بزدلی دکھانے کی اجازت ہے نہ جان کو عمداً ہلاکت میں ڈالنے کی۔ بلکہ ان انتہاؤں کے درمیان رہنا چاہیئے۔ اسے شجاعت کہتے ہیں۔

(ج) تکبّر حرام ہے لیکن اس بات کی اجازت بھی نہیں کہ آدمی خود کو ذلیل کر دے۔ تکبّر اور ذلّت کے درمیانہ درجہ کا نام حِلم ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عمر رضؓ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر فدا کر دے۔ جواب ملا، کہ پھر تو اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کرے گا۔

(د) کھانے پینے کے باب میں اسلام کی واضح ہدایات ہیں کہ اعتدال کے اندر رہو۔ یہی صحت کا راز ہے۔ پرخوری کو حدیث میں کافروں کی علامت بتایا گیا ہے لیکن حد سے بڑھ کر کم خوری بھی ممنوع ہے۔ لہٰذا سوائے رمضان کے اور بعض دیگر خاص خاص صورتوں کے مسلسل روزے رکھنا منع ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ باب الحذور الثانی   [2] مشکوٰۃ باب جامع الدعا

لباس کے باب میں یہ وتیرہ رہے کہ نہ گراں قیمت ہو نہ مقدور کے باوصف گھٹیا۔

(۲) جامعی عدل :

عدل کو ہم درج ذیل پانچ انواع میں تقسیم کریں گے۔

(۱) کلمۂ عدل

(۲) کسی پر زیادتی نہ کرنا

(۳) حفظِ مراتب

(۴) ادائے حق

(۵) عدالتی انصاف

ذیل میں ان عنوانوں کا ہم تفصیلی جائزہ لیں گے :

(۱) کلمۂ عدل : یعنی حق بات کہنا۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے :

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى

ترجمہ : اور جب بات کرو تو عدل سے بات کرو چاہے (کوئی) قرابت دار ہو۔

مراد یہ کہ بے شک تمہارے کسی قریبی رشتہ دار کو نقصان پہنچ جائے۔ ہمیشہ عدل کی بات کہو۔ عدل کی بات سے مراد یہاں کلمۂ حق ہے۔ مثلاً اگر کسی رشتہ دار کا کسی سے مقابلہ یا جھگڑا ہو اور اس بارے میں کہیں گفتگو آپڑے تو بے لاگ رائے کا اظہار کرو۔

کلمۂ حق ادا کرنے کے لئے اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے۔ اربابِ اختیار کو بعض دفعہ کلمۂ حق پر طیش آجاتا ہے اور خوفناک سزائیں دینے پر اُتر آتے ہیں۔ امام مالکؒ کو کلمۂ عدل کہنے کی پاداش میں کوڑے کھانے پڑے۔ ایسا ہی دور امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ پر بھی گزرا۔ لیکن دنیا کی کوئی مصیبت انہیں کلمۂ عدل کہنے سے نہ روک سکی۔

یزید کے دربار میں جب اہلِ بیتِ کرامؓ کے سر پیش ہوئے تو ساتھ ہی اسیرانِ سادات کا مظلوم اور بے سہارا قافلہ بھی تھا۔ ان میں حضرت حسین علیہ السلام کی ہمشیرہ مکرمہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ یزید نے برسرِ دربار حضرت حسین رضؓ کے خلاف گستاخانہ فقرے کہے۔ اس وقت حضرت زینبؓ کا سہارا سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کوئی نہ تھا۔ ہر طرف موت کے پہرے تھے۔ تاہم آپ نے نہایت بے خوفی سے یزید کو منہ توڑ جواب دیا اور کلمۂ عدل کہہ کر رہیں۔

آپؐ نے اپنے نانا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی منہ بولتی تصویر پیش کردی۔

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ [1]

(ظالم سلطان کے آگے کلمۂ عدل کہنا افضل جہاد ہے)

آئے دن کے معاملات میں جب ہم کسی کے بارے میں رائے کا اظہار کرتے ہیں تو اکثر یوں ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ ہمارے تعلقات اچھے ہوں اسے اچھا کہتے ہیں اور جس سے ناراض ہوں اسے برا کہتے ہیں۔ عدل کا تقاضا ہے کہ ہماری زبان تعلقات کی اسیر نہ ہو۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو تین نجات دینے والی چیزوں میں شمار فرمایا ہے کہ آدمی رضا اور ناراضی دونوں حالتوں میں حق بات کہے۔ [2]

۲۔ کسی پر زیادتی نہ کرنا:

بعض لوگ اپنے حقوق کے لئے بہت شور مچاتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے حقوق پامال کرنے میں باک نہیں کرتے۔ انہیں عدل کی راہ اختیار کرنی چاہیئے اور اپنی طرح دوسروں کے حقوق کو بھی عزیز جاننا چاہیئے۔ اپنے فائدہ کی خاطر دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالنا ظلم ہے۔

عدل کا تقاضا ہے کہ کسی کی عزت پر حملہ نہ کیا جائے۔ نہ پرایا مال لوٹا جائے۔ غیبت سے پرہیز اور حسد سے گریز کیا جائے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ ان کی فہرست بہت طویل ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ظلم کے باب میں پورا پورا انصاف کرے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز، روزہ اور زکوٰۃ (کا سرمایہ) لائے گا۔ اور اس نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان باندھا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو پیٹا ہوگا۔ ہر مظلوم کو اس کی نیکیوں سے کچھ دلوایا جائے گا اور اگر آخری فیصلہ سے پہلے اس کے پاس کوئی نیکی باقی نہ رہے گی تو ایک ایک مظلوم کے گناہ اس پر ڈالے جائیں گے۔ پھر وہ دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ [3]

بعض لوگ دوسروں سے قرض لے کر ہضم کر جاتے ہیں۔ یہ بھی ظلم ہے جو معاف نہ ہوگا۔ حدیث ہے کہ شہید کا ہر گناہ معاف کر دیا جائے گا، سوائے قرض کے۔ [4]

۳۔ حفظِ مراتب:

سابقہ صفحات میں ہم حضرت داتا گنج بخش رح اور امام غزالی رح کے

---

[1] ترمذی۔ ابواب الفتن
[2] مشکوٰۃ باب الغضب
[3] ریاض الصالحین باب تحریم الظلم حدیث رقم۔ ۱۶
[4] الجامع الصغیر سیوطی (یُغْفَرُ .....)

حوالہ سے دیکھ آئے ہیں کہ عدل کے معنی ہیں، ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا۔ اس معنی کی رو سے حفظِ مراتب عدل کا ایک ضروری شعبہ ٹھہرتا ہے۔

حفظِ مراتب کے معنی ہیں، مراتب کا لحاظ رکھنا، یعنی :

اہل و نااہل کا فرق ملحوظ رکھنا

اہل شخص کے رتبہ کا اعتراف اور احترام کرنا

اس کا مقام چھیننے کی سعی نہ کرنا اور

استحقاق کے بغیر بلند مراتب کا حریص نہ ہونا

اہل و نااہل کی تمیز نہ رہے تو انسانی برادری کا نظام زیر و زبر ہو جائے۔ قیامت کے قریب معاشرہ اور حکومت میں ابتری رونما ہو جائے گی۔ اس کی ایک وجہ احادیث میں یہ آئی ہے کہ اہل و نااہل کا فرق ملحوظ نہ رہے گا اور لئیمُ ابن لئیمُ قوم کا سردار ہو گا۔

حفظِ مراتب کے بغیر امن و عافیت کی بنیاد مٹ جاتی ہے اور انصاف کا خون ہو جاتا ہے۔ سُورۃ القصص ۲۸ کی ایک آیت سے یہ مفہوم ملتا ہے کہ آخرت کا گھران کے لئے ہو گا۔ جو اونچی سرکار اور فساد کے خواہش مند نہیں (دیکھو آیت ۔ ۸۳)

عمر کا فرق :

معاشرہ کے جو افراد عمر کے لحاظ سے بزرگانہ حیثیت رکھتے ہیں ان کی تعظیم چاہیئے اور جو عمر میں چھوٹے ہوں ان پر شفقت کی نظر ڈالنی چاہیئے۔ اگر کم سنوں کی کم سنی کا خیال نہ رکھا جائے اور ان سے محبت اور شفقت کا سلوک نہ کیا جائے تو ان کے ذہن پر برا اثر پڑتا ہے۔ یہ توقع رکھنا کہ وہ ہر بات میں بزرگوں کی سی ذمہ داری کا ثبوت دیں ان پر زیادتی ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں جس نے ہم میں سے کم سن پر رحم نہ کیا اور ہم میں سے بڑی عمر والے کی توقیر نہ کی [1]

معاشی فرق :

حفظِ مراتب کے سلسلہ میں مساوات کا سوال اٹھتا ہے۔ بعض لوگ مساوات کے جوش میں ہر ایک کو مساوی سطح پر رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ قانونِ قدرت کی خلاف ورزی ہو گی۔

---

[1] جمع الفوائد۔ حدیث ۸۴۳۷

معاشی اور معاشرتی مساوات میں فرق کرنا چاہیئے۔

معاشرتی مساوات یعنی احترامِ آدمیت کے باب میں سب برابر کے حق دار ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کسی کے حق میں ادب کا پہلو غالب ہے اور کسی کے حق میں شفقت کا لیکن معاشی مساوات میں اس قسم کی برابری ناممکن ہے۔ معاشی مساوات یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے کام اور ترقی کے برابر مواقع مہیّا ہوں۔ یہ نہیں کہ امراء کے بیٹوں کو تو بلند عہدوں سے نوازا جائے اور غریبوں کو اہلیت کے باوجود نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ ظلم ہوگا۔ جو آدمی اپنی ہمّت اور قابلیت کے سہارے بلند مقام پیدا کرتا ہے اس کے مرتبہ کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جو آدمی نہ اہلیت رکھتا ہو، نہ خدمت کا جذبہ اور پھر بھی اسے آگے بڑھایا جائے۔

اعتقادات اور حفظِ مراتب

اعتقاد کو اعتدال سے الگ کر دیا جائے تو غُلُوّ پیدا ہوتا ہے۔ غُلُوّ کے معنی ہیں، حد سے نکل جانا۔

اعتقادی غُلُوّ نے کتنی ہی ملتوں کو بگاڑا ہے۔ مثلاً کسی نے نبی کو خدا کا درجہ دیا اور کسی نے نیک بندوں کو معبود بنا دیا۔ یہ مراتب سے بے خبری کا نتیجہ تھا۔ اسلام کی تعلیمات اس قدر روشن ہیں کہ غُلُوّ کی تاریکی ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔

۴۔ ادائے حق : یعنی کسی کا پورا پورا حق ادا کرنا۔

ہر انسان پر متعدد حقوق عائد ہوتے ہیں جن کو اچھی طرح ادا کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ حق عائد ہے کہ ہم توحید کا اقرار کریں اور اسے وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ مانیں۔ توحید عین عدل ہے اور شرک ظلم ہے۔ شرک سے مراد ہے: اللہ تعالیٰ کا حق کسی اور کو دینا۔ اگر بجائے ربّ کے کسی اور کے آگے سر جھکا دیا جائے تو اس سے زیادہ کیا بے انصافی ہوگی۔

ارشاد ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (۳۱-۱۳)

(یقیناً شریک ایک بڑی بے انصافی ہے۔)

اللہ تعالیٰ کے بعد نبیِّ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا حق ہے۔ آپؐ کے حقوق کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر حضورؐ سے محبّت ہو۔ آپ کے بعد والدین اور

دیگر لوگوں کے حقوق آتے ہیں۔ ان کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

ادائے حق کے سلسلہ میں قرض کی واپسی اور صحیح ماپ تول کا ذکر خصوصیت سے ضروری ہے۔

حسنِ قضاء :

حالات جس وقت اجازت دیں قرض فوراً ادا کیا جائے۔ غنی شخص کا قرض کو ٹالے رکھنا ظلم ہے۔ قرض ادا کیا جائے تو خوشی اور فراخدلی سے۔ طبیعت پر کوئی بوجھ نہ ہو، اس انداز سے کیا جائے کہ قرض خواہ کو ملال نہ ہو۔ اسے حسنِ قضا کہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بدّو سے جو غالباً غیر مسلم تھا۔ ایک اونٹ اُدھار لیا۔ بدّو اونٹ طلب کرنے آیا اور جیسا کہ قبل اسلام کے عرب قرض خواہوں کی عادت تھی۔ سخت الفاظ میں تقاضا کیا۔ صحابہ کرامؓ نے چاہا کہ اُسے سزا دیں۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ اسے کچھ نہ کہو۔ حق دار کو بولنے کا حق ہے۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ اسے ایک اونٹ خرید دو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ (اس وقت تو) اس سے افضل عمر کا اونٹ ملتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، اسے وہی خرید کر دے دو۔ تم میں بہترین آدمی وہ ہے جو قرض ادا کرنے میں بہترین ہے۔[1]

مدینہ کے ایک شخص نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کھجور کا ایک پیمانہ قرض دیا تھا۔ وہ مانگنے آیا۔ آپؐ نے ایک انصاری سے فرمایا کہ ادا کر دے۔ انصاری نے جو کھجور دینا چاہا۔ وہ قرض کی کھجور سے ادنیٰ تھی۔ قرض خواہ نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ انصاری نے کہا، کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دی ہوئی چیز واپس کرتا ہے؟ جواب دیا، ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر عدل کا سزاوار کون ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فرمایا، سچ کہا۔ مجھ سے بڑھ کر عدل کا سزاوار کون ہے؟ آپؐ نے اس کے حسب طلب کھجور دلائی۔[2]

ماپ تول کی درستی :

عدل اور صحیح ماپ تول میں چولی دامن کا تعلق ہے۔

سُورۃ الرحمٰن ۵۵ میں ارشاد ہے :

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا — اور اس نے آسمان کو بلند کیا

---

[1] بخاری کتاب فی الاستقراض ..... معہ حاشیہ — [2] الترغیب والترھیب - کتاب البیوع -

وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ	اور میزان قائم کی
اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝	تاکہ تول میں حد شکنی نہ کرو
وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ	اور وزن قائم کرو انصاف سے
وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝	اور میزان میں کمی نہ کرو۔

تجارت معاش کا ستون ہے۔ اس کے بغیر معاش کی عمارت زمین بوس ہو جائے اور قوم میں جینے کی سکت نہ رہے۔ قرآنِ حکیم میں ایک ایسی قوم کا ذکر آیا ہے جو ماپ تول میں فریب کرنے کی وجہ سے تباہ ہو گئی۔

۵۔ عدالتی انصاف:

اردو زبان میں عدل کے معنی عموماً عدالتی انصاف لئے جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم اور حدیث شریف میں بھی عدل کا لفظ ان معنی میں بارہا آیا ہے۔ اس پر قرآنِ حکیم نے اس قدر تاکید کی ہے کہ ایک جگہ حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں کسی قوم سے دشمنی بھی ہو تو یہ دشمنی تمہیں بے انصافی پر نہ اکسائے، عدل کرو۔[1]

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی انصاف پروری کا یہ عالم تھا کہ دین کے دشمن بھی بالخصوص یہود اپنے قضیے آپؐ کے پاس کبھی تو محض امتحاناً اور کبھی صحیح فیصلہ کے لئے لاتے تھے۔ چونکہ بعض اوقات ان کی غرض صرف یہ ہوتی تھی کہ آپؐ سے اپنی مرضی کے فیصلے حاصل کریں۔ اور (نعوذ باللہ) کسی طرح آپؐ کو راہِ حق سے ڈگمگا کر آپؐ کی شہرت کو زک پہنچائیں، اس لئے قرآنِ حکیم میں آپؐ کو اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو ان کے مقدمات فیصل کریں اور چاہیں تو انکار فرما دیں۔ لیکن جب فیصلہ کرنا ہی ہو تو انصاف کریں۔[2]

عدالتی فیصلوں کے بارہ میں جناب شارعِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ تنبیہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تم میرے پاس اپنے مقدمے لاتے ہو۔ شاید تم میں سے ایک فریق دوسرے کے مقابل حجت بیان کرنے میں زیادہ اچھا بولے اور میں اس سے جو سنوں اس کے موافق فیصلہ دے دوں تو (ایسی صورت میں) میں جس کے لئے اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ فیصلہ دوں تو وہ کچھ نہ لے کیونکہ (ایسے میں) میں اُسے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دیتا ہوں۔[3]

---

[1] دیکھو سُورَۃُ المَائِدَۃِ - ۸
[2] دیکھو سُورَۃُ المَائِدَۃِ - ۴۲
[3] ابو داؤد، کتاب الاقضیہ۔

اسلامی عدل کی نگاہ میں رنگ و نسل، قبیلہ و خاندان، آزاد و غلام، مرد و عورت، اور امیر و غریب کی کوئی تفریق نہیں۔ قریش کے ایک معزز خاندان کی ایک عورت نے چوری کا ارتکاب کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے آپؐ کے پاس آپؐ کے چہیتے غلام حضرت زیدؓ کے بیٹے جناب اُسامہؓ کو سفارش کے لئے بھیجا۔ آپؐ کو حضرتِ اسامہؓ سے بڑی محبت تھی۔ مگر یہ سفارش سن کر فرمایا، کیا تم حدود اللہ میں سفارش کرتے ہو؟ اس کے بعد آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں کو اس چیز نے ہلاک کر دیا کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے تھے۔ اللہ کی قسم! اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ [1]

بدر کی جنگ ہوئی تو دشمن قیدیوں میں حضرت عباسؓ بھی تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے۔ مدینہ میں ان کا ننھیال تھا۔ بعض انصارؓ نے عرض کیا، اجازت ہو تو اپنے بھانجے عباسؓ کا فدیہ چھوڑ دیں۔ آپؐ نے فرمایا، ایک درہم بھی کم نہ لو۔ [2]

یہودِ خیبر مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بدعہدی کر کے کئی جنگیں لڑ چکے تھے۔ بالآخر ہار کر اسلامی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ کو انہوں نے شہید کر دیا۔ عینی گواہ میسر نہ تھے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت المال سے خون بہا کی رقم ادا کر دی اور یہود کو رہنے دیا۔ [3]

ثمرات:

۱- بربادی سے نجات

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ میانہ روی ہی عدل ہے۔ میانہ روی انسان کو مادی اور روحانی ہر دو لحاظ سے محفوظ رکھتی ہے۔ نیز گمراہی اور ہلاکت سے بچاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجات دینے والی تین چیزوں میں ایک چیز فقر و غنا ہر دو حالت میں میانہ روی بتائی ہے۔ [4]

۲- امن و امان: دنیا میں انصاف قائم رہے تو امن و امان اور اتحاد بھی قائم رہے گا۔ قوم

---

[1] الترغیب والترھیب جلد ۳، کتاب الحدود [2] صحیح بخاری [3] صحیح بخاری
[4] مشکوٰۃ باب الغضب الفصل الثالث۔

تعمیری کاموں کی طرف متوجہ رہے گی اور بامِ عروج تک جا پہنچے گی۔

۳۔ آخرت میں سرفرازی:

عدل کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بے پایاں اجر ہے، جیساکہ درج ذیل حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے:

(۱) وہ لوگ جو اپنے گھر والوں میں یا ان میں جن کی حکومت انہیں سپرد کی گئی ہے۔ انصاف کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر ہوں گے۔[۱]

(۲) قیامت کے دن امامِ عادل اللہ تعالیٰ کا سایہ ہوگا۔[۲]

سوالات

۱۔ عدل کا مفہوم واضح کیجئے۔ نیز قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

۲۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عدل کی مختلف صورتوں کو بیان کیجئے۔

۳۔ اسلامی معاشرے میں عدل کی اہمیت کو قرآن و حدیث کے حوالے سے بیان کیجئے۔

۴۔ عدل سے کیا مراد ہے؟ معاشرے میں اس کی ضرورت و اہمیت بیان کیجئے۔

---

[۱] ریاض الصالحین باب الوالی العادل [۲] ریاض الصالحین۔

اِحسان

مفہوم : احسان کا مادّہ حُسن ہے۔ احسان اپنے وسیع معنی میں عمل کی خوبی اور رعنائی کا نام ہے۔ احسان وہ عمل ہے جو اللہ تعالےٰ اور اس کے نیک بندوں کو بھا جائے۔ اردو میں احسان کے لئے حُسنِ عمل کا نام آتا ہے۔

احسان کے کام کے لئے قرآنِ حکیم میں حَسَنَہ کا لفظ ہے۔ جس کے معنی اردو میں بھلائی بتائے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو گہرائی اور نکھار حَسَنَہ میں ہے وہ بھلائی کے لفظ میں نہیں۔ اس کا ہم معنی کوئی لفظ ہو سکتا ہے تو خَیر (جمع خیرات) ہے جس کے لغوی معنی ہیں بہترین۔

اسلام کا جہاں یہ حکم ہے کہ جس قدر زیادہ نیکی ہو سکے کمائی جائے۔ وہاں ساتھ یہ بھی ہدایت ہے کہ ہر نیکی خوب سے خوب تر طریقے پر انجام دینی چاہیئے۔ شارعِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ تو اپنے ہر عمل کے بارے میں یہ سمجھ کہ آخری عمل ہے۔ مدعا یہ کہ اس کی تکمیل اس طور سے کر کہ اس کی پسندیدگی میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ ممکن ہے یہی ایک عمل جنّت میں پہنچا دے۔

احسان کی دو قسمیں ہیں، ایک عبادات کے اور دوسری بندوں سے حُسنِ سلوک کے نقطۂ نگاہ سے ان کی مختصر توضیح درجِ ذیل ہے :

(پہلی قسم)

عبادت میں احسان

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری طرف سے جو تحفہ پہنچتا ہے وہ ہماری نیت اور اعمال ہیں۔ دنیا میں جب کوئی شخص کسی کو تحفہ پیش کرتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خوش نما اور دل پسند ہو۔ کسی بڑے حاکم کو تحفہ دینا ہو تو ایسی چیز پیش کرنے کی سعی کی جاتی ہے کہ حاکم کا جی اسے دیکھتے ہی کھل جائے۔ ظاہر ہے جو ہدیہ ہمیں ربُّ العالمین کے دربار میں حاضر کرنا ہے۔ وہ بھی انتہائی درجہ کا جمیل اور دل پذیر ہو۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ یہ ہدیہ احسان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے :

احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اُسے دیکھتا ہے اور اگر

تو اسے نہ دیکھ سکا تو وہ تجھے دیکھتا ہے [1]

انسان کو اللہ تعالیٰ سے جس قدر گہری محبت ہو گی اس کا اسی قدر گہرا دھیان رہے گا۔ اللہ تعالیٰ دل کی آنکھ سے نظر آنے لگے گا۔ نتیجہ یہ کہ انسان اس کی عبادت کو نہایت دل بستگی اور خضوع و خشوع سے اس کی عظمت و جلال کا تصور باندھ کر ادا کرے گا۔ اس عبادت میں انتہاء کا حسن اور رعنائی ہو گی۔

یوں تو ہر عبادت کا بڑا درجہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے رات کی عبادت کو خصوصیت سے احسان میں شمار کیا ہے۔ (دیکھو الذّاریٰت - ۱۷) اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کو اٹھ کر وہی شخص عبادت کرتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبّت کی حقیقی تڑپ ہو۔

(دوسری قسم)

بندوں سے سلوک میں احسان : اس سے مراد ہے :

ہر انسان کے ساتھ نیکی سے پیش آنا

اور دوسرے شخص کی بھلائی کا اس سے بڑھ کر بدلہ دینا۔

عدل برابر کے تول کا تقاضا کرتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ہر چیز کا مساوی اجر دو۔ بعض جگہ عدل ناگزیر ہوتا ہے۔ لیکن بارہا اس سے بھی آگے نکل کر احسان کی منزل میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل بھی ہے اور محسن بھی۔ اس کا عدل یہ ہے کہ آدمی بدی کا ارتکاب کرے تو اس کے اعمال نامہ میں ایک بدی لکھی جاتی ہے لیکن اس کا احسان یہ ہے کہ انسان نیکی کی فقط نیت بھی کرے تو ایک نیکی اس کے حساب میں درج ہو جاتی ہے اور اگر اس پر عمل کر دکھائے تو دس سے لے کر سات سو نیکیاں اس کے حساب میں جمع ہو جاتی ہیں [2]

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اگر کسی کو بدی کی سزا دینا پڑے تو یہ سزا زیادہ سے زیادہ برابر کا بدلہ ہو، یہ عدل ہے مگر اس سے بھی بلند تر چیز یہ ہے کہ ممکن ہو تو مظلوم، ظالم کو معاف کر دے۔ الغرض حسنِ معاملات کی ترکیب عدل اور احسان کے حسین امتزاج سے قائم ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے : اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶ : ۹۰)

ترجمہ : یقیناً اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

---

[1] کتاب الاربعین نووی - حدیث - ۲ [2] مسلم کتاب الایمان

یہاں اللہ تعالیٰ نے عدل اور احسان کا یکجا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ ان کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔
احسان کی اس دوسری نوع کے ایک تو عمومی معنی ہیں جو اوپر درج ہو چکے ہیں۔ لیکن قرآنِ حکیم کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کچھ خصوصی مفہوم بھی ہیں جو عمومی مفہوم کے لئے ارکان کا کام دیتے ہیں۔ یہ خصوصی مفہوم درج ذیل ہیں:

عفو و درگزر : مالی ایثار : جہاد

مراتب :

احسان کے بے شمار مراتب ہیں۔ ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ آدمی صاحب ایمان ہو، کوئی فرض عبادت نہ چھوڑے اور کسی سے سرد مہری کا سلوک نہ کرے۔
احسان کا اعلیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ آدمی کو عبادت یا حسنِ سلوک میں ذرا سی خامی کا بھی اندیشہ ہو تو کانپ اٹھے:

عامیاں از گناہ توبہ کنند
عارفاں از عبادت استغفار

مراد یہ کہ جب ایک عام مسلمان گناہ کرتا ہے تو شرمسار ہو کر اس سے تائب ہوتا ہے لیکن عارفوں کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ جب وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے عبادت کو اکمل و احسن طریق پر ادا کرنے میں کوتاہی ہو گئی ہے تو اس ادنیٰ کوتاہی کو بھی گناہ سمجھتے ہیں اور اس سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں معافی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ یہ احسان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

اہمیت :

اللہ تعالیٰ کو بندوں میں احسان اس قدر مرغوب ہے کہ اپنی مثال کو سامنے لا کر احسان کی ترغیب دیتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی اس عبارت سے ظاہر ہے۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (۲۸ : ۷۷)

ترجمہ: اور احسان کر جیسے اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔

رحمان اور رحیم اللہ کو اپنے بندوں ہی کے لئے احسان پسند نہیں، اپنے لئے بھی احسان کی صفت پسند فرمائی ہے۔ اس کے اسمائے حسنیٰ میں ایک نام محسن یعنی احسان کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ جو سلوک بھی روا رکھتا ہے وہ احسان کے رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔ اگر کسی آنکھ کو اس کی رعنائی نظر نہ آئے تو اس کی آنکھ کی اپنی بے نوری ہے۔

ایسی آنکھ والے کو مشکل ہی سے نیکی، نیکی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس، جیسا کہ قرآنِ حکیم ہمیں آگاہ کرتا ہے۔ ایسے شخص کو اپنے عمل کی برائی میں زینت نظر آتی ہے۔

احسان کے تقاضے: احسان کے حسب ذیل تقاضے ہیں۔

(۱) احسان کا بدلہ بڑھ چڑھ کر ادا کرنے کی کوشش کرنا۔

(۲) ایثار یعنی دوسرے کو اپنے پر ترجیح دینا۔

(۳) مجبور کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھانا بلکہ حتی الوسع اس کی مدد کرنا۔

(۴) بے مروّت یا ضرر رساں شخص سے درگزر کرنا۔

(۵) سزا دی جائے یا قتل یا ذبح کرنا ہو تو سنگدلی کا مظاہرہ نہ کرنا۔

(۶) احسان نہ جتانا۔

ذیل میں ہم ان تقاضوں پر فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے۔

(اوّل) احسان کا بدلہ بڑھ چڑھ کر ادا کرنے کی کوشش کرنا:

سُورۃُ الرحمٰن (آیت ۶۰) میں یہ زرّیں اصول بتایا ہے:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵-۶۰)

ترجمہ: کیا احسان کی جزا احسان کے سوا کوئی اور ہے۔

جو شخص احسان کا بدلہ دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ ناشکرا ہے، بلکہ احسان کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے محسن سے بڑھ نکلنے کی کوشش کرے۔ والدین کے اولاد پر بے شمار احسانات ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآنِ حکیم نے والدین کے ساتھ احسان کا خصوصی حکم دیا ہے۔ والدین کے احسانات کا حق ادا کرنا مشکل ہے۔ کمترین بدلہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی انکے سامنے سراپا خدمت ہو جائے۔

احسان کا جذبہ ہمیں ایک دوسرے سے نیکی اور بھلائی میں مقابلہ کرنے اور بازی لے جانے پر اُبھارتا ہے۔ محض برابر کے بدلہ پر قانع ہو جانا نیکی ضرور ہے مگر اس کا درجہ احسان کو نہیں پہنچتا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا قاعدہ تھا کہ جب کسی سے قرض لیتے تھے تو واپسی کے وقت اس پر کچھ بڑھا دیتے تھے۔ اگر جنس کا قرض ہوتا تو کوشش فرماتے کہ بہتر جنس سے قرض چکائیں۔

ایک دفعہ امام احمد بن حنبل رح کی قینچی کنوئیں میں گر گئی۔ ان کے ایک کرایہ دار نے نکال دی۔ انہوں نے اسے تین ماہ کا کرایہ معاف کر دیا۔ یہ رقم قینچی کی قیمت سے کئی گنا زیادہ تھی [1]

---

[1] تعارف فقہ از شیخ محمد اقبال

(دوم) ایثار

ایثار کے معنی ہیں ترجیح دینا۔ یعنی دوسروں کی بھلائی کو اپنی بھلائی پہ مقدم رکھنا، بہ الفاظ دیگر دوسروں کی خاطر اپنے مفاد کو قربان کر دینا۔ اس کی چند صورتیں درج ذیل ہیں۔

ا۔ مالی ایثار: ملک و ملت کی خاطر بغیر کسی طمع کے ہر ممکن مالی قربانی انجام دی جائے بلکہ حالات مطالبہ کریں تو حضرت ابوبکر صدیق رض کی طرح گھر کا سارا اثاثہ راہِ حق میں پیش کر دیا جائے اور محبوب سے محبوب چیز کو بھی خرچ کرنے میں دریغ نہ ہو۔ نیکی کا حق جبھی ادا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں محبوب ترین چیز کی قربانی دی جائے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ (۹۲:۳)

ترجمہ: تم پوری نیکی تک ہرگز نہ پہنچو گے جب تک اس میں سے خرچ نہ کرو جسے تم (خود) چاہتے ہو۔

مالی ایثار وہی قابلِ تحسین ہوتا ہے جس میں ایثار کرنے والے کو سچی خوشی ہو اور طبیعت پر کوئی بوجھ محسوس نہ کرے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے ان میں رکھ جنہیں احسان کر کے مسرت ہوتی ہے۔[1]

ب۔ جانی ایثار: جانی ایثار یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دے، قوم کی خدمت میں دریغ نہ کرے اور ضرورت پڑے تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان بھی لڑا دے۔ جہاد اور شہادت کو اسلام میں جو درجہ حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

جہاد کے ایک معرکہ میں چند مسلمان زخمی ہو کر میدان میں پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک زخمی نے پانی مانگا۔ ایک صاحب اس کے پاس پانی لے کر حاضر ہوئے۔ اتنے میں پاس سے ایک اور زخمی نے پانی کے لئے آواز دی۔ پہلے زخمی نے پانی لانے والے سے کہا کہ اس دوسرے آدمی کو پلاؤ۔ پانی والا دوسرے مجاہد کے پاس پہنچا تو اتفاق سے ایک اور زخمی نے کراہ کر پیاس کی صدا لگائی۔ دوسرے زخمی نے پانی پینے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ پہلے اس کی پیاس بجھاؤ۔

---

[1] مشکوٰۃ باب الاستغفار۔

(سوم) مجبور کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھانا بلکہ حتیّ الوسع اُس کی مدد کرنا

سود کی حرمت کا یہی راز ہے۔ سود خواری کے برعکس یہ حکم ہے کہ نادار بھائیوں کی بغیر کسی نفع طلبی کے فراخدلی سے امداد کی جائے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ بغیر سود کے قرضہ دیا جائے اور اس کی واپسی کا کشادہ دلی سے انتظار کیا جائے اس کو قرضِ حسن کہتے ہیں۔

صحیفۂ مدینہ میں جو ملّت کے باہمی اور بین الاقوامی تعلقات کا بنیادی دستور ہے۔ ایک شرط یہ تھی کہ مسلمان اپنے قرض تلے دبے ہوئے بھائیوں کی مدد کریں گے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت کعب بن مالکؓ نے مسجد النبیؐ میں اپنے مقروض سے قرض کا مطالبہ کیا۔ گفتگو اونچی ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تشریف فرما تھے۔ سن کر دروازے کا پردہ اٹھایا، کعب بن مالکؓ کو آواز دی اور فرمایا نصف قرضہ معاف کر دو۔ کعبؓ نے عرض کی کہ معاف کیا۔ آپؐ نے مقروض سے فرمایا، اٹھو، باقی ادا کرو۔[1]

امام ابو حنیفہؒ کا قصہ ہے کہ ایک دن کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک واقف کار آ نکلا۔ اس نے چھپ کر رستہ بدلنا چاہا۔ مگر جب دیکھا کہ امام کی نظر پڑ گئی ہے تو رُک گیا۔ آپ نے پوچھا، رستہ کیوں چھوڑے جاتے تھے؟ اس نے کہا، مجھ پر آپ کا دس ہزار درہم کا قرضہ ہے۔ مدّت ہو گئی ہے ادا نہ کر سکا۔ شرم سے آنکھ برابر نہیں کر سکتا۔ آپ نے کل رقم معاف کر دی اور فرمایا، مجھے دیکھ کر تمہارے دل پر جو گزری اس کے بارہ میں مجھے معاف کر دو۔[2]

چہارم۔ بے مروّت یا ضرر رساں شخص سے درگزر کرنا

قرآن حکیم کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خطاب ہے

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۴۱:۳۴) ترجمہ: (برائی کو) احسن صورت سے پرے کریں۔

مناظرہ کے بارے میں ارشاد ہے:

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب التقاضی [2] تعارف فقہ از شیخ محمد اقبال

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (۱۶ : ۱۲۵)

ترجمہ : اور آپؐ احسن صورت سے اُن سے بحث کریں۔

مخالف فریق گھٹیا اور اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے تو اس کا جواب ویسے ہی اسلحہ سے نہ دیا جائے۔ حسنِ کلام سے کام لینا چاہیئے۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں کسی کے پاس جاؤں اور وہ میری مہمانی اور ضیافت نہ کرے تو کیا جب وہ میرے پاس آئے تو میں اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کروں ؟ فرمایا، نہیں۔ اس کی مہمانی کر۔[1]

آپؐ کا حکم ہے کہ دوسرے شخص کی رائے کے پیچھے چل کر مت کہو کہ لوگ ہمارے ساتھ احسان کریں تو ہم بھی احسان کریں اور وہ ظلم کریں تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ نہیں یہ موقف اختیار کرو کہ لوگ احسان کریں تو تم بھی احسان سے پیش آؤ اور وہ برائی کریں تو (جب بھی) ظلم نہ کرو۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کفّار نے بڑے بڑے ظلم کئے لیکن آپؐ نے ان کا جواب ہمیشہ تحمل اور احسان سے دیا۔ مکّہ میں ایک دفعہ قحط پڑا تو آپؐ نے مدینہ سے کھجور بھیجی اور مالی مدد بھی فرمائی۔ یہ قحط آپؐ ہی کی دُعا سے فرو ہوا۔

مروّت ہر دور میں مسلمانوں کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔ بالخصوص غازیوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ ؎ مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا (اقبال)

اس ضمن میں حضرت صلاح الدین ایوبیؒ کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صلیبی جنگوں میں عیسائیوں نے اہل اسلام پر جو مظالم کئے ان پر درندے بھی شرما جائیں لیکن ایوبیؒ نے ان کی سنگدلی کا جواب ہمیشہ مروّت سے دیا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں شاہِ انگلستان جو عیسائی افواج کا کمانڈر اعلیٰ تھا بیمار پڑا۔ ایوبیؒ نے اس کی درخواست پر اسے دوائیں بھیجیں۔ ایک محاصرہ میں فرنگی قحط کا شکار ہوئے تو سلطان نے بہتوں کی مدد کی۔ ان میں سے کئی اسلام لائے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چند مسلمان سپاہی دشمن کے خیموں سے تین ماہ کا بچہ اٹھا لائے۔ اس کی ماں سلطان کے پاس آئی۔ سلطان کھڑا ہوگیا۔ ماجرا سنا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ بچہ بک چکا تھا۔ اسے منگا کر ماں کے حوالے کیا۔

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی العفو والاحسان

[2] ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی العفو والاحسان

اور انہیں سواری دے کر عزت و احترام کے ساتھ ٹھکانے بھیجا۔

(پنجم) سزا دینا ہو یا قتل یا ذبح کرنا ہو سنگدلی کا مظاہرہ نہ کرنا

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب تم کسی کو (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) ہلاک کرو تو بھلے طریقے سے قتل کرو اور تم ذبح کرو تو بھلے طریقے سے ذبح کرو تم میں سے کوئی اپنی چھری کو تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو رات دے۔[1]

اس حدیث میں دو چیزوں کا ذکر ہے : قتل اور ذبح

قتل کے کئی موقعے ہو سکتے ہیں، مثلاً

۱۔ موذی جانور یعنی سانپ، بچھو وغیرہ کا مارنا: ان کو ظالمانہ طریقے سے ہلاک کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر کسی موذی جانور کو چوٹ سے مارا جا سکے تو جلانا روا نہیں۔

۲۔ دشمن کو میدان جنگ میں مارنا : اسلام سے قبل عرب کے لوگ اپنے دشمنوں کو بڑی بے رحمی سے مارتے تھے۔ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء الگ الگ کاٹ دیتے تھے۔ اس کو مُثلہ کہتے ہیں۔ بارہا دشمن کو درخت سے باندھ کر تیر اندازی کی مشق کرتے تھے۔ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل کے ان بے رحمانہ طریقوں سے منع فرمایا ہے۔

ایک بار آپؐ نے حکم دیا کہ قریش کے فلاں دو کافر ملیں تو انہیں جلا دینا۔ پھر فرمایا، نہیں، صرف قتل کرنا کیونکہ آگ کا عذاب دینا فقط اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔[2]

ظالم نے قتل کا ارتکاب ظالمانہ طریقے سے کیا ہو تو اس صورت میں بے شک اسی انداز میں اس کو مارنے کی اجازت ہے کہ دیگروں کو عبرت ہو۔ یہ اختیار حکومت کا ہے۔

ذبح : حلال جانور کو ذبح کرنا ہو تو ایسے طریقے سے ذبح کیا جائے کہ اسے زیادہ دکھ نہ ہو۔ جانور کو گھسیٹ کر نہ لے جاؤ۔ پیاسا ہو تو پہلے پانی پلاؤ۔ اس کو گرا کر اس کی آنکھوں کے سامنے چھری تیز نہ کرو۔ ایک جانور کے سامنے دوسرا جانور ذبح نہ کرو۔ چھری خوب تیز ہو۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص بکری کو ذبح کرنے کے لئے گرا کر اس کے سامنے چھری تیز کر رہا ہے اور بکری دیکھ رہی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا تم اسے مرنے سے

---

[1] مسلم کتاب الصید باب الامر باحسان الذبح [2] شرح اربعین نووی از ابن حجر

پہلے ہی مارنا چاہتے ہو۔ [1]
ایک صحابی رضؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ بکریوں کو ذبح کرتے وقت مجھے ترس آتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا، اگر تم ان پر رحم کرو گے تو اللہ تعالیٰ بھی تم پر رحم کرے گا۔ [2]

(ششم) احسان نہ جتانا

انسان کی دولت اور طاقت سب اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہے۔ ہمیں اگر کسی پر احسان کرنے کا موقع ملے تو اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ اس نے ہمیں بھلائی کے لائق بنایا ہے۔ کسی کی مالی مدد کی جائے تو دل میں یہ احساس ہو کہ اسے میں نے جو مال دیا ہے وہ ایک امانت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اسے ادا کرنے کے لئے میرے حوالے کی تھی۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سخاوت بادِ صرصر سے بھی بڑھ کر تھی لیکن آپؐ کسی پر احسان نہیں رکھتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: کہ میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں۔ دینے والا اللہ ہے [3]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (۲ : ۲۶۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے صدقات احسان جتلا کر اور ستا کر باطل مت کرو۔
ارشادِ بالا سے آگے کی جو عبارت ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ احسان جتانا، اور ستانا منافقانہ حرکت ہے۔

ثمرات

(۱) تسخیرِ قلوب

احسان سے دوسرے آدمی کے دل کی تسخیر ہوتی ہے بشرطیکہ اس میں وفا کا جوہر ہو۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ تم بدی کی مدافعت نیکی سے کرو گے تو دشمن بھی تمہارا پکا دوست ہو جائے گا بلکہ دورِ اول میں اشاعتِ اسلام کا ایک قوی سبب یہ تھا کہ اسلامی فتوحات میں مفتوحین کے لئے عفوِ عام اور مروت کا پیغام ہوتا تھا جس سے لوگ اہلِ اسلام کے گرویدہ ہو جاتے

---

[1] شرح اربعین نووی از ابن حجر [2] شرح اربعین نووی از ابن حجر
[3] مشکوٰۃ کتاب العلم۔ تیسری حدیث [4] دیکھو سورۃ حٰم السجدہ۔ ۳۴

تھے۔ چنانچہ جہاں جہاں اسلامی پرچم پہنچا وہاں قبولِ اسلام کا سکہ رواں ہوگیا۔ محمد بن قاسم رح کی فاتح افواج نے جب سندھ میں قدم بڑھائے تو ہندوؤں نے خوشی کے شادیانے بجا کر استقبال کیا۔

۲۔ احوال کی اصلاح :

احسان کے بدولت انسانی برادری کے درمیان محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ فساد اور بگاڑ کا قلع قمع ہوتا ہے۔ طاقت بجائے تخریبی مشاغل کے تعمیری اُمور میں صرف ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں اصلاح کرنا مُحسنین کا شیوہ ہے۔

(دیکھو سورۃ الاعراف - ۵۶)

۳۔ اللہ تعالیٰ کا فضل :

اللہ تعالیٰ محسن ہے۔ وہ احسان کرنے والے کی قدر کرتا ہے۔ اس کی عبادت جی لگا کر کی جائے یا بندوں سے سلوک رکھا جائے تو اس کا اجر دونوں جہان میں دیتا ہے۔ احسان والوں کو تنگ حال یا رسوا نہیں کرتا۔ ان کے مراتب بلند سے بلند تر کئے جاتا ہے۔ اس کا وعدہ ہے :

وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ (۲:۵۸) اور ہم احسان کرنے والوں کو مزید عطا فرمائیں گے

مُحسنین کو آخرت میں سب سے بڑی نعمت عطا ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہے اور محبت کا صلہ دیدارِ الٰہی ۔ ارشاد ہے :

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۲:۱۹۵)

ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو چاہتا ہے۔

سوالات

۱۔ احسان کا مفہوم و مطلب واضح کیجئے، نیز قرآن و سنّت کی روشنی میں اس کی فضیلت بیان کیجئے۔
۲۔ احسان کی اہم صورتیں بیان کیجئے اور قرآن و حدیث سے اس کے لئے حوالے دیجئے۔
۳۔ عدل اور احسان میں کیا فرق ہے؟ احسان کی اہمیت کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کیجئے
۴۔ اسلامی معاشرے میں احسان کی اہمیت پر ایک مفصّل نوٹ لکھئے۔

تدبّر

مفہوم : تدبر کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کے انجام یا انتہا کو پیش نظر رکھ کر غور کرنا یعنی یہ دیکھنا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور اس سے کیا اثرات رونما ہوں گے۔

مفہوم کے اعتبار سے تدبر وہ عقل یا تفکر ہے جو واقعات و حقائق کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگرچہ وہ ماضی و حال کا مطالعہ بھی کرتا ہے لیکن اس کا اصل مقصود مآل یعنی انجام ہے

تدبر کو ہم عقل یا تفکّر کی اعلیٰ ترین صورت کہہ سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت درج ذیل حدیث سے بھی ملتا ہے۔

لَا عَقْلَ كَالتَّدْبِيرِ [1] ترجمہ: تدبیر کی طرح کوئی عقل نہیں

تدبر کے ساتھ ایک اور لفظ حکمت بھی ہے۔ یہ لفظ قریب المعنی ہے۔ فرق یہ ہے کہ تدبر میں مستقبل کی فکر یا دور اندیشی کا پہلو غالب ہے۔

تدبر کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ منزلِ مقصود کی فکر کرنا : منزل کے لئے ساز و سامان کی تیاری کرنا اور راہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ان کے موافق منصوبہ بنانا۔

۲۔ عمارت کا نقشہ : عمارت بنانی ہو تو اس کا نقشہ یا نمونہ تیار کر کے اس کے بموجب تیار کرنا۔

۳۔ بجٹ : حکومت اپنے انتظامی اور تعمیری پروگراموں کا ایک خاکہ تیار کر کے اس کے لئے مناسب رقوم مہیا کرتی ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ رقم گھٹ جائے یا کوئی منصوبہ استطاعت سے بڑھ کر ثابت ہو۔ یہ تدبر ہے۔

۴۔ باطن تک پہنچنا : عقل کا تقاضا ہے کہ ہم کسی چیز یا عبادت کے ظاہر تک ہی محدود نہ رہ جائیں بلکہ اس کے باطن میں بھی غور کریں اور حالات و واقعات کی تہ تک پہنچیں۔ چنانچہ تدبّر فی القرآن سے مراد ہے، اپنے علم و استطاعت کے بموجب قرآن کی گہرائی تک پہنچنے کی سعی کرنا۔

---

[1] مشکوٰۃ باب الحذر والتانی

۵۔ مستقبل کی فکر: یعنی حال ہی میں سمٹ کر رہ نہ جانا بلکہ اس کے حصار سے باہر جھانک کر مستقبل کو دیکھنا اور اس کی تیاری کرنا۔

۶۔ آخرت کی فکر: دنیا کی رنگینیوں میں جذب ہو کر کھو نہ جانا بلکہ آخرت کی بھی فکر کرنا۔

فکر و نظر کی جولان گاہ اس زندگی کی سطح تک محدود نہ رکھنا بلکہ آخرت کی زندگی کو بھی تلاش کرنا۔

تدبّر کے مراتب حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیف حجۃ اللہ البالغہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبّر کے دو درجے ہیں۔ ادنیٰ اور اعلیٰ۔

ادنیٰ تدبّر:

ادنیٰ تدبّر عوام کا تدبّر ہے۔ ان کے پاس جو کچھ سرسری علم ہوتا ہے۔ وہ اس کے موافق اپنے محدود طریقہ سے سوچ لیتے ہیں۔ انہیں حقائقِ موجودات کی گہرائیوں میں جانے کی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ ارض و سماوات پر ایک سرسری نظر ہی ڈال کر اپنے رب کی ربوبیت کی جھلک پا لیتے ہیں۔

ناخواندہ دیہاتی کو علم و حکمت کے اسرار کی طرف توجہ دلانا یا اس سے سائنسی اور تحقیقی رمزیں بیان کرنا بے کار ہوگا۔ اس کی زندگی بڑی سادہ ہوتی ہے۔ وادیوں اور کوہساروں کے دامن کا پروردہ ہوتا ہے۔ صحرا میں اونٹ اس کی زندگی کی بیش قدر متاع ہے جس پر سوار ہو کر وہ خانہ بدوش زندگی کے فاصلے طے کرتا ہے۔ سفر میں آنکھوں کے سامنے کبھی پہاڑوں کا نظارہ آتا ہے، کبھی میدانوں کا۔ اس کا سفر چونکہ اکثر رات کو ہوتا ہے۔ اس لئے نگاہ رہ رہ کر آسمان کے دلفریب منظر کی طرف اٹھتی ہے جس کے چاند تاروں کی روشنی میں وہ نشیب و فراز میں ہموار اور لگاتار چلا جاتا ہے۔ یہی اس کا سارا ماحول ہے، جس پر وہ سرسری نظر ڈال کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم اسی تدبر کی دعوت دینے پر اکتفا کرتا ہے اور کہتا ہے۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ		تو کیا وہ نظر نہیں ڈالتے
اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وقفہ	(۸۸ : ۱۷)	اونٹوں پر، وہ کیسے بنائے گئے
وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وقفہ		اور آسمان پر، وہ کیسے بلند کیا گیا۔
وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وقفہ		اور پہاڑوں پر، وہ کیسے نصب کئے گئے
وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ وقفہ		اور زمین پر، وہ کیسے بچھائی گئی۔

ہر شخص سے اس کی علمی سطح کے موافق ہی فہم کی توقع ہو سکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ

یہ آدمی سے علمی بات کہنا جو اس کا اہل نہ ہو علم کو ضائع کرنا ہے [1]

علم تدبر کی بنیاد ہے۔ سب اشخاص کا علم ایک سا نہیں ہوتا، اس لئے ہر عامی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ خود قرآن کی تفسیر کر سکے جہالت ہے۔

اعلیٰ تدبر :

اعلیٰ تدبر علماء کا حصہ ہے۔ اس تدبر کے لئے ضروری ہے کہ ذہن میں علم کا خزانہ ہو۔ یہ تدبر ذہنی خلاء میں نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ علماء کے خیالات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جب تک روایتی علم میں کمال حاصل نہ کر لیا جائے تدبر پیدا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہر آدمی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ قرآن میں اعلیٰ تدبر حاصل کر سکے۔ ایک عامی اس کے اسلوب اور تاثیر کی معجزیت کو پالے تو اس کے لئے یہی تدبر کافی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے آدمی کے لئے قرآن حکیم کا مفسر بننا ممکن نہیں۔ قرآن حکیم میں اعلیٰ تدبر کا مقام حاصل کرنا ہو تو عربی زبان اور قواعد میں مہارت پیدا کرنا ضروری ہے۔

اعلیٰ تدبر کی شرطیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ کا خوف : تدبر صحیح معنی میں وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف جاگزیں ہو ورنہ وہ فکر کی غلط راہوں پر چل دے گا خود بھی گمراہ ہو گا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔ ایسی حرکت کرنا منافقوں کا کام ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن تین چیزوں سے اسلام کو ضرر پہنچے گا۔ ان میں سے ایک وہ منافق ہو گا جو قرآن کی آیات سنا سنا کر اپنے (غلط) نظریات پیش کرے گا۔ [2]

۲۔ فنی مہارت :

کوئی بھی فن ہو اس میں اعلیٰ تدبر کا مقام پیدا کرنے کے لئے برسوں کی ریاضت ضروری ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد علم پر ہونی چاہیئے ورنہ یوں تو میاں بدھو بھی بڑے مفکر تھے۔

علم کا تقاضا ہے کہ سابق علماء کی تحقیقات سے پوری واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ ان کی تحریرات اور خیالات کا گہری توجہ سے مطالعہ کیا جائے۔ ضرور نہیں کہ ان کی ہر بات سے اتفاق ہو، اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کا حق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جس

---

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم الفصل الثالث [2] مشکوٰۃ کتاب العلم

نے اس فن میں کمال پیدا کیا ہو۔

مثال کے طور پر تدبّر فی القرآن کو لیجئے۔ تفسیر میں مستند الورا علیٰ مقام پیدا کرنا ہو تو عربی زبان اور قواعد میں ماہر ہونا چاہیئے۔ قرآنِ حکیم کے مفسرِ اول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کا نظرِ غائر سے مطالعہ کیا جائے نیز ماضی و حال کے مفسرین کے حالات سے آگاہی پیدا کی جائے تو جب کہیں آدمی مستند مقام حاصل کرنے کا حق دار ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں مکین ہو اور اللہ نے صاف ذہن اور بصیرت بھی عطا کی ہو۔

۳۔ تحمل :

تدبر، صبر و تحمل کا محتاج ہے۔ ہر معاملہ میں ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ نتیجہ تک پہنچنے میں جلدی نہ کی جائے، ورنہ تدبّر غلط راستے پر ڈال دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ کی رو سے قاضی کو غصّہ کی حالت میں فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں۔

سائنسی تحقیقات میں بعض دفعہ برسوں گذر جاتے ہیں۔ طبیعت میں تحمل نہ ہو تو انسان تحقیقات کے دوران میں دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ تجربہ :

تدبّر کو عملی دنیا سے جُدا نہیں رکھنا چاہیئے۔ محض فکری شعبدہ بازیوں کو ہم حکمت کا کمال نہیں کہہ سکتے۔ بہت لوگ زبان سے خوشنما باتیں کہتے ہیں لیکن عمل کی دنیا میں یہ باتیں تباہ کرتی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ پردہ ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ اگر عورتیں پردہ چھوڑ دیں تو آزادی سے بیرونی دنیا میں بھی وہ اپنا کردار ادا کر کے ملّت کو کامیابی سے ہم کنار کر دیں گی۔ لیکن یورپ کی تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بے پردگی نے وہاں کی اخلاقی حالت کو کس قدر تباہ کیا ہے۔

اسی مدبّر کی بات کا اعتبار چاہیئے جو عملی دنیا میں بھی کچھ کر کے دکھاتا ہے۔ خالی حکیمانہ کلام کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیئے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :

لَا حَكِيْمَ اِلَّا ذُوْ تَجْرِبَةٍ [1]

ترجمہ : تجربہ کے بغیر کوئی شخص صاحبِ حکمت نہیں ہوتا

---

[1] مشکاۃ باب الحذر

تدبر کی حدود

۱۔ عقل پرستی سے گریز

عقل بے شک بہت کارآمد ہے لیکن اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو بگاڑ پیدا کرتی ہے عقل کو قرآن و سنت کے تابع رکھنا چاہیئے جو تدبر قرآن و سنت سے آزاد ہو وہ گمراہی اختیار کر لیتا ہے۔ عقل کو چراغ کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اسے نصب العین نہیں بنانا چاہیئے۔

۲۔ ممنوعہ امور میں غور و فکر سے گریز:

اسلام نے جن چیزوں میں غور کرنے سے منع کیا ہے ان میں کرید نہ کی جائے۔ ان چیزوں کا زیادہ تعلق عالم غیب سے ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی گتھیاں سلجھانا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ جو اس بحث میں پڑا وہ اپنی حد سے تجاوز کر گیا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مخلوق میں غور و فکر کرنے کی اجازت دی ہے لیکن خالق کی ذات میں تفکر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اسی ضمن میں تقدیر کا مسئلہ بھی آتا ہے جس میں بعض لوگ بہت عقل دوڑاتے ہیں۔ تقدیر میں فقط اسی حد تک غور کرنا چاہیئے جس حد تک اسلام نے اجازت دی ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ تقدیر کی گتھیاں سلجھائی نہیں جا سکتیں۔ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ تقدیر میں غور کرنے والے کی مثال سورج کی شعاعوں سے نظر ملانے والے کی ہے۔ وہ جس قدر دیکھے گا اس کی سرگشتگی اور حیرانی اسی قدر بڑھے گی۔

اہمیت

۱۔ تدبّر انسان کی امتیازی صفت ہے

انسان کو جو چیز بنیادی طور پر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی دور اندیش اور منصوبہ خیز عقل ہے۔ حیوانات پر ان کے جذبات حکمران رہتے ہیں۔ لیکن انسان اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتا ہے۔ حیوانات کی عقل محدود ہے، وہ دور بین اور دور اندیش نہیں ہوتے۔ انسان سالوں بلکہ صدیوں تک کی فکر کرتا ہے وہ حال سے زیادہ مستقبل میں کھویا رہتا ہے۔

انسان اپنے بارے ہی میں نہیں سوچتا بلکہ کل انسانیت کے مستقبل کی فکر بھی کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ انفرادی اصول ہی نہیں، کلیات بھی وضع کرتا ہے اور فکر و تدبّر کا ایک عالمگیر نظام برپا کرتا ہے۔

تدبّر انسان کی استعداد اور امتیازی صفت ہے اسے معطل کر دینا حیوانیت کی طرف پلٹنے کے برابر ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو جو لوگ تدبر سے کام نہیں لیتے وہ چوپایوں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کو ٹھکرا کر ناشکری کا ثبوت دیتے ہیں۔

سُورَۃُ الاَعراف کی ایک آیت[1] میں جنّ وانس کے ان افراد کی حسب ذیل چند صفات بیان ہوئی ہیں جن کی منزل جہنم ہے:-

۱۔ وہ دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔

۲۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔

۳۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔

نتیجہ یہ کہ: وہ بالکل بے خبر ہیں۔

چوپایوں سے بڑھ کر گمراہ ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تدبّر انسانوں کا شیوہ ہے اور غفلت چوپایوں کی خصلت۔ انسان کا فرض ہے کہ تدبر کے جوہر کو چمکانے میں کوشاں رہے۔

جناب رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے:

دل کو مراقبہ (یعنی دھیان) کی عادت ڈالو اور عبرت پذیری بڑھاؤ۔[2]

ایک صحابیؓ نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے آپؐ نے فرمایا کہ ہر کام کو تدبیر کے ساتھ شروع کر۔ اگر تو سمجھے کہ اس کام کے انجام میں بھلائی ہوگی۔ تو انجام دے اور اگر تجھے اس کی وجہ سے بھٹک جانے کا ڈر ہو تو باز آجا۔[3]

۲۔ تدبّر ایمان کی راہ پر چلاتا ہے

تدبر چونکہ باطل سے پھیر کر حق کی طرف لاتا ہے۔ اس لئے بارہا اس کے بدولت کفار ایمان لے آتے ہیں اور مومنوں کا ایمان مزید پختہ ہوتا ہے۔

۳۔ تدبر حقائق کی تہ تک پہنچاتا ہے

انسان کے ذہن میں تدبّر اور تفکّر کی استعداد کالبے کنار خزانہ ودیعت ہے۔ وہ اس سے کام لے کر حقائق کی تہ تک پہنچ سکتا ہے اور محض ظاہر کے فریب میں نہیں رہتا۔ کائنات کے سینہ میں بے شمار اسرار پوشیدہ ہیں جو انسان کی نگاہِ جستجو کے منتظر ہیں۔ انسان جس قدر تحقیق اور تفکر کرے گا وہ کائنات کے اسرار کی معرفت حاصل کرتا جائے گا۔ اس معرفت کے ذریعے اس کا توحید پر ایمان پختہ سے پختہ تر ہوگا۔

---

[1] دیکھو آیت ۱۷۹ [2] کنز العمال [3] مشکوٰۃ باب الحذر والتانی

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت اور نگاہِ روشن سے کفار جلتے تھے اور الٹے سیدھے اعتراض کرتے تھے۔ اس کے جواب میں وحیِ الٰہی نے کہا:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ	(اے نبی!) کہہ دیجیے کہ میں تم کو ایک نصیحت کرتا ہوں۔
اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى	کہ اللہ کے لئے اٹھو دو دو
وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا وقف	اور ایک ایک (اور) پھر خوب سوچو۔

(سبا ۴۶)

اس دعوت میں کفار کو چیلنج ہے کہ تم اندھا دھند اعتراض کئے جاتے ہو اور سوچتے سمجھتے کچھ نہیں۔ تمہیں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ کرنا ہے تو دماغ سے کام لے کر دیکھو۔ دل میں اللہ کا خوف رکھو اور چاہے اکیلے اور چاہے مل کر خوب غور وفکر کرو۔ یقیناً صحیح نتیجہ پر پہنچو گے۔

۴۔ تدبر عبادت ہے

تدبر ذکر کی ایک ارفع صورت ہے، اس لئے علماء نے ذکر کی طرح تدبر کو بھی افضل عبادت شمار کیا ہے۔ اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند نہایت بصیرت افروز احادیث ہیں، مثلاً:

۱۔ لَا عِبَادَةَ كَالتَّفَكُّرِ ...... [1] تفکر کی طرح کوئی عبادت نہیں

۲۔ فِكْرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ قِيَامِ لَيْلَةٍ ...... [2]

(ایک گھڑی کا تفکر رات بھر کی نماز گزاری سے بہتر ہے)

۳۔ ایک گھڑی کی سوچ ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ [3]

ان بعد کی دو حدیثوں میں سے ایک میں تفکر کی ایک گھڑی کو ایک رات کے قیام سے اور دوسری میں ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر قرار دیا ہے۔ یہ فرق تفکر کی نیت اور نوعیت کا فرق ہے۔

علم دین کے شعبوں میں ان شعبوں کو افضلیت حاصل ہے جن کا تعلق فکر و تدبر سے ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ ایک فقیہ ہزار عابدوں سے بڑھ کر شیطان پر سخت ہوتا ہے۔ [4]

---

[1] دلیل الفالحین ۲ : ۳۶ [2] اکمال کنز العمال جلد ۲۔ دلیل الفالحین باب التفکر ۲ : ۲۷

[3] الجامع الصغیر سیوطی [4] ترمذی ابواب العلم

تدبّر کے تقاضے

(۱) قرآن میں تدبّر

قرآنِ مجید حق کا صحیفہ ہے۔ یہ حکمت اور بصیرت کا سرچشمہ اور علم دین بلکہ سب علوم کا مخزن ہے۔ اس لئے اس میں غور و فکر ضروری ہے۔ سورۃ صٓ میں ارشاد ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (۲۹:۳۸)

ترجمہ: یہ کتاب ہے برکت والی جو ہم نے (اے نبی!) آپؐ کی طرف اتاری تاکہ (لوگ) اس کی آیات میں تدبّر کریں اور عقل و خرد والے یاد رکھیں۔

ثابت ہوا کہ نزولِ قرآن کے مقاصد ہی میں یہ شامل ہے کہ انسان میں غور و فکر کی نمود ہے اور وہ قابلِ توجہ امور پر خوب توجہ دے۔ اس کی تائید قرآنِ حکیم کی اور بھی کئی آیات سے ہوتی ہے۔ (مثلاً دیکھو سورۃ النحل آیت ۴۴)

سورۃ الفرقان میں بندگانِ رحمان کی ایک صفت یوں بیان کی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (۷۳:۲۵)

اور جو (ایسے ہیں کہ) جب انہیں اپنے ربّ کی آیات سے دھیان دلایا جائے تو ان پر اندھے اور بہرے (ہو کر) نہیں گرتے

یعنی آنکھیں کھول کر اور دھیان سے قرآنِ حکیم کی آیات سنتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی تلاوت میں بہت ثواب ہے لیکن جس آدمی کو اس معنی آفریں کتاب کے معانی سمجھ میں آ سکتے ہوں اسے لازم ہے کہ ہر آیت کی سوچ سمجھ اور تدبّر سے تلاوت کرے۔ قرآنِ حکیم میں ترتیل یعنی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرنے کا حکم ہے۔ ترتیل سے مقصود یہ ہے کہ فہم و تدبر حاصل ہو۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک دفعہ ساری رات ایک ہی آیت بار بار پڑھتے رہے۔ ایسی ہی مثالیں بعض صحابہؓ کی زندگی میں بھی ملتی ہیں۔

قرآنِ حکیم سے آنکھیں بند کرنا کفار اور منافقین کا کام ہے۔ سورۃ محمدؐ میں منافقین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:۔

۱۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔

۲۔ ان کو بہرا کیا اور آنکھوں سے اندھا کر دیا۔

۳۔ کیا وہ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے یا (کیا ان کے) دلوں پر اپنے قفل ہیں۔

ان نکات سے واضح ہے کہ جو لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے وہ گویا دیکھنے سننے کی نعمت سے محروم ہیں۔

۲۔ کائنات میں تدبّر :

قرآنِ حکیم ہی میں نہیں پوری کائنات میں غور و فکر کرنے کا حکم ہے۔ کائنات اللہ تعالےٰ کی بعض صفات کا پرتو ہے۔ اس کے مطالعہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کی ایک جھلک سامنے آتی ہے اور یہی عقل و نقد کی صحیح داد ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ کائنات کے مطالعہ کی ترغیب دی گئی ہے جس کا ایک مختصر بیان ہم سابقہ صفحات میں ذکر و فکر کے سلسلہ میں کر آئے ہیں۔

سُورۃُ الملک میں انسان سے خطاب ہے :

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ ھَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ (۶۷ : ۳)

رحمان کی آفرینش میں تو کوئی تفاوت نہ دیکھے گا۔ پس دوبارہ نظر ڈال، کیا تو کوئی پھوٹ دیکھتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ ساری کائنات ایک ہموار اور مضبوط نظام میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی ناہمواری، بے ربطی یا دُوئی نہیں۔ کائنات میں جس قدر غور کیا جائے۔ یہ حقیقت روشن سے روشن تر ہوتی چلی جاتی ہے اور ایمان پختہ سے پختہ تر ہوتا ہے۔

واقعات و حقائق کو ذہن میں محفوظ رکھنا بے شک علم کا ایک لابدی شعبہ ہے۔ لیکن اصل فضیلت اس بات میں ہے کہ انہیں تدبّر کی بنیاد بنایا جائے۔

۳۔ اپنی ذات میں تدبّر :

انسان سب سے زیادہ اپنی ذات کے بارے میں فریب کھاتا ہے۔ بارہا اپنی طاقت اور استعداد کے بارے میں مغرور ہو کر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے۔ وہ ذاتی منفعت میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ اسے آخرت کی فکر نہیں رہتی۔ اگر وہ اپنی اصل اور پھر انجام پر غور کرے تو اس کے سامنے یہ بات خوب روشن ہو جائے کہ میں خاک سے اٹھا اور خاک میں مل جاؤں گا۔ یہ زندگی آنی و فانی ہے لہٰذا آخرت کی تیاری میں غفلت نہ کی جائے۔

جو لوگ اپنی جان کے متوالے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے فکر رہتے ہیں، ان کے بارے سُورۃُ الرُّوم (آیت ۔ ۸) میں آیا ہے :

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ (۳۰ : ۸) ترجمہ : اور کیا انہوں نے اپنی جانوں میں تفکر نہیں کیا۔

آدمی اگر اپنی ہستی پر غور کرے تو اپنی بے بضاعتی اور عاجزی کا احساس دل میں خوب جم جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ربوبیت کا تہ دل سے اعتراف ہو جاتا ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

(جس نے خود کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا)

حضرت حسن بن ابوالحسن فرماتے ہیں:

فکر مومن کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی خوبیاں اور خرابیاں دیکھتا ہے۔[1]

۴۔ تاریخ میں تدبّر:

سورۃ الروم آیت ۹ میں ارشاد ہے:

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ (۹:۳۰)

ترجمہ: اور کیا وہ زمین میں پھرے کہ دیکھیں کیسی عاقبت ہوئی ان کی جو ان سے پہلے تھے۔

اس آیت میں مطالعۂ تاریخ کی ترغیب ہے تاکہ اقوام کے عروج و زوال کے اسباب کھل کر سامنے آجائیں۔ بڑی بڑی صاحبِ حشمت اقوام اس دنیا میں آئیں، صنعت و حرفت اور تہذیب میں اوجِ کمال تک پہنچیں۔ لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بغاوت کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اُن کی آبادیوں کے کھنڈر آج بھی جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ ان پر نظر ڈالو تو عبرت حاصل ہوگی۔

قرآنِ حکیم میں تاریخ کی بعض کڑیاں اس لئے مذکور ہیں کہ لوگ ان سے درس حاصل کریں۔

۵۔ آخرت میں تدبر:

انسان کو چاہیئے کہ موت سے غافل نہ ہو۔ انسان کی آخری اور دائم منزل آخرت ہے۔ دُنیا کی رنگینیوں میں کھو کر آخرت سے غفلت کرنے والے لوگ خسارے میں رہتے ہیں۔ ارشاد نبوی ہے کہ آخرت کے فرزند ہو کر رہو۔ دنیا کے فرزند نہ بنو۔[2]

آخرت کا تدبّر ہی انسان کو مادیت کے پھندوں سے نکال کر نیکی کی جنت میں لے جاتا ہے۔

---

[1] دلیل الفالحین (۲: ۳۷)

[2] دلیل الفالحین باب التکفیر۔

یہ تدبّر نہ ہو تو آدمی مادہ پرست، لادین اور خود غرض ہو جائے۔

ثمرات

تدبر کے فیوض و برکات کا اندازہ مشکل ہے۔ گزشتہ صفحات میں تدبّر کے ثمرات کا بھی ذیلی طور پر ذکر آ چکا ہے۔ ذیل میں انہیں مختصراً پھر بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ تدبّر ایمان کی راہ پر چلاتا ہے۔

۲۔ تدبّر عبادت کا قائم مقام ہے۔

۳۔ تدبّر سے عرفان و بصیرت کی دولت ملتی ہے اور حقیقت آنکھوں کے سامنے روشن ہوتی ہے۔ سُورَۃُ یونس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو تفکر کرنے والوں کے لئے خوب کھول کر رکھ دیتا ہے (دیکھو آیت ۔ ۲۴) تدبّر کرنے والے اکثر صحیح فیصلہ تک پہنچتے ہیں۔

۴۔ تدبّر انسان کو زندگی کے بارے میں سنجیدہ کرتا ہے اور لَہو و لَعِب میں مبتلا ہونے سے بچاتا ہے۔

۵۔ تدبّر فوری نفع کے بجائے آخری فلاح کی راہ دکھاتا ہے اور یہ حقیقت روشن کرتا ہے کہ حقیقی بہبود وہی ہے جو ساری قوم کی ہے۔ انسان کو ملّت کی خاطر ذاتی نفع قربان کر دینا چاہیئے۔ تدبّر نہ ہو تو انسان میں قربانی کا مادہ مشکل سے پیدا ہو سکے۔

۶۔ تدبّر سے علم و حکمت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ علم کے گوناگوں شعبوں میں تحقیقی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

سوالات

۱۔ تدبّر سے کیا مراد ہے؟ قرآنِ حکیم میں کن چیزوں میں تدبّر کرنے کی ترغیب و دعوت دی گئی ہے؟

۲۔ قرآن و سنت کی روشنی میں تدبّر کی فضیلت و اہمیت بیان کیجئے۔

خدمتِ خلق

مفہوم : خدمتِ خلق سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر مخلوق کی مدد اور معاونت کرنا۔
قرآن اور حدیث میں اس کا قریب المعنی لفظ تعاون ہے۔
خدمتِ خلق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں انسان و حیوان سب شامل ہیں۔

خدمتِ خلق کی روح خدمت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ بنیادی اور ظاہری اعتبار سے خدمتِ خلق سے مراد بے معاوضہ خدمت ہے۔ لیکن انسان چاہے تو کاروبار اور با معاوضہ نوکری میں بھی اس کی روح کو سمو سکتا ہے۔ انسان کو روزی کمانے سے چارہ نہیں لیکن وہ خدمتِ خلق کی روح سے سرشار ہو تو ملازمت، کاروبار اور زندگی کے دیگر امور میں دیانت اور امانت سے کام لے گا۔ معاملات میں دھوکا نہ دے گا۔ گراں فروشی اور بازاری میں آلودہ نہ ہوگا۔ الغرض قوم کی اخلاقی ہی نہیں اقتصادی حالت میں بھی مدد دے گا۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کا عملہ اس جذبہ سے معمور ہو تو قوم کی زندگی میں اطمینان کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ہمارے سامنے خلفائے راشدین رض کی زندگیاں اس کی مثال پیش کرتی ہیں۔ ان کے بعد بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز رح اور صلاح الدین ایوبی ایسے فرمانروا آئے جنہوں نے حکومت کے خزانے سے صرف ضرورت بھر خرچ لیا۔ اور زندگی قوم کی راہ میں وقف کر دی۔

اپنے کنبہ کی خدمت کرنا اگرچہ بظاہر ایک دنیوی فریضہ ہے لیکن آدمی یہ فریضہ بھی اپنے رب کی رضا کے لئے انجام دے تو خدمتِ خلق شمار ہوگا۔

مراتب :

خدمتِ خلق کا اعلیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ دوسروں کی خدمت کے لئے دل اس طرح بیتاب رہے گویا اپنی ہی خدمت کا ایک نادر موقع ہاتھ آ رہا ہے۔ اس جذبہ کے ساتھ رستہ کے درمیان سے ایک کانٹا بھی دور کر دیا جائے تو اس کا اجر جنت ہے۔

وسعت : دل کی خیر خواہی سے لے کر میدانِ جہاد میں سر کٹانے تک خدمتِ خلق کے

بے شمار مقام آتے ہیں۔ نادار اور معذور آدمی اور کوئی کام انجام نہ دے سکے تو خلق کے لئے دُعا مانگ کر بھی خدمتِ خلق کا حق ادا کر سکتا ہے۔

روحانی خدمت :

روحانی خدمت بدنی اور مالی خدمت سے بھی بڑھ کر لازم ہے۔ برائی سے بچانا اور نیک راہ پر چلانا روحانی خدمت ہے۔ ایک بار جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تیرا (مسلمان) بھائی چاہے ظالم ہو یا مظلوم تو اس کی مدد کر۔ ایک صحابیؓ نے پوچھا، مظلوم کی تو مدد کروں لیکن ظالم کی مدد کیسے ہو؟ فرمایا، اسے ظلم کرنے سے روک۔ یہ اس کی مدد ہے۔[1]

برائی کو روکنا اور نیکی کی تبلیغ کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

خدمتِ خلق کی تبلیغ :

کسی شخص کے بس میں نہیں کہ وہ ساری دنیا کی خدمت کر سکے۔ اس لئے خدمتِ خلق کا تقاضا ہے کہ پوری قوم میں تعاون کے لئے آمادگی ہو۔ اس مقصد کے لئے تبلیغ کی ضرورت ہے۔ جنابِ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والا گویا خود اس نیکی پر عمل کرتا ہے۔

اہمیت :

وہی قوم راحت اور کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے جو خدمتِ خلق کی امنگ سے سرشار ہو۔ خدمت کا جذبہ بڑے ایثار کا طلب گار ہوتا ہے۔ دوسروں کی خاطر اپنے آرام کو چھوڑنا اور فائدہ سے دست بردار ہونا معمولی قربانی نہیں۔ اس کی توقع اسی انسان سے ہو سکتی ہے جسے اللہ تعالےٰ نے عظیم اخلاق عطا کیا ہو۔ اس میں بے نفسی، ایثار، مساوات، محنت کشی اور ہمدردی کے اوصاف ہوں۔ قرآنِ حکیم نے نیک لوگوں کا ایک وصف یہ بتایا ہے۔

وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ (۷۶ : ۸)

اِس آیت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے وہ مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ایک اور مفہوم یہ ہے کہ ایسے میں بھی جب کہ خود بھی کھانے کی احتیاج

---

[1] ترمذی ابواب الفتن، مسلم کتاب البر والصلہ بخاری کتاب المظالم۔

رکھتے ہوں۔ وہ مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔ مراد یہ کہ خود بھوکے رہ جائیں لیکن محتاجوں کو کھلاتے ہیں۔

مسلمان کی زندگی اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف ہے

مسلمان اپنی زندگی کا ایک حصہ اگر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی بہتری میں خرچ نہیں کرتا تو وہ بخیل ہے بلکہ خائن ہے۔ محتاج کی حاجت روائی اور مصیبت زدہ کی دستگیری نہ کرنا گناہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ کسی آدمی کے پاس چٹیل میدان میں فالتو پانی ہو اور وہ مسافر کو نہ دے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس سے کلام نہ کرے گا۔ نہ اس پر نظر ڈالے گا اور نہ اسے گناہوں سے پاک کرے گا۔[1]

اسلامی فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر چند اشخاص کے پاس پانی ہو اور ان کے قریب کوئی آدمی ان کے علم کے باوجود پیاسا مر جائے تو ان پر اس کی جان کا تاوان ڈالا جائے گا۔

جس طرح مال کی زکوٰۃ فرض ہے اسی طرح بدن کی زکوٰۃ بھی لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صحیح بدن اور سالم و توانا اعضاء دیئے ہوں تو اُن سے خدمتِ خلق کے لئے بھی ضرور کچھ کام لے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وقت کی بے اندازہ دولت عطا فرمائی ہے۔ چاہیئے کہ اس وقت کی بھی زکوٰۃ نکالے۔ اس کا ایک حصہ خدمتِ خلق میں صرف کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ ہر روز جب کہ سورج طلوع ہوتا ہے انسان کے ہر جوڑ میں صدقہ واجب ہو جاتا ہے تُو دو آدمیوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کرے۔ تو یہ صدقہ ہے۔ تو کسی آدمی کو سواری میں مدد دے اور اسے سواری پر بٹھائے یا اس پر اس کا سامان رکھے تو یہ صدقہ ہے۔ کلمہ طیبہ صدقہ ہے، ہر قدم کے عوض جو تو نماز کے لئے اٹھاتا ہے صدقہ ہے اور تُو ایذا رساں چیز کو رستہ سے ہٹائے تو یہ بھی صدقہ ہے۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدمتِ خلق کی تاکید ایسے الفاظ میں فرمائی ہے جن سے اس کی فضیلت ہزار چند ہو جاتی ہے۔ آپؐ کا فرمان ہے کہ مجھے ایک مہینہ روزہ رکھنے اور مسجدِ حرام

---

[1] ترمذی ابواب الفتن، مسلم کتاب البر والصلہ، بخاری کتاب المظالم۔

[2] ریاض الصالحین باب فی بیان کثرۃ طرق الخیر۔

میں بیٹھ کر اعتکاف کرنے سے یہ زیادہ عزیز ہے کہ اپنے بھائی کی بوقتِ ضرورت امداد کروں۔[1]

خدمتِ خلق کا اعزاز

خدمتِ خلق سے عزت وابستہ ہے۔ سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ (قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے)۔ حضرت عمرؓ خطوط میں اپنے نام کے ساتھ اَمِیْرُ الْمُسْلِمِیْنَ (یعنی مسلمانوں کا خادم) لکھا کرتے تھے۔ ایک دن سرکاری اونٹوں پر تیل مل رہے تھے۔ ایک صحابیؓ نے دیکھ کر کہا، یہ کام کسی سرکاری غلام سے لیا ہوتا۔ فرمایا مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے؟

خدمت کے فیض میں سب مخلوق شریک ہے

خدمتِ خلق کا فیض اللہ تعالیٰ کی سب مخلوق کے لئے عام کیا جائے۔ اس سے مسلم و غیر مسلم، امیر و غریب اور انسان و حیوان جس کو ضرورت ہو مستفید کرنا چاہیئے۔ ہم اس موضوع پر درج ذیل عنوانوں کے تحت بحث کریں گے:-

(۱) اہلِ اسلام کی خدمت

قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے وَلِیّ ہوتے ہیں۔ مراد یہ کہ ان کے درمیان قلبی رشتہ ہے۔ اس رشتہ کو نباہنا، آپس میں تعاون رکھنا اور ایک دوسرے کے دکھ میں شریک ہونا اہلِ اسلام کا خاصہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایمان والوں کی مثال باہمی محبت، رحمدلی اور میل جول میں ایک جسم کی ہے کہ جب ایک عضو بیمار ہو تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں شریک ہو جاتا ہے۔[2]

حضورؐ کا ایک اور ارشاد ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ مشکل کے وقت اس کا ساتھ چھوڑتا ہے۔[3]

آپؐ نے فرمایا ہے کہ جو مسلمان کسی مسلمان کا ایسی جگہ ساتھ نہیں دیتا جہاں اس کی حرمت مجروح ہو رہی ہو یا اس کی آبرو کا زیاں ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے موقع پر اس کا ساتھ نہ دے گا جہاں اس کی مدد مطلوب ہو۔[4]

خدمتِ خلق ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے۔ جو شخص اس حق میں کوتاہی کرتا ہے

---

[1] کنز العمال۔ جلد ۲۔ [2] ریاض الصالحین باب حرمات المسلمین۔
[3] ریاض الصالحین باب قضاء حوائج المسلمین [4] دلیل الفالحین بحوالہ ابوداؤد

وہ اللہ تعالیٰ کے آگے جواب دہ ہوگا۔

(ب) امیر و غریب کی خدمت

اسلام غریب و تونگر میں فریق بندی کی اجازت نہیں دیتا۔ دولت مند سے محض اس کی دولت کی وجہ سے بغض رکھنا حرام ہے۔ رہا غریب تو اسے محض غریبی کے سبب سے حقیر جاننا انسانیت سے بعید ہے۔

اسلام نے ضرورت کے وقت امیر و غریب سب کی خدمت کی تاکید کی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مبارکہ اس حقیقت کی ترجمان ہے۔ مدینہ کی کنیزیں بھی بعض دفعہ مدد کے لئے حاضر ہوتیں اور آپؐ کا دستِ مبارک تھام کر لے جاتیں۔ آپؐ انکار نہ فرماتے۔[1]

(ج) غیر مسلموں کی خدمت

ضرورت پڑنے پر غیر مسلم کی بھی مدد کرنی چاہیئے۔ سورۃ التوبہ میں ہدایت ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم تمہارے پاس پناہ کا طالب ہو کر آئے تو اسے پناہ دو، اللہ کا کلام سننے کا موقع دو، پھر اسے حفاظت کی جگہ پہنچا دو۔

(د) حیوانات کی خدمت

حیوانات کی خدمت اور حاجت روائی میں بڑا ثواب ہے۔ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ قصہ بیان فرمایا کہ ایک شخص سفر پر تھا۔ راستہ میں سخت پیاس لگی۔ ایک کنواں نظر آیا۔ اس میں اترا۔ پانی پی کر باہر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور پیاس کے مارے (کنوئیں کے کنارے کی) نم آلود مٹی چبا رہا ہے۔ مسافر نے (جی میں) کہا کہ اس کتے کا پیاس سے وہی حال ہوا ہے جو میرا تھا۔ دوبارہ کنوئیں میں اترا، (اس کے پاس برتن نہ تھا) اپنے موزے میں پانی بھرا۔ اسے منہ میں تھام کر باہر آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ عمل اس قدر منظور ہوا کہ اس کی مغفرت فرما دی۔ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ہمیں جانوروں کی خدمت کا بھی ثواب ملے گا؟ فرمایا، ہر ذی روح چیز کی خدمت میں ثواب ہے۔[2]

مستحقین کے مدارج

ویسے تو ہر ضرورت مند شخص تعاون کا مستحق ہوتا ہے لیکن اس کے استحقاق کے مدارج

---

[1] ریاض الصالحین باب التواضع۔ [2] ریاض الصالحین باب کثرۃ الطرق الخیر الحدیث العاشر۔

میں فرق ہے۔ مثلاً ایک ہی وقت دو محتاجوں کی مدد کے درمیان فیصلہ کرنا ہو تو متقی کو ترجیح دی جائے گی۔ اسی طرح بے کس لوگوں میں بعض ایسے ہیں جن کی بے کسی کے پیشِ نظر ان کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہے۔ ان میں یتامیٰ، بیوائیں اور معذور اشخاص نمایاں ہیں۔ جناب رسالب مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں میرے اس قدر قریب ہوگا جس قدر میری یہ دو انگلیاں[1] آپؐ کا ارشاد ہے کہ بیوہ اور مسکین کے لئے تگ و دو کرنے والا اس طرح ہے جس طرح اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا یا ناغہ نہ کرنے والا نمازی یا روزہ نہ چھوڑنے والا روزہ دار۔[2]

خدمتِ خلق اور اربابِ اقتدار:

بلند مناصب اور مال و دولت کے ساتھ تکبّر کا احتمال ہوتا ہے۔ اس کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حکمران طبقہ وقتاً فوقتاً خدمتِ خلق کے بعض عوامی امور میں حصہ لے۔ اس کا ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ ان کو دیکھ کر عوام میں بھی خدمت کا جذبہ پیدا ہوگا۔

حضرت عمرؓ جن دنوں خلیفہ تھے وہ مجاہدین کی محاذِ جنگ سے بھیجی ہوئی چٹھیوں کو ان کے گھروں پر تقسیم کرنے کے لئے بنفسِ نفیس تشریف لے جاتے اور ان کی چوکھٹ پر بیٹھ کر چٹھیاں تحریر کر دیتے۔ ایک بار مدینہ کے باہر گشت کر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک عورت نے ہنڈیا چڑھا رکھی ہے اور بچے پاس رو رہے ہیں۔ آپؓ نے عورت سے بچوں کے رونے کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ ان کے بہلاوے کو خالی ہنڈیا چولہے پر رکھ دی ہے آپ اسی وقت مدینہ آئے۔ بیت المال سے خورد و نوش کی اشیاء لے کر باندھیں اور غلام سے فرمایا کہ اٹھا کر میری پیٹھ پر رکھ دو، اس نے کہا، میں خود اٹھا لے چلوں گا۔ فرمایا، آج تو یہ بوجھ تم سنبھال لو گے، کل قیامت کے روز میرا بوجھ کون اٹھائے گا۔ آپ سامان اٹھائے واپس اس عورت کے پاس پہنچے۔ کھانا پکانے میں خود مدد کی۔ کچھ لمحات تک پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہو چکا تو بچوں نے سیر ہو کر کھایا۔

شروط | **۱۔ ایثار:** ایثار کے معنی ہیں، دوسرے کو خود پر ترجیح دینا۔ ایثار

---

[1] ریاض الصالحین باب کثرۃ الطرق الخیر الحدیث العاشر
[2] ریاض الصالحین باب ملاطفۃ الیتیم .... [3] ایضاً

کے جذبہ کے بغیر خدمت کا بوجھ اٹھایا نہیں جا سکتا۔ جبر کی خدمت کو خدمت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسے بیگار کہتے ہیں۔ ایثار کا جذبہ خدمت کا دیباچہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگوں کو پانی پلانے والا پینے میں سب سے آخر ہوتا ہے۔[۱] مراد یہ کہ پانی پلانا بڑی خدمت ہے لیکن اس کا حق جبھی ادا ہوتا ہے کہ آدمی ایثار کے جذبہ سے اپنی پیاس کو دبائے رکھے۔

(۲) احسان نہ جتانا :

جس نے احسان نہ جتایا اس نے گویا بھلائی اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں۔ کسی ذاتی غرض کے لئے کی تھی۔ اس کا کوئی اجر نہیں ہو سکتا۔ البتہ احسان جتانے سے دوسرے آدمی کو جو صدمہ پہنچا ہے، اس کا گناہ ہو گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے مدد دے کر احسان جتانے والے کو نامراد اور خسارہ مند بتایا ہے۔[۲] مراد یہ کہ اس کی نیکی اکارت گئی اور گناہ لازم ٹھہرا۔

ثمرات :

خدمتِ خلق کے دینی اور دنیوی ہر دو لحاظ سے بے شمار فوائد ہیں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی درج ذیل احادیث سے ثابت ہے :

(۱) جو اپنے بھائی کی حاجت روائی میں مصروف ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کا حاجت روا ہوا۔ جس نے مسلمان سے تنگی دور کی، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس سے تنگی دور کرے گا۔[۳]

(۲) اللہ تعالیٰ تمہارے ضعیف لوگوں کی وجہ سے ہی تمہیں رزق اور مدد دیتا ہے۔[۴]

۳۔ جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا سامان تیار کیا وہ غازی ہوا جس نے مجاہد کے بعد اس کے گھر والوں کی خبر گیری کی۔ اس نے جہاد کیا۔[۵]

(۴) ایک دفعہ ایک شخص نے رستہ سے خاردار شاخ ہٹا دی تو اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔[۶]

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جنت اس شخص کی مشتاق رہتی ہے جس نے اپنے مومن بھائی کی حاجت روائی میں سعی کی۔[۷]

(نوٹ : خدمتِ خلق پر مزید بحث اخوت کے زیرِ عنوان آئے گی)

---

[۱] ترمذی ابواب الاشربہ [۲] مسلم کتاب الایمان باب تحریم اسبال الازار۔ [۳] ریاض الصالحین باب قضاء حوائج المسلمین۔
[۴] دلیل الفالحین باب الیقین [۵] ریاض الصالحین باب فی التعاون ۔ ۔ ۔ ۔ الخ
[۶] ریاض الصالحین باب کثرۃ طرق الخیر ۶۹ [۷] کنز العمال ۲:۱۶۱ (حدیث ۶ : ۳۶)

سوالات

۱۔ خدمتِ خلق کی اہمیت کتاب وسنت کی روشنی میں بیان کیجئے۔

۲۔ خدمتِ خلق سے کیا مراد ہے؟ اس کا دائرہ کس حد تک وسیع ہے۔ (یا اس کے تحت کون کون سے امور آتے ہیں؟)

۳۔ خدمتِ خلق کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسوۂ حسنہ کیا تھا؟ واقعات اور ارشادات نبویہ سے وضاحت کیجئے۔

عائلی زندگی
کُنبہ

کُنبہ

مفہوم : کُنبہ یا گھر کا مفہوم اگرچہ کافی پھیلایا جا سکتا ہے اور اس میں غلام اور خادم بھی شامل سمجھے جا سکتے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر کنبہ میاں، بیوی اور اولاد پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس لئے خانگی زندگی کے نظریہ پر جب بحث کی جاتی ہے تو اس کے ارکان زوجین (میاں، بیوی) اور اولاد ہی سمجھے جاتے ہیں۔

نصب العین

خانہ داری کے مقاصد بلند اور کثیر ہیں۔ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے نصف دین قرار دیا ہے[1]

خانگی زندگی کے مختصراً حسب ذیل مقاصد ہیں :

(۱) بقائے ملت :

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کی بنیادی غرض بقائے ملت بتائی ہے اس بارہ میں آپؐ سے متعدد احادیث مروی ہیں۔

خلقت کے لحاظ سے انسان کے بچے سے بڑھ کر کسی حیوان کا بچہ ضعیف اور محتاج نہیں ہوتا۔ اسے کئی برس غور و پرداخت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مشکل اور ہمت آزما کام ہے۔ اس مہم کا بیڑا والدین ہی اٹھا سکتے ہیں اور اس کی کامیابی ایک منظم گھر ہی سے وابستہ ہو سکتی ہے۔

والدین کے سوا کون ہے جس کی جان اولاد کی جان میں ہو۔ والدین بچے کی پرورش میں پوری زندگی کا سرمایہ لگا دیتے ہیں۔ دن کا چین اور راتوں کا سکون اس پر قربان کر دیتے ہیں۔ اسے معمولی دکھ بھی ہو تو ساری خوشیاں بھول جاتے ہیں۔ وہ بیمار پڑ جائے تو رات رات بھر بے چین اور بے خواب رہتے ہیں۔ اس کا چہرہ پژمردہ ہو تو ان کی کائنات پر غم کے بادل چھا جاتے ہیں۔ وہ مسکرا اُٹھے تو ان کی زندگی کی فضا جھوم جاتی ہے۔ جس تن دہی اور جاں سپاری سے والدین بچے کی حفاظت اور نگہداشت کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ گھر گویا ایک مضبوط قلعہ ہے جس میں قوم کے نونہال

---

[1] الترغیب والترھیب۔ جزء ۳

بیرونی حوادث سے مامون ہوکر پروان چڑھتے ہیں۔ والدین اس قلعہ کے نگران اور پاسبان ہیں۔

(۲) اوّلین تربیت گاہ :

گھر بچّہ کی اوّلین تربیت گاہ ہے۔ کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کے جو انداز وہ بچپن میں سیکھتا ہے۔ ان کی بنیاد پختہ ہوتی ہے۔ بچپن میں مزاج اور حرکات و سکنات پر جو رنگ چڑھ جاتا ہے۔ وہ عمر بھر ساتھ دیتا ہے۔ اس کا بدلنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر خاندان کی اپنی روایات ہوتی ہیں۔ اس کے افراد زندگی کے کسی شعبہ میں ہوں وہ ان روایات کی جھلک دکھاتے رہتے ہیں۔

مسلمان والدین اپنی طرف سے حتی الوسع بچے کی نیک تربیت کرتے ہیں۔ اس کے دل میں ایمان کا نقش بٹھاتے ہیں، اسلام کی محبت پیدا کرتے ہیں اور اسے زندگی کے خوش نما اطوار سکھاتے ہیں۔ چنانچہ بچوں کو شروع ہی سے نماز کی پابندی سکھانے کا حکم ہے۔

قوم کی بقاء کا راز اس کے حُسنِ عمل میں ہے۔ حُسنِ عمل جبھی پیدا ہو سکتا ہے کہ تربیت عمدہ ہو۔ اچھی تربیت مکتب اور مدرسہ میں بھی مل سکتی ہے لیکن گھریلو ماحول اخلاق سے بیگانہ ہو تو استاد یا معلّم کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔ تربیت کی اصل بنیاد گھر ہی میں رکھی جا سکتی ہے۔

گھر کی زندگی انسان کو دنیا کی وسیع تر زندگی کی ذمہ داریوں کے قابل بناتی ہے۔ گھر چھوٹے پیمانے پر ایک ریاست ہے جس میں میاں صدر کی حیثیت میں اور بیوی مشیر کے طور پر کام کرتی ہے ان کے بچے اس ننھی سی ریاست کے باشندے ہوتے ہیں۔ یہاں کے قواعد اور پابندیوں کے خوگر ہو کر وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ریاستی قواعد اور قوانین کو خوشی سے قبول کر سکیں۔

(۳) اخلاقی طہارت اور کردار کا تحفّظ

اہلی زندگی اختیار کرنے کے بعد مرد اور عورت کئی فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ عورت تو گویا اخلاقی قلعہ میں مامون ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نکاح کے لئے ایک لفظ اِحصان بھی ہے۔ اِحصان کے معنی ہیں: قلعہ نشین کرنا، محفوظ کرنا۔ جناب رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اے جوانو! تم میں سے جو آدمی مَہر و نفقہ کی استطاعت رکھتا ہے وہ نکاح کرے کیونکہ یہ سب سے زیادہ نگاہ کو پاک رکھتا ہے اور عفت کی حفاظت کرتا ہے۔ جو شخص نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ روزے رکھے۔[1] آپؐ کی ایک اور حدیث ہے کہ جب کوئی نکاح کرتا

---

[1] الترغیب والترھیب جزء - ۳

ہے تو شیطان چیخ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا برا ہو۔ اس نے مجھ سے دو تہائی دین بچا لیا۔[1]

نیک خاوند اور نیک بیوی ایک دوسرے کا اخلاق سنوارنے میں اہم کردار انجام دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کی ہدایت فرمائی ہے کہ عورت کے انتخاب میں سب سے زیادہ ترجیح اس کی دینداری کو دو۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔[2]

والدین نیک ہوں تو اولاد پر بھی نیک اثر پڑتا ہے۔ بچے حسنِ سیرت اور حسنِ اخلاق سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ایسا گھر ماحول پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور تبلیغ کے ایک مرکز کا کام دیتا ہے۔

(۴) آسائش اور راحت ۔ آنکھوں کی ٹھنڈک !

سورۃ الروم میں ارشاد ہے :

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط (۳۰ : ۲۱)

ترجمہ : اور اس کی نشانیوں میں سے (ایک یہ) ہے کہ تمہاری جنس میں سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان کی جانب سکون پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔

نیک میاں بیوی اور نیک اولاد کو قرآن حکیم میں آنکھوں کی ٹھنڈک کہا گیا ہے۔ گھر اچھا اور منظم ہو تو میاں بیوی کے لئے آسائش اور راحت کی آغوش ہوتا ہے۔ میاں بیوی کا باہمی حسنِ سلوک جو قرار و سکون مہیا کرتا ہے وہ ڈھیروں دولت سے بھی میسّر نہیں ہوتا۔ جب والدین کو راحت اور سکون ہو تو یقیناً بچوں کی تربیت بھی خوشگوار ماحول میں ہوگی۔ جس بدنصیب گھر میں میاں بیوی کے درمیان فساد رہتا ہو وہاں بچوں کی تربیت بھی ناقص رہ جاتی ہے۔

ماں کی گود گلاب کی پتّی سے بھی زیادہ راحت بخش ہوتی ہے۔ اس کی محبّت بچّے کے ذہن و بدن میں زندگی کی برقی رَو پیدا کرتی ہے۔ جس کے بغیر صحیح نشوونما مشکل ہے۔ یہ محبّت تبسّم کی موج بن کر نظر آئے یا آنسو کی صورت ڈھلک جائے ہمیشہ نئی زندگی کا پیغام دیتی ہے۔

بچہ ماں باپ کے لئے جنّت کا مہکتا ہوا پودا ہے[3] نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] کنز العمال جلد ۸ ص ۲۳۸ (حدیث ۲۷۵۴)۔ [2] الترغیب والترھیب۔
[3] کنز العمال جلد ۸ ص ۲۳۷ (حدیث ۳۷۷۵)

نے فرمایا کہ اولاد کی بو جنت کی بو ہے[1] والدین اس پودے کو محنت سے سینچتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ اس کے لئے ہزار دکھ اٹھاتے ہیں۔ لیکن یہ جوں جوں بڑھتا ہے اسے دیکھ کر زندگی کے سارے رنج بھول جاتے ہیں۔

انسان کا گھر اس کی مشکلات اور مصائب میں پناہ گاہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ بیمار پڑ جائے تو گھر میں نہایت شفقت سے اس کی خبر گیری اور تیمار داری ہوتی ہے۔ اس پر غم آئے تو گھر کے سب افراد اس کے شریکِ حال ہو جاتے ہیں اور اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔

یوں تو زندگی بھر اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ کٹھن وقت کے لئے کوئی گوشۂ امن میسر رہے۔ لیکن بڑھاپے میں یہ ضرورت نہایت شدت کے ساتھ آموجود ہوتی ہے۔ ضعیفی کے ایام میں ایسی امن گاہ کے بغیر کیونکر گزر ہو سکتا ہے۔ جہاں بیماری یا ناچاری کے وقت ایسے تیماردار اور خدمت گزار موجود ہوں جو دل کی چاہ سے بغیر کسی طمع یا ظاہر داری کے خدمت کریں۔ یہ امن گاہ گھر کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے؟

(۵) ذمہ داری کا درس :

گھریلو زندگی کے فرائض انسان میں ذمہ داری کا احساس خوب اُجاگر کرتے ہیں۔ خانگی زندگی کے تقاضے حساس اور غیور مرد کو زیادہ محنت اور جانفشانی پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر وہ برسرِ کار ہو تو اور مستعد ہو جاتا ہے۔ بے کار ہو تو کہیں نہ کہیں سر ٹکراتا پھرتا ہے اور رزق کے نئے وسائل تلاش کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ قوم کی محنت کاری، وسائل اور سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کا نام لے کر محنت و مشقت اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کو پہنچتا ہے۔ سُورۃُ النُّور (آیت - ۳۲) میں ہدایت ہے کہ بن بیاہوں اور ان غلاموں اور لونڈیوں کے جو نکاح کے قابل ہیں نکاح کراؤ۔ اگر وہ محتاج ہیں تو ان کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

اس موضوع پر ہادیٔ اکبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واضح ارشادات ملتے ہیں۔ مثلاً :

(نکاح کے ذریعے رزق تلاش کرو)۔

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس احتیاج کی شکایت لے کر آیا۔ آپؐ نے فرمایا، نکاح کر۔[2]

---

[1] کنز العمال جلد ۸ ص ۲۳۸ (حدیث ۴۵۲۹) [2] تفسیر نیشاپوری، سورۃ النور۔

(۶) قومی دولت :

بچے قوم کا نہایت قیمتی بلکہ حقیقی سرمایہ ہیں۔ بڑے ہو کر قوم کی صفوں کو پُر کرتے ہیں۔ زندگی کے نو بہ نو میدان تلاش کرتے ہیں۔ علوم کو نئی شان دیتے ہیں۔ صنعت و حرفت کا دامن پھیلاتے ہیں۔ نئی نئی ایجادوں اور تجارت سے قومی سرمایہ میں اضافہ کرتے ہیں۔

(۷) آخرت کا توشہ :

اہلی زندگی کا ذمہ اٹھانا ایک عظیم دینی ذمہ داری سنبھالنے کے برابر ہے۔ جو شخص اس سے عہدہ برآ ہوا اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا انعام ہوگا۔ احادیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے روز کم سن بچے والدین کی شفاعت کریں گے۔

خانگی زندگی کی کامیابی کی شروط

خانگی زندگی جبھی کامیاب ہو سکتی ہے کہ اسے ایک دینی فریضہ سمجھا جائے اور اس ضمن میں درج ذیل امور کی خاص طور سے نگہداشت کی جائے۔

(۱) کامل اتحاد :

میاں بیوی میں کامل اتحاد اور تعاون چاہیئے۔ یہ تعاون چونکہ عمر بھر کے لئے مطلوب ہوتا ہے۔ اس لئے پختہ نیت سے ہو۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان طبعی محبت پیدا کر دی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ اس میں فرق نہ آنے دیں۔

(۲) فرائض کی صحیح تقسیم :

گھریلو زندگی میں فرائض کی صحیح تقسیم نہ ہو تو نظام میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے مرد اور عورت کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ مرد بیرونی دنیا کے لئے اور عورت خانگی فرائض کے لئے موزوں ہے۔ جہاں اس تقسیم کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ وہاں نہ میاں بیوی کو راحت ملتی ہے اور نہ بچوں کو سکھ نصیب ہوتا ہے۔ اولاد کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی اور وہ ذہنی اور اعصابی لحاظ سے مریض ہو جاتی ہے۔

(۳) اخلاقی پاکیزگی : اخلاقی پاکیزگی میاں بیوی کے اتحاد کو پختہ کرتی ہے اور اولاد

لہ تفسیر نیشاپوری، سُورَۃُ النور۔

سے ان کی عظمت تسلیم کراتی ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو خانگی زندگی کو انتشار و ناداری کے عالم میں بھی ذلت اور ابتری سے بچاتی ہیں۔

اہلی زندگی اختیار کرنے کی تاکید :

اہلی زندگی کا بوجھ ہمت کا طالب ہوتا ہے۔ بعض اشخاص اس کے تصور ہی سے گھبرا جاتے ہیں اور نکاح سے گریز کرتے ہیں۔ وہ قوم اور ملت کے خیر خواہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارہ میں تاکیدی ہدایات ارشاد فرمائی ہیں۔ مثلاً :

(۱) جو کوئی میرے اور داؤدؑ ، اور سلیمانؑ اور ابراہیمؑ کے دین پر ہے اس کی توفیق ہو تو نکاح کرے۔ [۱]

(۲) نکاح میری سُنت ہے جس نے اس سے منہ موڑا اُس نے مجھ سے منہ موڑا۔ [۲]

(۳) نکاح میری سُنت ہے جس کو میری فطرت سے محبت ہے وہ میری سُنت پر چلے۔ [۳]

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نکاح سنت انبیاء علیہم السلام ہے۔ اس سے فرار کرنا سنتِ انبیاء سے فرار کے برابر ہے۔

(۴) مباح چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے پسندیدہ چیز نکاح ہے [۴]

(۵) جو آدمی نکاح کا مقدور رکھتا ہو اور نکاح نہ کرے تو اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ [۵]

(۶) تیرا مسجد کی طرف چل کر جانا اور اہلِ خانہ کی طرف واپس آنا ثواب میں برابر ہیں۔ [۶]

قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھا جائے تو نکاح سے اجتناب کرنا تحریم حلّت یعنی حلال شے کو حرام گردانتا ہے۔

تحریم حلال فسق کے ہم معنی ہے۔

خانگی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی تاکید

اسلام میں خانگی فرائض بجا لانے کی ازبس تاکید ہے۔ اس بارہ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ

---

[۱] کنز العمال جلد ۸ صـ ۲۳۹ (حدیث ۳۷۷۹) [۲] احیاء العلوم جزء - ۲
[۳] ایضاً [۴] تفسیر نیشاپوری سورۃ النور [۵] الترغیب والترھیب جزء ۳ (حدیث ۱۳)
[۶] کنز العمال جلد ۸ صـ ۲۳۷ (حدیث ۳۷۲۵)

علیہ وآلہ وسلم کے چند ارشادات درج ذیل ہیں:

(۱) جب بندہ اپنے گھر والوں کے کسی کام سے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے عوض ایک درجہ لکھتا ہے اور جب وہ ان کی ضرورت سے فارغ ہو چکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کر دیتا ہے۔ [۱]

(۲) بندے کے (اعمال کے) ترازو میں جو چیز سب سے پہلے رکھی جائے گی۔ وہ اس کا اپنے کنبہ پر کیا ہوا خرچ ہوگا۔ [۲]

(۳) ایک دینار تو اللہ کی راہ میں خرچ کرے، ایک غلام آزاد کرنے میں، ایک مسکین کو دے اور ایک اپنے گھر والوں پر خرچ کرے تو ان میں سے سب سے زیادہ اجر اس دینار کا ہوگا جسے تو اپنے گھر والوں پر خرچ کرے۔ [۳]

(۴) تو بخشش کی ابتدا اپنے عیال سے کر۔ [۴]

(۵) وہ بیوہ عورت جو اولاد کی پرورش کا دکھ اٹھاتی ہے قیامت کے روز اس طرح میرے قریب ہوگی جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ [۵]

(۶) کیا تمہیں افضل صدقہ نہ بتاؤں؟ یہ وہ ہے جو تو اس بیٹی پر کرتا ہے جسے خاوند نے طلاق دی اور وہ تیرے گھر واپس آگئی اور اس کا تیرے سوا کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ [۶]

مشہور عالم عبداللہ بن مبارکؒ ایک بار جہاد میں شریک تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا، کیا تم جہاد سے بھی کوئی بہتر عمل جانتے ہو؟ جواب نفی میں ملا تو فرمایا، اس پرہیزگار شخص کا عمل جو کنبے والا ہو اور رات کو اٹھ کر سوتے بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ [۷]

سوالات

۱۔ عائلی زندگی سے کیا مراد ہے؟ اس کے اغراض و مقاصد قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کریں۔

۲۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں عائلی زندگی کی اہمیت بیان کریں۔

۳۔ عائلی زندگی کے بارے میں اسلام کے احکام بیان کیجئے۔

۴۔ سنت نبوی کی روشنی میں خانگی فرائض بجالانے کی فضیلت و اہمیت بیان کیجئے۔

---

[۱] کنز العمال جلد ۸ ص ۲۴۰ (حدیث ۲۷۹۱) [۲] کنز العمال جلد ۸ ص ۲۳۸ (حدیث ۲۷۵۲) [۳] ریاض الصالحین باب النفقۃ علی العیال [۴] ریاض الصالحین باب النفقۃ علی العیال [۵] مشکاۃ باب الشفقۃ [۶] مشکاۃ باب الشفقۃ۔ [۷] احیاء العلوم کتاب النکاح۔

حقوقِ اولاد

اولاد سے محبت میں اعتدال : اولاد کی محبت انسان کی فطرت میں ودیعت ہے اس جذبہ میں اس قدر شدّت ہے کہ اس کو اعتدال میں رکھنا ازبس مشکل ہے۔ اولاد کی محبّت کے ہاتھوں والدین زندگی بھر کٹھن امتحان میں مبتلا رہتے ہیں۔

ارشاد ہے : اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ (۱۵:۶۴)

ترجمہ : تمہارے اموال اور تمہاری اولاد (تمہارے لئے) بس ایک آزمائش ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے بعض دفعہ انسان کو اپنا سب سے قیمتی سرمایہ اس کی راہ میں قربان کرنا پڑتا ہے۔ اولاد انسان کی عزیز ترین متاع ہے۔ اس لئے بعض قدیم مذاہب نے انسان کو یہ راہ دکھائی کہ اولاد کو دیوتاؤں اور بتوں کی بھینٹ چڑھا دو۔ یہ دستور عرب میں بھی تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد عبداللہ کو بھی باپ نے بتوں پہ قربان کرنا چاہا تھا مگر پھر ان کی جان کے عوض سو اونٹوں کا نذرانہ دے دیا۔

اسلام اولاد کی محبت کا اظہار کسی غیر معتدل یا حدود فراموش صورت میں نہیں ہونے دیتا۔ نہ تو یہ کہتا ہے کہ اولاد چونکہ تمہاری محبوب ترین دولت ہے اس لئے اس کو اللہ کی راہ میں ذبح کر دو۔ اور نہ یہ اجازت دیتا ہے کہ بس اولاد کے ہو رہو اور اس کے آرام و آرائش اور ترقی و بہبود کے سامان پیدا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز رستہ اختیار کر دو۔ اسلام اعتدال اور میانہ روی سکھاتا ہے۔

والدین کے فرائض :

اولاد کے بارے میں والدین کے فرائض مختصراً درج ذیل ہیں :

(۱) پرورش :

طلوعِ اسلام سے قبل عربوں میں کہیں کہیں کم سن اولاد کے قتل کا رواج تھا۔ کبھی تو دیوتاؤں کو نذرانہ پیش کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے اور کبھی افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان سے پیچھا چھڑاتے تھے۔ لڑکیوں کے قتل کی محرک عام طور پر یہ ننگ ہوتی تھی کہ کوئی شخص ان کا داماد نہ کہلا سکے۔ اسلام نے ان مظالم کا قلع قمع کیا۔ اولاد کی قربانی قانوناً بند کی۔ جو لوگ فاقہ کے خوف سے بچوں کو ہلاک

کرتے تھے انہیں قرآن حکیم نے بتایا کہ تمہارا اور ان کا رزق رساں اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے افلاس کے خوف سے ان کی جان نہ لو۔ [۱] مقتول بچیوں کی مظلومیت کا قرآن حکیم نے وہ درد انگیز نقشہ کھینچا ہے کہ آنکھیں بے اختیار اشکبار ہو جاتی ہیں۔ [۲] دینِ اسلام نے بالخصوص لڑکیوں کی حیثیت کو انتہا پستیوں سے اٹھا کر عزت و احترام کے بامِ رفیع پر پہنچا دیا۔

اولاد کی پرورش کے ضمن میں قرآنِ حکیم نے یہ قانون دیا ہے کہ بچہ کی رضاعت دو برس تک لازماً ہو۔ ماں مر جائے یا طلاق لے کر الگ ہو جائے تو باپ دو برس تک رضاعت کا سامان کرے۔ رضاعت کی اہمیت اسلام نے اس قدر بڑھا دی کہ حرمت میں اس کا رشتہ حقیقی رشتہ کے برابر قرار دیا۔

لڑکی خلقاً ضعیف ہوتی ہے۔ عہدِ جاہلیت میں مصنوعی غیرت کی چکی میں بھی یہی پستی تھی، اس لئے اس کی پرورش کے بارے میں اسلام خصوصی تاکید کرتا ہے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

(۱) جس پر بیٹیوں کے بارے میں کوئی آزمائش آئی اور وہ ثابت قدم رہا تو وہ اس اور دوزخ کے درمیان آڑ ہوں گی۔ [۳]

(۲) جس نے دو بیٹیوں کو پالا وہ (حضورؐ نے دو ہاتھ کی انگلیوں کو ملا کر فرمایا) جنت میں میرے ہمراہ یوں داخل ہو گا۔ [۴]

(۳) جس کی دو یا تین بیٹیاں یا بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک رکھے تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔ [۵]

ایک عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ اس نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا۔ اُن کے پاس صرف ایک کھجور تھی، وہی دے دی۔ اس عورت نے کھجور کو دو ٹکڑے کر کے بچیوں پر بانٹ دیا اور چلی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لائے تو جناب عائشہؓ نے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا، جو شخص بچیوں کی آزمائش میں ڈالا گیا اور اس نے اُن سے اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ ہوں گی۔ [۶]

---

[۱] دیکھو سورۃ الانعام-۱۵۱ [۲] دیکھو سورۃ التکویر-۸، ۹ [۳] ترمذی، ابواب البر والصلہ
[۴] مسلم، ترمذی (ابواب البر والصلہ) [۵] ترمذی ایضاً [۶] ترمذی، ایضاً، بخاری

والدین کی طبعی محبّت اولاد کی پرورش کے لئے بظاہر کافی محرک نظر آتی ہے لیکن اسلام اسی پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ اسے ایک دینی فریضہ قرار دے کر اس کی مزید قوت پیدا کرتا ہے تاکہ اولاد کی پرورش میں کسر نہ رہ جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی ذاتی مثال اس باب میں کامل رہنمائی کرتی ہے۔ آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو فرطِ محبّت سے کھڑے ہو جاتے اور اپنی جگہ ان کو دیتے۔ ایک دفعہ اپنی نواسی کو عالمِ نزع میں دیکھا تو آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ ایک صحابی رضؓ پاس تھے، انہوں نے پوچھا، حضورؐ! یہ کیا؟ فرمایا، یہ اللہ تعالیٰ کا رحم ہے جو بندوں کے دل میں ڈال دیتا ہے۔[1] ایک دفعہ ایک بدّو سردار اقرع بن حابس حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے پاس بیٹھے تھے۔ آپؐ نے جناب حسنؓ کا بوسہ لیا۔ اقرع نے کہا، میرے دس بچے ہیں، اور میں نے ایک کا منہ بھی نہیں چُوما۔ آپؐ نے جواب دیا، جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔[2] آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی توقیر نہیں کرتا اس کا شمار ہم میں نہیں۔[3] حسنینؓ کے بارے میں آپؐ کی یہ دُعا ہے کہ اے اللہ! یہ مجھے عزیز ہیں۔ تو بھی انہیں عزیز جان اور جو ان سے محبّت رکھے اس سے محبّت رکھ۔[4]

ایک صحابیؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے حضور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو حالتِ نماز میں دیکھا۔ آپؐ کی نواسی حضرت اُمامہ بنت زینبؓ آپؐ کے کندھے پر تھیں۔ آپؐ جس وقت رکوع (اور سجدہ) میں جاتے تو انہیں زمین پہ بٹھا دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر کندھے پر اٹھا لیتے۔[5]

اسلام اولاد کی محبّت پر بہت تاکید کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس امر کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا کہ یہ محبّت دین کے تابع رہنی چاہیئے۔ والدین کے لئے اولاد کی بڑی اہمیّت ہے، مگر جیسا کہ سُورۃ الکوثر سے ظاہر ہے اولاد بھی کچھ نہیں۔ انسان کو اولاد کی محبت میں دینی تقاضوں کو نہیں بھولنا چاہیئے۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا کافر اور نافرمان تھا۔ جب طوفان آیا تو وہ بھی اس میں گِھر گیا۔ حضرت نوحؑ نے اسے پانی میں ڈبکیاں کھاتے دیکھا تو محبّت نے جوش مارا اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی۔ جواب ملا کہ یہ تیرے کنبہ سے نہیں۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ

---

[1] ایضاً [2] ریاض الصالحین باب تعظیم حرمات المسلمین [3] ترمذی ابواب البرّ والصلۃ [4] ترمذی ابواب المناقب [5] بخاری کتاب الادب مسلم کتاب الصلوٰۃ باب جواز حمل الصبیان۔

دینی تقاضوں کو اولاد پر مقدم رکھنا چاہیئے۔ جنگ بدر میں جو قیدی پکڑے گئے ان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضؓ کے شوہر ابوالعاص رضؓ بھی تھے جو اس وقت مشرک تھے۔ سب قیدیوں سے زرِ فدیہ طلب کیا گیا اور ابوالعاص کو بھی اتنی ہی رقم پیش کرنے کا حکم ہوا۔ ایک دفعہ حضرت فاطمہ رضؓ نے حضورؐ سے عرض کی کہ غنیمت کے قیدیوں سے مجھے ایک کنیز عطا فرمایئے۔ آپؐ نے انکار فرما دیا۔

(۲) تعلیم و تربیت :

اولاد کا والدین پر حق ہے کہ وہ انہیں عمدہ اور صالح تربیت دیں۔ قرآنِ حکیم میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے کو اور گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ [۱]

یعنی خود بھی نیکی کرو اور گھر کے افراد کو بھی نیکی سکھاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

کوئی باپ اپنے بچہ کو حُسنِ ادب سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا۔ [۲]

امام غزالی رح لکھتے ہیں کہ قیامت کے روز آدمی کو سب سے پہلے اس کے اہل و اولاد پکڑ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کریں گے اور کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! اس سے ہماری داد لے کیونکہ اس نے ہمیں ویسا ہی جاہل رہنے دیا جیسے ہم تھے اور ہماری بے خبری میں ہمیں حرام کھلایا۔ [۳]

اولاد کی پرورش اور تربیت کر کے انہیں کمائی کے لائق کرنا ایک عظیم دینی خدمت ہے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ اگر بچہ مسلم والدین پر خرچ کرے تو بچہ ہی کو نہیں، والدین کو بھی ثواب ملتا ہے۔ مُراد یہ کہ والدین کو ایک ثواب تو اس بات کا ملے گا کہ انہوں نے بچہ کو نیک تربیت دی جس کے نتیجے میں وہ والدین کی خدمت سے مشرف ہوا۔ دوسرا ثواب اس کارنامہ کا ہوگا کہ والدین نے اسے کمانے کا سلیقہ سکھایا۔ گویا یہ والدین ہی کی کمائی ہے۔

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نیک اولاد صدقۂ جاریہ ہے۔ جب تک وہ نیکی کریں، اور والدین کے لئے دعاگو ہوں والدین کی روح کو ثواب پہنچتا ہے۔ حدیث ہے کہ آدمی کا درجہ جنت

---

[۱] دیکھو سورۃ التحریم ۶۰ [۲] ترمذی، ابواب البر والصلہ

[۳] احیاء العلوم اٰفات النکاح و فوائدہ (جلد ۲ صـ ۳۴)

میں بلند تر ہو گا تو وہ کہے گا، اے میرے ربّ! یہ کہاں سے ہوا؟ جواب ملے گا کہ تیری اولاد نے تیرے لئے جو استغفار کیا یہ اس کی وجہ سے ہے۔[1]

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنی اولاد کو جس انداز سے تعلیم و تربیت دی وہ انسانیت کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ اسی حسنِ تربیت کا فیض تھا کہ حضرت عائشہ رضؓ ایسی زیرک اور ذہین و فطین ہستی نے بھی اعتراف کیا کہ جناب فاطمۃ الزہراؑ سب عورتوں سے بڑھ کر دانا ہیں۔ جناب عائشہ رضؓ کا کہنا ہے کہ میں نے کوئی نہیں دیکھا کہ نشست و برخاست کے سکون و وقار اور اسلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی طرح مشابہت رکھتا ہو۔[2] حضرت علیؑ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے دامنِ تربیت میں پروان چڑھے تھے۔ ان کے شب و روز میں عالمِ انسانیت کے لئے ایک دائمی اور ایمان افروز درس کا سامان ہے۔ یہی کیفیت جناب حسنؑ و حسینؑ کی پاکیزہ زندگیوں کی ہے۔

(۳) اولاد کے درمیان عدل:

والدین کا فرض ہے کہ اولاد کے درمیان مکمل مساوات رکھیں۔ اسلام کی نگاہ میں لڑکے اور لڑکی یا چھوٹے بڑے کی کوئی ظالمانہ تمیز نہیں۔ تورات اٹھا کر دیکھئے تو اس پہ پہلوٹھے کی ترجیح کا حکم ملے گا۔ یورپ کے جن ممالک میں نوابی کا دور ہے وہاں آج تک یہ قانون ہے کہ بڑے بیٹے کو جائیداد میں زیادہ حصہ ملتا ہے۔ اسلام اس عدم توازن کو مٹاتا ہے آج پوری دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو لڑکی کو والدین کے ترکہ میں شریک ٹھہراتا ہے۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے اپنے ایک بیٹے کو غلام ہبہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں آکر چاہا کہ اس معاملہ میں آپؐ کی گواہی ہو جائے۔ آپؐ نے پوچھا، کیا دیگر بچوں کو بھی ایک ایک غلام دیا ہے؟ عرض کیا، نہیں۔ فرمایا، تو میں اس کا شاہد نہ بنوں گا اسے واپس کر دو۔[3]

سوالات

۱۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اولاد کے حقوق متعین کیجئے۔

۲۔ اسلام نے والدین کے کن حقوق پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ قرآن و حدیث سے حوالے دیکر بیان کریں۔

---

[1] کنز العمال جلد ۸ صہ ۲۳۸ (حدیث ۳۷۳۶) [2] ترمذی ابواب المناقب۔ ادب المفرد بخاری

[3] کنز العمال جلد ۸ صہ ۳۱۱ (حدیث ۔ ۵۲۶۴ ، ۵۲۶۷)

حقوقِ والدین

والدین کے اولاد پر اس قدر احسانات ہوتے ہیں کہ اولاد ان کی خدمت میں تمام زندگی بھی کھپا دے تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔ والدین جب بچوں کے دکھ بھرتے ہیں تو ساتھ ہی بڑی امنگوں سے ان کی درازیٔ عمر کے لئے بھی دعا مانگتے ہیں۔ لیکن جب والدین کا بڑھاپا اپنے جلَو میں ناتوانیوں اور بیماریوں کی قطار لے کر آتا ہے تو بے شک اکثر اولاد ان کی خدمت کو عین سعادت سمجھتی ہے۔ مگر کتنے بچے اور کتنی بچیاں ہیں جو صدقِ دل سے ان کی لمبی عمر کے لئے دعا گو ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

کوئی اولاد اپنے والدین کا اجر ادا نہیں کر سکتی۔ سوائے اس کے کہ والدین کسی کے غلام ہوں اور انہیں خرید کر آزاد کر دے۔[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کلام کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے نماز و زکوٰۃ اور والدہ سے حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔[2]

والدین کی بے لوث محبت اور ایثار اس وقت سے بچّے کے لئے وقف ہو جاتا ہے جب وہ ابھی شکمِ مادر میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد زندگی بھر جب تک والدین کے دم میں دم ہوتا ہے۔ وہ بچہ کے آرام و آسائش اور تربیت و ترقی میں کوشاں رہتے ہیں۔ اولاد کی خوشی ان کی خوشی اور اولاد کا غم ان کا غم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے احسانات کا اندازہ انسانی قدرت سے باہر ہے۔ ان احسانات کا کمترین حق یہ ہے کہ اولاد اپنا جان و مال ان کے لئے وقف کر دے۔

والدین کے حقوق کا اعتراف سب ادیان نے کیا ہے مگر یہ خصوصیت اسلام ہی کو حاصل ہے کہ جہاں محبت کے قدرتی سوتے بہت جوش زن ہوں وہاں ان کے حدِّ اعتدال سے نکلنے پر بندشیں لگا دی ہیں تورات یہ کہتی ہے کہ جو شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے اس کو مار ڈالا جائے۔ اسلام اس افراط کی طرف تو نہیں جاتا مگر یہ ضرور کہتا ہے کہ جو شخص اپنے باپ سے انکار کرے وہ دوزخی ہے۔

---

[1] مسلم کتاب العتق [2] دیکھو سورۃ مریم

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی غیر کو اپنا باپ بنایا اور وہ جانتا ہے کہ یہ میرا باپ نہیں تو اس پر جنت حرام ہوگی۔ نیز فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی اس کے فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ قیامت کے روز اس سے کوئی حیلہ یا عوضانہ قبول نہ ہوگا۔[1] باپ اگر بیٹے کو قتل کر ڈالے تو اسے چاہے کوئی دیگر سزا دی جائے لیکن اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔[2] یعنی اسے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ کون باپ ہے جو بیٹے کا خون جان بوجھ کر کرائے اور اگر کوئی ایسا سنگدل ہو بھی تو شک کا فائدہ اٹھا کر قصاص سے بچ جائے گا۔

والدین کے حقوق | اہمیت اور وسعت:

والدین کے حقوق نہایت اہم اور کثیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں کئی جگہ والدین کے حق کا ذکر اپنے حق کے ساتھ کیا ہے۔

جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے بعد خدمتِ والدین کا درجہ بتایا ہے۔ اور اس کے بعد جہاد کا۔ (ریاض الصالحین)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میرے پاس مال ہے اور صاحبِ اولاد ہوں اور میرا باپ میرے مال کو اڑانا چاہتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، تو بھی اپنے والد کے طفیل ہے اور تیرا مال بھی۔[3] اس فرمان کے پیشِ نظر بعض اہلِ علم صحابۂ کرامؓ کا فتویٰ ہے کہ باپ پر اپنی اولاد کے مال میں سے خرچ کرنے کی کوئی پابندی نہیں۔[4] بہرحال اس بات پر اتفاق ہے کہ والدین نادار ہوں تو اولاد پر ان کا خرچ اٹھانا فرض ہے۔

والدین کا تعلق اور سب تعلقات پر بھاری ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایسی نوبت آجائے کہ بیوی کا وجود اپنے اور والدین کے درمیان دیوار بن رہا ہو اور اصلاح کی کوئی تدبیر نہ بنتی ہو تو بعض صورتوں میں بیوی کو طلاق دینے کا حکم ہے۔ حضرت عمرؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ کی ایک چہیتی بیوی تھی۔ حضرت عمرؓ اس کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے بیٹے کو طلاق کا حکم دیا۔ بیٹے نے انکار کیا اور اس

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین
[2] ترمذی ابواب الدیات
[3] ابوداؤد۔ ابن ماجہ ابواب التجارات
[4] ترمذی ابواب الاحکام

کا ذکر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا، جبداللہ! بیوی کو طلاق دے[1] والدین غیر مسلم ہوں تو جب بھی ان کے حقوق میں کمی نہیں آتی۔ ہاں جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے امورِ دین میں ان کی متابعت نہ کی جائے[2] ان کو اسلام کی تبلیغ ہوتی رہے کیونکہ یہی ان کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

والدہ کا مقام :

ایک دفعہ ایک صحابیؓ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور پوچھا کہ میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا، تمہاری ماں۔ سائل نے پوچھا پھر؟ حضورؐ نے فرمایا، تمہاری ماں۔ اس نے کہا، اس کے بعد؟ فرمایا، تمہاری ماں۔ اس نے پوچھا، اس کے بعد؟ فرمایا، تمہارا باپ اور اس کے بعد درجہ بہ درجہ قرابت دار۔[3]

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں کے حقوق باپ کے حقوق سے فزوں تر ہیں۔ اولاد کی پرورش میں جس قدر جانفشانی پیش آتی ہے۔ اس کا غالب حصّہ والدہ کے نصیب میں ہوتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے :

جنّت ماں کے پاؤں میں ہے۔[4]

والدین کے حقوق کا ذیل میں مختصر جائزہ لیا جائے گا۔

(۱) محبت و احترام :

والدین سے محبت اور ان کا احترام درجۂ کمال پر چاہیئے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے ساتھ ہی والدین سے حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ...	"تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ ...	عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی اور والدین کے ساتھ
عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا ...	نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی
فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا	ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں

---

[1] ترمذی کتاب الطلاق
[2] دیکھو سورۃ العنکبوت - ۸
[3] ترمذی ابواب البر والصلہ - مسلم - بخاری کتاب الادب
[4] الترغیب والترھیب صـ۳۱۶ کنز العمال جلد ۸ صـ۲۷۹ حدیث ۴۷۵۱

وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا

(سورۃ بنی اسرائیل: ۲۳ تا ۲۴)

اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحمت کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔"

ان آیات کریمہ سے ظاہر ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے والدین کے بڑھاپے کے لئے ذیل کی ہدایات خصوصیت سے دی ہیں:

انہیں حرفِ افسوس (مثلاً اُف یا ہوں وغیرہ) تک نہ کہو۔

انہیں مت ڈانٹو۔

اُن سے مؤدبانہ کلام کرو۔

اُن کے سامنے رحمت آمیز نیازمندی سے رہو۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے لئے رحمت کی دُعا مانگتے رہو۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی والدہ ماجدہ آپؐ کے بچپن میں وفات پاگئی تھیں۔ آپؐ کی کنیز اُمِّ ایمن رضؓ نے آپؐ کی مادرانہ خدمت کی۔ حضورؐ جب انہیں دیکھتے تو امی کہہ کر پکارتے اور فرماتے کہ یہ میرے گھرانے کا بقیہ ہیں۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ کے بعد اُمِّ ایمنؓ ہی میری والدہ ہیں۔ ایک بار حضرت اُمِّ ایمنؓ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھا۔ کہ آپؐ پانی پی رہے ہیں۔ انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ مجھے پانی پلایئے۔ حضرت عائشہؓ بولیں، کیا تم حضورؐ کو ایسا کہتی ہو۔ اُمِّ ایمنؓ نے کہا، تم نے مجھ سے زیادہ مدت حضورؐ کی خدمت نہیں کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، یہ سچ کہتی ہیں۔ آپؐ پانی لائے اور اُمِّ ایمنؓ کو پلایا۔[1]

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رضاعی ماں حضرتِ حلیمہؓ تشریف لائیں۔ حضورؐ نے اُن کے بیٹھنے کے لئے اپنی چادر بچھا دی۔[2]

حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنے والدین پر شفقت کی نظر ڈالتا ہے اس کے لئے ایک مقبول حج لکھا جاتا ہے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۵ صـ۲۲۶ - باب اُمّ ایمن علیہا السلام [2] ابوداؤد جزء ۲ (برّ الوالدین)

والدین کے احترام کے ضمن میں یہ بھی لازم ہے کہ آدمی دنیا میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرے کہ اس کے والدین کا اہلِ دنیا احترام کریں۔ اسے چاہیئے کہ نیکوکار ہو، دوسروں کے والدین کی تعظیم کرے اور ان کی گستاخی نہ کرے۔ ایک دن پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا، آدمی کا اپنے والدین کو بُرا کہنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ صحابہ رضؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا مرد اپنے ماں باپ کو بُرا کہتا ہے؟ فرمایا، ہاں وہ کسی باپ کو بُرا کہتا ہے تو وہ اس کے باپ کو بُرا کہتا ہے اور وہ اس کی ماں کو بُرا کہتا ہے تو وہ (جواباً) اس کی ماں کو برا کہتا ہے۔[1]

(۲) فرمانبرداری

سوائے اس صورت کے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ والدین کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی روا نہیں۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا فرمان ہے کہ اگر والدین تجھے کنبہ اور دُنیا سے نکل جانے کا حکم دیں تو جب بھی ان کی نافرمانی نہ کر۔[2]

(۳) خدمت:

اولاد پر فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کی خدمت کرے، اپنی کمائی میں سے ان کی ضروریاتِ زندگی احسن طریقے سے اور خوش دلی کے ساتھ پوری کرے۔ قرآن کریم میں دوسروں پر اپنی کمائی میں سے خرچ کرنے کے ضمن میں سب سے پہلے والدین کا ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلْ
مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ
وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ

(البقرۃ ۲۱۵)

"لوگ آپ سے پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں، کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتہ داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہو گا۔

بعض حالات میں والدین کی خدمت جہاد سے بھی بالاتر ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں ایک شخص جہاد کی اجازت لینے آیا۔ آپؐ نے فرمایا، کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا، ہاں۔ فرمایا، تو واپس جا اور ان کی خدمت میں جہاد (یعنی پوری کوشش) کر۔[3] ایک شخص آیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں

---

[1] بخاری، ترمذی، ابن ماجہ [2] الترغیب والترہیب ۳: ۲۲۹ حدیث ۱۳
[3] ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین

عرض کی کہ میں اپنے ماں باپ کو روتا چھوڑ کر آپؐ کے پاس ہجرت کی بیعت کرنے آیا ہوں۔ فرمایا، ان کے پاس واپس جا اور جیسے ان کو رلایا ہے ویسے انہیں ہنسا۔ [1]

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے والدین کا مطیع ہوا اس کے لئے جنت کے دو دروازے کشادہ ہو گئے اور اگر (والدین میں سے) ایک ہو تو ایک (دروازہ)۔ اور جو شخص والدین کے حق میں نافرمان ہوا تو اس کے لئے دوزخ کے دو دروازے کشادہ ہو گئے۔ اور اگر (والدین میں سے) ایک ہو تو ایک (دروازہ)۔ ایک آدمی نے عرض کیا، چاہے انہوں نے اس پر ظلم کیا ہو؟ فرمایا، چاہے انہوں نے اس پر ظلم کیا ہو، چاہے انہوں نے اس پر ظلم کیا ہو، چاہے انہوں نے اس پر ظلم کیا ہو۔ [2]

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے اس قول پر آمین کہا کہ پرے ہو وہ شخص جس کے سامنے اس کے ماں باپ بوڑھے ہوئے اور اسے جنت میں داخل نہ کیا۔ [3] مراد یہ کہ اسے خدمت کا موقع ملا، لیکن اس موقع سے کام نہ لیا اور جنت کھو دی۔ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا، خوار ہوا، پھر خوار ہوا، پھر خوار ہوا وہ شخص جس نے ماں باپ دونوں کا یا ان میں سے ایک کا بڑھاپا دیکھا اور جنت میں داخل نہ ہوا۔ [4] مراد یہ کہ ان کی خدمت نہ کی اور دوزخ کا سزاوار ہوا۔

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟ فرمایا، وہ تیرے جنت و دوزخ ہیں [5] مطلب یہ کہ ان کی رضا حاصل کر لو تو جنت میں جاؤ گے۔ اور اگر رضا سے محروم رہ گئے تو دوزخ میں مقیم ہو گے۔ آپؐ کا قول ہے کہ رب کی رضا والد کی رضا میں ہے اور رب کی ناراضی والد کی ناراضی میں۔ [6]

اللہ تعالیٰ کے ہاں والدین کی خدمت کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کا اندازہ دلانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ ایک حکایت بیان فرمائی کہ اگلے وقتوں میں تین آدمی اکٹھے جا رہے تھے کہ انہیں بارش نے آلیا۔ وہ مڑے اور پہاڑ کے ایک غار میں پہنچے۔ پہاڑ سے ایک چٹان گر کر غار کے دہانہ پر آئی اور انہیں بند کر دیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا

---

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد
[2] مشکاۃ
[3] الترغیب والترہیب جزء ۳ صـ ۴۱۹
[4] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم
[5] ابن ماجہ، ابواب الآداب
[6] ترمذی ابواب البر والصلہ

تم نے اللہ تعالیٰ کے لئے جو نیک کام کئے ہیں۔ انہیں سوچو اور اُن کے توسّل سے اللہ کو پکارو، شاید وہ اس چٹان کو دور کر دے۔ ان میں سے ایک نے کہا، اے ہمارے اللہ! میرے والدین بہت بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میں ان کی خوراک کے لئے بکریاں چراتا تھا۔ جب شام کو مویشی گھر لاتا اور دودھ دوہتا تو بچوں سے پہلے والدین کو پلانا شروع کرتا۔ ایک دن میں درختوں میں دور نکل گیا اور شام سے پہلے نہ آسکا۔ میں نے دیکھا کہ والدین سو گئے ہیں۔ میں نے پہلے کی طرح دودھ دوہا اور لے کر آیا۔ ان کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ میں انہیں جگانا نہ چاہتا تھا اور نہ ان سے پہلے بچوں کو پلانا چاہتا تھا۔ بچے میرے قدموں میں بلبلا رہے تھے۔ میں اور وہ اسی حال میں رہے حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ اب تو جانتا ہے کہ میں نے تیری خاطر یہ کام کیا تو ہمارے لئے کچھ جگہ کھول دے کہ ہم اس سے فضا دیکھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جگہ کھول دی۔ اس کے بعد حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح باقی دو آدمیوں کی دعا سے چٹان رستہ سے ہٹ گئی۔[1]

والدین کی نافرمانی کو حدیث میں سب سے بڑے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے[2] اور بتایا گیا ہے کہ والدین کی نافرمانی کی عقوبت انسان کو اس زندگی ہی میں گھیر لیتی ہے۔[3]

(۴) والدین کی ناراضی سے بچنا:

انسان کو والدین کی ناراضی سے بچنا چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین دعائیں بے شک قبول ہوتی ہیں۔ مظلوم کی دُعا، مسافر کی دُعا اور والد کی دُعا بیٹے پر۔[4] یعنی والدین کی دُعا ہو یا بددُعا اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔

(۵) والدین کے اقارب سے سلوک:

جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والدین ہی کی محبت اور خدمت گزاری پر تاکید نہیں کی بلکہ ان کے اقارب کی محبت اور خدمت گزاری کی بھی تاکید فرمائی ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارہ میں فرمایا کہ جس نے میرے چچا کو ایذاء دی اس نے مجھے ایذاء دی۔ چچا باپ کے مثل ہوتا ہے۔[5] ایک بار آپؐ نے حضرتِ عباسؓ کی زکوٰۃ اپنے پاس سے دی اور فرمایا کہ چچا بھی تو باپ کے مثل ہوتا ہے۔[6]

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الآداب [2] ترمذی، کتاب البر والصلہ، بخاری کتاب الشہادۃ، کتاب الادب
[3] الترغیب والترہیب جزء ۳ صـ ۳۳۱ [4] ترمذی ابواب الدعوات
[5] ترمذی، ابواب المناقب [6] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فی تقدیم الزکوٰۃ

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے، کیا میرے لئے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ آپؐ نے پوچھا، کیا تیری ماں (زندہ) ہے؟ بولا، نہیں۔ پھر پوچھا، کیا تیری خالہ ہے؟ جواب دیا، ہاں۔ آپؐ نے فرمایا، تو اس سے نیکی کر۔[1]

(۶) والد کے دوستوں اور والدہ کی سہیلیوں سے سلوک:

والد کے دوستوں کو چچا کے برابر اور والدہ کی سہیلیوں کو خالہ کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بہترین نیکی یہ ہے کہ والد کے تعلقات کو زندہ رکھا جائے۔[2]

(۷) والدین کی موت کے بعد:

والدین کی خدمت گزاری کا حق ان کی زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہوتا، بعد میں بھی جاری رہتا ہے۔ اولاد کی نیکی کا ثواب والدین کو بھی پہنچتا ہے۔ اس لئے والدین کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ انسان نیک ہو کر رہے تاکہ جنت میں ان کے درجات بلند ہوں۔

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور پوچھا، کیا والدین کا بھلائی کا حق ان کی وفات کے بعد بھی ادا کرنے کو رہ جاتا ہے۔ فرمایا، ہاں۔ ان کے لئے نماز پڑھ اور دعائے مغفرت کر، ان کے وعدوں کو پورا کر، ان کے قرابت داروں سے رشتہ رکھ اور ان کے دوستوں کی تعظیم کر۔[3]

ثمرات:

جو شخص صدق دل سے والدین کی خدمت کرتا ہے۔ اس کے دونوں جہاں سنور جاتے ہیں۔ دنیا میں کامیاب اور سرخرو ہوتا ہے اور آخرت میں جنت کا حق دار ہوتا ہے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ باپ جنت کا درمیانہ دروازہ (یعنی بڑا یا صدر دروازہ) ہے تو چاہے تو اسے ضائع کر دے اور چاہے تو اس کا دھیان رکھے۔[4]

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ
[2] ریاض الصالحین باب فضل بر اصدقاء
[3] ایضاً
[4] ریاض الصالحین باب بر الوالدین ...

زَوجَین

مفہوم : زوج کے معنی ہیں جوڑا۔ مذکر و مؤنث یعنی میاں بیوی ہر دو کے لئے مکمل ہے۔ اس کی جمع ازواج ہے۔ زوجین کے معنی ہیں دو زوج یعنی میاں بیوی۔

رشتۂ زوجیت کی اہمیت :

والدین اور اولاد کے بعد قوی ترین رشتہ زوجین کا ہے۔ ویسے ایک لحاظ سے اس رشتہ کو سب رشتوں پر تقدم حاصل ہے کیونکہ یہ رشتہ باقی رشتوں کی اصل ہے۔

رزق میں فراخی کا موجب :

اسلام نے رشتۂ زوجیت کو رزق میں فراخی کا موجب قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے :

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

(سورۃ نور : ۳۲)

"اور تم میں سے جو لوگ مجرّد ہوں اور تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو نیکوکار ہوں ان کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ وسعت والا اور خوب جاننے والا ہے۔"

راحت و سکون کا ذریعہ :

نکاح صرف رزق میں فراخی اور معاشی خوشحالی کا ہی موجب نہیں بلکہ یہ نفسیاتی تسکین اور آسودگی کا بھی ذریعہ ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے اور علمائے نفسیات کی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ جو شخص جنسی جذبات کی تسکین سے محروم ہوتا ہے وہ ابنارمل ہو جاتا ہے اور جنسی جذبات کی مکمل اور صحیح تسکین کا ذریعہ صرف رشتۂ زوجیت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی ہے۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔" (سورۂ روم : ۲۱)

ساری کائنات کی روح رواں :

دیکھا جائے تو زوجین کا رشتہ ساری کائنات کی روح رواں ہے۔ کائنات کا یہ کارخانہ جوڑوں کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (۵۱ : ۴۹)

ترجمہ : اور ہر چیز کے پیدا کئے ہم نے دو جوڑ

میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں :

نکاح اہلی زندگی کا سرآغاز ہے۔ اسی سے نوع انسانی کا سلسلہ آگے چلتا ہے۔ یہ وہ عنوان ہے جس کے بغیر ابن آدم کی بدنی اور روحانی تسکین کی داستان پریشان ہو کر رہ جائے۔

میاں بیوی میں جو تعلق اور وابستگی پائی جاتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے انسان اور لباس سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تعلق انتہائی قرب اور اپنایت کا ہے۔ ارشاد ہے :

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ (۲ : ۱۸۷)

ترجمہ : وہ تمہارا لباس ہیں اور تم اُن کا لباس ہو۔

اس عبارت سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں :

(۱) جس طرح انسان اور لباس کے درمیان کامل اپنائیت ہوتی ہے اور کوئی چیز ان کے درمیان حائل نہیں ہوتی۔ اسی طرح میاں بیوی کے درمیان پوری یگانگی پائی جاتی ہے۔

(۲) جس طرح انسان کا لباس کے بغیر گزارہ مشکل ہے، اسی طرح میاں بیوی کی گزران بھی ایک دوسرے کے بغیر دشوار ہے۔

(۳) جس طرح لباس موسم کی سختی سے بچاتا ہے، اسی طرح میاں بیوی بھی مصائب کے سامنے ایک دوسرے کی ڈھال ہوتے ہیں۔

(۴) لباس انسان کی ستر پوشی کرتا ہے، بے حیائی سے بچاتا ہے اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح میاں بیوی بھی ایک دوسرے کی عزت و ناموس کے پاسبان ہوتے ہیں۔ اور لوگوں کی نگاہوں میں گرنے نہیں دیتے۔

(۵) صاف ستھرا اور بدن زیب لباس دل کو فرحت دیتا ہے، اسی طرح پاکباز اور دیندار میاں بیوی کو ایک دوسرے سے فرحت اور تسکین حاصل ہوتی ہے۔ سورۃ الروم میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زوجین کی تخلیق اس لئے کی ایک دوسرے سے سکون پائیں اور (لہٰذا) ان

میں رحمت اور محبت پیدا کردی ہے۔

(۶) لباس زندگی کے کارزار میں دشمن کے وار سے بچاتا ہے۔ زرہ بھی اس اعتبار سے لباس ہے۔ میاں بیوی دشمن کے مقابل ایک دوسرے کی زرہ ہیں۔ زرہ جب تک خود کٹ نہ جائے، بدن کو زخم نہیں پہنچانے دیتی۔

میاں بیوی کے درمیان زندگی بھر کا نباہ مطلوب ہے۔ یہ نباہ محبت، شفقت اور جاں نثاری کا طالب ہے۔ اچانک بھڑک کر یا کوئی ناگواری دیکھ کر تعلقات توڑ لینا آئینِ وفاداری نہیں۔ سُورَۃُ النِّسَاء (آیت ۔ ۱۹) میں یہ ہدایت آئی ہے کہ بیوی کے ساتھ اچھی گزران کرو۔ اگر کسی کو اپنی بیوی پسند نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ تمہیں کوئی چیز ناگوار ہو اور اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لئے خیرِ کثیر رکھ دے۔

میاں بیوی ایک دوسرے کی ناگواریوں کو سہیں تو ان کے لئے بڑا درجہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس مرد نے اپنی بیوی کی بدمزاجی پر صبر کیا اسے ویسا ہی اجر ملے گا جیسا حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کی آزمائش پر ملا تھا اور جس عورت نے اپنے خاوند کی بدمزاجی پر حوصلہ کیا اسے ویسا ہی اجر ملے گا جیسا فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کو ملا تھا[1] حضرت آسیہ اگرچہ فرعون کی بیوی تھیں لیکن صاحبِ ایمان تھیں۔

زوجین کے مراتب:

اللہ تعالیٰ نے احترام کے لحاظ سے مرد اور عورت دونوں کا درجہ برابر رکھا ہے۔ ان کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کا حق نہیں۔ نہ خاوند کو اجازت ہے کہ بیٹھے بٹھائے بیوی کو پیٹنا شروع کردے اور نہ بیوی کو اس پر ہاتھ اٹھانے کی رخصت ہے۔ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کا احترام ہونا چاہیئے۔

عورت اور مرد کی مساوات احترامِ انسانیت کے نقطۂ نظر سے ہے۔ انتظامی لحاظ سے مساوات ناممکن ہے۔ کنبہ کا سربراہ ان دونوں میں سے ایک ہی ہوسکتا ہے ورنہ عین ممکن ہے گھر فتنہ و فساد کا اکھاڑہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انتظامی امور کی سربراہی مرد کو دی ہے۔ قرآن حکیم میں بتایا گیا ہے کہ مرد عورتوں پر قوّام (نظام قائم کرنے والے یعنی سربراہ) ہیں۔

سُورَۃُ البقرۃ کی آیت ۲۲۸۔ سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے جیسے فرائض ہیں ویسے ہی حقوق بھی ہیں تاہم مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے۔

---

[1] احیاء العلوم، کتاب النکاح۔

زمامِ کار اگرچہ مرد کے ہاتھ میں ہے لیکن اسے عورت پر ناروا سختی کی اجازت نہیں۔ عورت صنفِ نازک ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے آبگینہ سے تشبیہ دی ہے۔[۱]

زوجین میں خاوند کا مرتبہ بلند تر ہے تو والدین میں ماں کا درجہ بالاتر ہے۔ اس لئے احترام اور شرف کے نقطہ نظر سے میاں بیوی میں برتری کا پہلو ڈھونڈنا بے کار ہے۔

حقوق و فرائض:

حدیث میں زن و شوھر کے فرائض کی مختصر تعیین یوں آئی ہے کہ مرد اپنے اہل بیت کا پاسبان ہے اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد کی پاسبان ہے۔[۲]

مرد کا کام خانہ داری کا ساز و برگ مہیا کرنا ہے۔ گھر کے سربراہ کی حیثیت میں اس کے کندھے پر گراں بار ذمہ داریاں ہیں۔ اس کو کمائی کا سارا بوجھ خود اٹھانا ہے۔ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ اس کمائی کو خانگی ضرورتوں میں ٹھکانے سے خرچ کرے، اور بال بچوں کی پرورش سنبھالے۔

میاں بیوی دونوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے پورا تعاون کریں۔ ہر لمحہ کے مونس، ہمدرد اور جاں نثار ہوں۔ گھر کے راز محفوظ رکھیں اور ایک دوسرے کی آبرو کے پاسبان ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز بدترین شخص وہ ہوگا جو بیوی کا شریکِ راز ہو اور اس نے بیوی کا راز کھول دیا۔[۳] زن و شوہر کا حسنِ سلوک کس قدر اہمیت رکھتا ہے، اس کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ طرفین صلح و صلاح کی خاطر اگر بے ضرر جھوٹ بھی بول دیں تو اسلام اسے روا جانتا ہے۔[۴]

اب ہم زوجین کے حقوق کو مختصر طور سے الگ الگ دیکھتے ہیں:

خاوند کے حقوق (بیوی کے فرائض)

خاوند کے جو حقوق ہیں وہی بیوی کے فرائض ہیں۔ خاوند کے حقوق کی ہمہ گیری جناب سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے بخوبی اجاگر ہوتی ہے کہ اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ (سوائے اللہ تعالیٰ کے) کسی کو سجدہ کرے تو حکم دیتا کہ بیوی اپنے خاوند کی سجدہ گزار ہو۔[۵] قرآن و حدیث سے خاوند کے جو حقوق (یعنی بیوی کے فرائض) ثابت ہیں وہ درج ذیل ہیں:

---

[۱] بخاری، کتاب الادب، مسلم [۲] ریاض الصالحین حق الزوج علی المراۃ

[۳] مسلم کتاب الطلاق۔ تحریم افشاء سر المراۃ [۴] ریاض الصالحین ما یجوز من الکذب

[۵] ترمذی، ابواب الرضاع۔

۱۔ احترام و محبّت :

رشتۂ زوجیت ۔ باہمی احترام و محبّت کا رشتہ ہے، جیسا کہ سُورۂ روم (آیت ۲۱) سے اس جانب اشارہ ملتا ہے (اس کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مذکورہ بالا حدیث سے بھی ظاہر ہے کہ بیوی پر لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر کا دل سے بے حد احترام کرے کیونکہ سجدے سے زیادہ تو تعظیم کا مظہر کوئی اور چیز نہیں ہے۔ بیوی کا دل اپنے خاوند کی محبّت سے معمور ہونا چاہیئے۔ ویسے بھی اگر مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ازدواجی زندگی بھی خوشگوار، حسین اور پرکیف ہوتی ہے جب میاں بیوی ایک دوسرے کو دل سے چاہتے ہوں اور ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوں۔ باہمی احترام و محبّت کے بغیر زندگی بے کیف ہوتی ہے۔ خاوند کو چونکہ بیوی پر اک گونہ فضیلت حاصل ہے اور وہ باہر سے تھکا ہارا آتا ہے اس لئے بیوی پر خاص طور پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے خاوند سے محبت کا اظہار کرے۔

۲۔ اطاعت شعاری :

بیوی کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے خاوند کی اطاعت شعار ہو، اس کے ہر جائز حکم کی تعمیل کرے، کبھی اس کی نافرمانی نہ کرے۔ قرآنِ حکیم کی رو سے نیک عورت وہ ہے جو اپنے خاوند کی فرمانبردار ہو، چنانچہ سُورۂ النساء آیت ۳۴ میں ارشاد ہے :

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

"پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں اُن کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔"

اسی طرح نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ اگر بیوی اس حالت میں مرے کہ اس کا خاوند اس سے خوش ہو تو وہ جنّت میں جائے گی۔[1] جب کوئی بیوی اپنے خاوند کو ایذا دیتی ہے تو خاوند کی شریک جنّت ہونے والی حُور کہتی ہے : تجھے موت آئے اسے دکھ نہ دے، یہ تیرے ہاں پردیسی ہے، عین ممکن ہے کہ تجھ سے جدا ہو کر ہمارے پاس آجائے۔[2] ایک اور حدیث میں ہے کہ بیوی خاوند کی اجازت کے بغیر (نفل) روزہ بھی نہیں رکھ سکتی اور نہ اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر کسی کو اس کے گھر میں آنے دے۔[3]

---

[1] ترمذی، ابواب الرضاع [2] ریاض الصالحین، حق الزوج علی المرأۃ [3] ایضاً

ویسے بھی اگر ہم دیکھیں تو یہ بات مسلّم ہے کہ نظم وضبط کے بغیر کوئی ادارہ چل نہیں سکتا، ہر ادارے کا ایک سربراہ ہوتا ہے جس کے احکام وہدایات کی پابندی اس ادارے کے تمام ارکان پر لازم ہوتی ہے۔ گھر بھی ایک ادارہ ہے، خاوند گھر کا سربراہ ہے، وہ اس کے نفع ونقصان کا ذمے دار ہے لہٰذا اس کے احکام کی پابندی گھر کے تمام افراد پر لازم ہے اور گھر کے افراد میں سرفہرست بیوی ہے۔ اگر بیوی اطاعت شعار نہیں تو اولاد کیونکر مطیع وفرمانبردار ہوگی اور اگر گھر کے تمام افراد گھر کے سربراہ کے نافرمان ہو جائیں تو اس گھر کی تباہی وبربادی میں کیا شک ہے۔ البتہ اللہ کی معصیت میں خاوند کی اطاعت ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔

۳- مال اور ناموس کی حفاظت:

خاوند کے حقوق اور بیوی کے فرائض میں سے ایک یہ ہے کہ بیوی خاوند کے مال، گھربار، گھر کے اثاثے وغیرہ کی حفاظت کرے۔ خاوند کا مال واثاثہ پورے اہلِ خاندان کے استعمال اور بہبود کے لئے ہے۔ خاوند کام کاج کے لئے دن کا بیشتر حصہ، اور بعض حالتوں میں رات کو گھر سے باہر رہتا ہے اور گھر بیوی کے حوالے ہوتا ہے۔ خاوند گھر میں موجود ہو تو بھی گھر کی اشیاء اور اثاثے کی حفاظت بیوی ہی کر سکتی ہے۔ اسے چاہیئے کہ وہ کفایت شعاری اور سلیقے سے کام لے، چیزوں کو ضائع نہ ہونے دے۔ اسی طرح خاوند کا حق ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی بیوی اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرے، کسی کو اپنے خاوند کے بستر پر نہ سونے دے۔ قرآن حکیم (۴:۳۴) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

یعنی "پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں اُن کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔"

یہاں حقوق میں عزت وناموس کی حفاظت کا حق بھی شامل ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی عورتوں کو تلقین فرمائی ہے کہ خاوند کی غیر حاضری میں اس کے مال وعزت کی حفاظت کریں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے مشہور خطبہ میں ارشاد فرمایا: "خاوند کا اپنی بیوی پر یہ حق ہے کہ وہ بستر کو کسی دوسرے مرد سے پامال نہ ہونے دے"۔ [1] ایک حدیث میں فرمایا: "عورت کو یہ حق نہیں کہ خاوند کی اجازت کے بغیر کسی کو اس کے گھر میں آنے دے"۔ [2]

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ [2] ریاض الصالحین، حق الزوج علی المرأۃ، بحوالہ صحیحین۔

۴۔ سرکشی کی صورت میں تین باتوں کا حق :

اگر بیوی خاوند کا کہنا نہ مانے اور سرکشی کرنے لگے تو اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاوند کو تین تدابیر میں سے کوئی مناسب حال تدبیر یا یکے بعد دیگرے تینوں تدابیر اختیار کرنے کا حق دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ (سورۃ النساء، ۳۴)

" اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور ان کو مارو پیٹو ۔

۵ ۔ قناعت اور شکر گزاری :

بیوی کا فرض ہے کہ قناعت اور سادگی اختیار کرے، بے جا فرمائشوں سے خاوند کو تنگ نہ کرے ہمارے معاشرے میں بہت سی خرابیوں (مثلاً رشوت وغیرہ) کی ایک وجہ یہ ہے کہ عورتیں اپنے خاوندوں کو بے جا فرمائشیں کرتی رہتی ہیں، ان پر دباؤ ڈالتی ہیں کہ وہ ان کی فرمائشوں کو پورا کریں۔ ان کو کوسنے دیتی رہتی ہیں کہ تمہارے پاس آکر مجھے کیا ملا ہے۔ چنانچہ خاوند آخر کار ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ان کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ شادی بیاہ اور دیگر مواقع پر بے جا اور بے حد اخراجات والی رسمیں بھی زیادہ تر عورتیں ہی اختراع کرتی ہیں اور پھر خاوندوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ جس طرح بھی ہو ان رسموں کو پورا کریں۔ اسلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ ہر معاملے میں سادگی اختیار کی جائے۔ بیوی پر فرض ہے کہ ہر حال میں صبر و شکر سے کام لے۔ ہر خاوند اپنے طور پر رزق کی جستجو کے لئے پوری کوشش کرتا ہے لیکن پھر بھی بعض اوقات وافر رزق نہیں حاصل ہو پاتا ۔ ایسے میں بیوی اگر صبر و شکر سے کام نہ لے تو گھر کا امن و سکون تباہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بیوی پہ فرض ہے کہ ان کی مالی حالت جیسی بھی ہو وہ شکر گزار بن کے رہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا : " میں نے معراج کی رات عورتوں کو مردوں کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں جہنم کی آگ میں جلتے دیکھا ہے ۔" اس کی وجہ پوچھے جانے پر آپؐ نے فرمایا : " تم اپنے خاوندوں کی ناشکری کرتی ہو اور حق ناشناس ہو ۔"

اسی طرح ایک دفعہ آپؐ نے حضرت اسماءؓ بنت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے فرمایا : تم پر جن کا احسان ہے ان کی ناشکری سے بچو۔ تم میں سے ایک ماں باپ کے ہاں ایک مدت تک

بن بیاہی بیٹھی رہتی ہے، پھر اللہ اس کو خاوند عطا کرتا ہے، اولاد سے نوازتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے خاوند سے خفا ہو کر کہہ دیتی ہے: "میں نے تیری طرف سے کبھی کوئی بھلائی نہیں پائی ہے۔ ناشکری کی بات واقعی خاوند کو جلا کر راکھ کر دینے والی بات ہے۔ لہٰذا بیوی کو چاہیئے کہ کبھی ناشکری نہ کرے، بلکہ ہمیشہ شکرگزار رہے۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: "بابرکت نکاح وہ ہے جو محنت کے لحاظ سے آسان ہو (جس کا مہر کم ہو) اور بیوی زیادہ اخراجات کے لئے خاوند کو پریشان نہ کرے۔ بلکہ جو مل جائے اس پر قناعت کرے۔" (بیہقی)

۶۔ خاوند کے والدین اور اقارب سے حسنِ سلوک:

والدین اور اقارب کے حقوق کے بارے میں جو اسلامی تعلیمات ہیں وہ بیوی کے ذہن میں رہنی چاہئیں، اور خاوند اگر ان حقوق کو ادا کرنے کی کوشش کرے تو بیوی کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلے میں اپنے خاوند سے تعاون کرے، نہ کہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خاوند اپنے ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا چاہتا ہے مگر اس کی بیوی اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے، اور اس کا یہ رویہ بعض اوقات گھر کے امن و سکون کو تباہ کر دیتا ہے اور میاں بیوی کے درمیان تعلقات خوشگوار نہیں رہتے۔ بیوی کو یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ حدیث کی رو سے اس کا خاوند اور اس کا مال و اولاد سب اس کے (خاوند) کے والدین کی ملکیت ہیں۔

۷۔ اولاد کی پرورش اور تربیت:

بیوی پر فرض ہے کہ اپنے خاوند کی اولاد (اولاد کی نسبت باپ سے ہوتی ہے) کی محنت و مشقت سے پرورش کرے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کی اخلاقی تربیت کرے۔ ماں کی گود انسان کی اولین تربیت گاہ ہے، ماں بچے کے ذہن میں بچپن میں جو باتیں ڈال دیتی ہے وہ باتیں تاحیات اس کے ذہن میں موجود رہتی ہیں۔ اس پر یہ بھی فرض ہے کہ اولاد کے دل میں باپ کی محبت اور احترام پیدا کرے اور ان کو اس سے متنفر کرنے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی وہ ان کو اپنے خاوند کے خلاف اپنے ساتھ ملا کر محاذ بنائے ورنہ بچے بڑے ہو کر نارمل انسان نہ بن سکیں گے اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ اولاد کو بے جا لاڈ پیار دے کر خراب نہ کرے اور نہ ہی اس کا پیار محبت بچوں کو تعلیم سے غافل کرے۔

۸۔ زیب وزینت:

بیوی کو چاہیئے کہ اپنے خاوند کو بھانے کے لئے زیب وزینت اختیار کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ بہترین بیوی وہ ہے کہ جب شوہر اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے، اس کو کوئی حکم دے تو فوراً اس کی تعمیل کرے اور اپنی جان و مال میں شوہر کی ایسی مخالفت نہ کرے جو اس پر ناگوار گزرے (نسائی)۔ ایک دفعہ ایک عورت بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوئی۔ تو نبی کریم ؐ نے اس سے فرمایا: کیا تمہیں اتنی توفیق بھی نہیں کہ کم از کم اپنے ہاتھوں کو مہندی لگا لیا کرو۔ لہٰذا بیوی کو چاہیئے کہ اپنے خاوند کو خوش کرنے کے لئے زیب وزینت اختیار کرے، صاف ستھری رہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس بارے میں وہ حدِ اعتدال سے نکل جائے، ہر وقت بناؤ سنگھار میں ہی لگی رہے اور خاوند کی کمائی کا بیشتر حصہ آرائش وزیبائش پر خرچ کر دے۔ اسلام نے ہر معاملے میں میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔

۹۔ شوہر کی خوشنودی:

بیوی پر لازم ہے کہ اپنے شوہر کو خوشنود رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے اور اس کو ناراض نہ کرے۔ اسے چاہیئے کہ اس کی خواہشات اور پسند و ناپسند کا احترام کرے، کوئی ایسی بات نہ کرے جو اس کو ناگوار گزرے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

"تین آدمیوں کی نہ نماز قبول ہوتی ہے اور نہ ہی ان کی کوئی نیکی اوپر چڑھتی ہے: ۱۔ بھگوڑا غلام، تاآنکہ وہ اپنے مالک کے پاس واپس آجائے۔ ۲۔ وہ عورت جس سے اس کا خاوند ناخوش ہو۔ ۳۔ بے ہوش آدمی، یہاں تک کہ وہ ہوش میں آجائے۔" (بیہقی)

بیوی کے حقوق (خاوند کے فرائض)

جس طرح خاوند کے حقوق (اور بیوی کے فرائض) ہیں اسی طرح بیوی کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ جو خاوند کے فرائض ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے بیوی کے حقوق مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مہر کی ادائیگی:

نکاح کے وقت جو مہر مقرر کیا جاتا ہے وہ بیوی کا حق ہے، اور نکاح کے وقت مذکور ہونے والی شرائط کے مطابق اس کو وصول کرنا بیوی کا حق اور اس کو ادا کرنا خاوند کا فرض ہے۔ اس میں ٹال مٹول نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ مہر حقوقِ زوجیت کا بدل ہے اور اس کی ادائیگی شوہر پر فرض ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ط وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ط

(سورۃ النساء، آیت ۲۴)

"تو ان کے مہر بطور فرض ادا کرو، البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔"

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مہر کی ادائیگی کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا فرمان ہے کہ "جس نے مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس کو ادا نہیں کرے گا تو وہ زانی ہے۔" ایک اور حدیث میں، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، آپؐ نے فرمایا: "بابرکت نکاح وہ ہے جو محنت کے لحاظ سے آسان ہو (یعنی جس کا مہر قلیل ہو) اور عورت زیادہ اخراجات کے لئے شوہر کو پریشان نہ کرے بلکہ جو مل جائے اس پر قناعت کرے۔" البتہ بیوی خود ہی مہر معاف کر دے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

۲۔ نان و نفقہ:

شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کی ضروریاتِ زندگی پوری کرے، یعنی اس کے لباس، خوراک اور رہائش کا بندوبست کرے۔ ایک صحابی رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا کہ بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تو جب خود کھائے تو اسے بھی کھلا، خود لباس لے تو اسے بھی لباس دے۔ اس کو چہرے پر نہ مار، اس کی خرابی نہ مانگ اور نہ حدودِ خانہ کے سوا اس سے علیحدگی اختیار کر۔[1]

گھر کے اخراجات کا سارا بوجھ مرد پر ہے۔ بیوی کو حق حاصل ہے کہ خاوند کا مال اپنے جائز اخراجات میں اٹھائے۔ خاوند بہت تنگی کرے تو اس کے مال سے بال بچوں کی معروف اور جائز ضرورتوں کے لئے بغیر اس کے علم کے بھی خرچ کر سکتی ہے[2] وہ اس پر خرچ کے سب دروازے بند کر دے تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے جہاں سے اس کو نان و نفقہ یعنی رہنے سہنے اور کھانے پینے کے اخراجات کی ڈگری ملے گی۔ اخراجات کے عدم ادا کی بناء پر

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، حق المرأۃ علی زوجہا

[2] بخاری، کتاب النفقات۔ مسلم: کتاب الاقضیۃ۔ قضیۃ ہند

بیوی اگر طلاق کا مطالبہ کرے تو عدالت اس پر غور کرے گی۔

خاوند اپنی بیوی پر جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کا دنیا میں فائدہ (بیوی کی محبت اور خدمت و شکر گزاری کی صورت میں) تو ملتا ہے ہی اللہ کے ہاں بھی اس کا بڑا اجر و ثواب ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

(۱) بندے کے (اعمال کے) ترازو میں جو چیز سب سے پہلے رکھی جائے گی وہ اُس کا اپنے کُنبہ پر کیا ہوا خرچ ہو گا۔[۱]

(۲) ایک دینار تو اللہ کی راہ میں خرچ کرے، ایک غلام آزاد کرنے میں، ایک مسکین کو دے اور ایک اپنے گھر والوں پر خرچ کرے تو ان میں سے سب سے زیادہ اجر اس دینار کا ہو گا جسے تو اپنے گھر والوں پر خرچ کرے۔[۲]

(۳) جب بندہ اپنے گھر والوں کے کسی کام سے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے عوض ایک درجہ لکھتا ہے اور جب وہ ان کی ضرورت سے فارغ ہو چکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کر دیتا ہے[۳]

یاد رہے کہ بیوی کے مال پر خاوند کا کوئی حق نہیں، اس کے مرنے کے بعد وارث ہو سکتا ہے۔ ہاں بیوی اپنی خوشی سے اس پر خرچ کرے تو اس کی مرضی ہے۔[۴]

میاں بیوی کے اگر کوئی دودھ پیتا بچہ ہو اور طلاق کے بعد ماں اس کو دودھ پلائے تو اس کا عوضانہ بچے کا باپ اسے ادا کرے گا، ورنہ ماں پر رضاعت کی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔

۳۔ حسنِ سلوک:

اسلام شوہر کو بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ شادی کے بعد عورت اپنے باپ اور ان کے گھر بار کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے گھر میں اس کی ہو کر رہتی ہے، وہی اس کا سب کچھ ہے۔ اگر شوہر اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے گی اور اگر شوہر حسن سلوک سے پیش آئے تو ان کا خوشحال گھرانہ جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[۱] کنز العمال، جلد ۸، ص ۲۳۸، حدیث ۳۷۵۳۔ [۲] ریاض الصالحین، باب النفقۃ علی العیال
[۳] کنز العمال، جلد ۸، ص ۲۴۰، حدیث ۳۷۹۱۔ [۴] مسلم: کتاب النکاح، بخاری: کتاب الزکاۃ۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ج فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (سورۃ النساء)

"ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

اسی طرح نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے:

خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ [1]

(تم میں بہترین وہ ہے جو اپنی بیویوں کے حق میں بہترین ہیں)

سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صنفِ نازک کے حقوق کا اس قدر خیال تھا کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا خوف رکھو کیونکہ تم نے انہیں امانِ الٰہی کی بناء پر عقد میں لیا ہے [2] اسی طرح ارشاد نبوی ہے کہ میں تمہیں دو ضعیفوں یعنی یتیم اور بیوی کے حقوق کے بارے میں خبر گیری اور خبرداری کا احساس دلاتا ہوں۔ [3] آپؐ نے فرمایا کہ عورت کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے، تیری خاطر یہ کسی طریقہ سے سیدھی نہ ہوگی، تو چاہے اس کے تیکھے پن کے باوجود اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور تو اسے سیدھا کرنے لگے تو اسے توڑ دے گا۔ اس کا توڑنا اس کی طلاق ہے۔ [4] مراد یہ ہے کہ پسلی کے خوشنما اور مفید ترچھاپن کی طرح عورت کے خداداد تیکھا پن میں ہزار فائدے ہیں۔ اس پر جبر نہ کرو۔ دل برداشتہ نہ ہو۔

اگر بیوی سرکشی اختیار کرے تو اس صورت میں قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے شوہر کو اختیار دیا ہے کہ اس کو سمجھاؤ، اس کا بستر الگ کر دو اور اسے مارو۔ (سورۃ النساء: ۳۴) لیکن نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو منہ پر مارنے سے منع فرمایا ہے (دیکھیے محولۂ بالا حدیث) یہ اختیار ناگزیر صورت حال میں اور شاذ و نادر استعمال کرنا چاہیئے۔

---

[1] ترمذی، ابواب الاستئذان۔
[2] مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبیؐ۔
[3] ریاض الصالحین، باب ملاطفۃ الیتیم، بحوالہ نسائی۔
[4] ریاض الصالحین، باب الوصیۃ بالنساء۔

۴۔ عدل و مساوات :

اگر خاوند کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو اس پر لازم ہے کہ وہ ان سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے، یہ نہ ہونا چاہیئے کہ ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ میلان اور رغبت رکھے اور دوسری پر کم، ایک کی ناز برداری کرے اور دوسری کے ساتھ بے رخی اور بے التفاتی۔ اول تو یہ ہے کہ انسان کو ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنی ہی نہیں چاہیئے کیونکہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل و مساوات قائم رکھنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور اگر ایک سے زیادہ شادی کرنے پر مجبور ہو جائے تو پھر اس پر فرض ہے کہ ان کے درمیان عدل کرے۔ چنانچہ فرمان الٰہی ہے :

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا

(سورۃ النساء، آیت ۱۲۹)

"بیویوں کے درمیان عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے، تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ پس ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اور اگر انسان کو اپنے اوپر اس بات کا اعتماد ہی نہ ہو کہ وہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل کر سکے گا تو اس صورت میں اسے دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے :

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً

" اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو ایک پر ہی اکتفا کرو۔" (النساء : ۳)

۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر :

شوہر گھر کا نگران و نگہبان (راعی) ہے لہٰذا اہلِ خانہ (جن میں بیوی سرِ فہرست ہے) کے اچھے برے اعمال کی ذمے داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر لازم ہے کہ گھر والوں کو (بیوی سمیت) نیکی کی ترغیب دے اور برائی سے منع کرے اور اس کی گھر میں تبلیغ قولی اور عملی دونوں طریقوں سے ہونی چاہیئے، یعنی زبان سے بھی ان کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرائے اور اپنے کردار اور سیرت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرے جس کی وہ تقلید کریں۔

۶۔ بیوی کے والدین اور اقرباء سے حُسنِ سلوک :

جس طرح بیوی پر فرض ہے کہ وہ اپنے خاوند کے والدین اور اقرباء کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اس طرح خاوند کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کے والدین اور اقرباء کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے۔ انسان کے والدین صرف وہی نہیں جنہوں نے اس کو جنم دیا بلکہ وہ بھی اس کے والدین ہیں جن کی بیٹی (یا بیٹے) سے اس کی شادی ہو۔ اگر وہ اپنی بیوی کے والدین اور اقرباء کے ساتھ بدسلوکی کرے گا تو ظاہر بات ہے کہ اس کی بیوی کا دل دکھے گا۔ اس کے دل میں خاوند کا احترام اور محبت کم ہو جائے گی اور یہ صورتِ حال خوشگوار ازدواجی زندگی کے راستے کی رکاوٹ بن سکتی ہے۔

۷۔ وراثت :

خاوند کی وفات پر بیوی کو اس کی وراثت کا معین حصّہ ملتا ہے۔ یعنی اولاد ہو تو آٹھواں ورنہ چوتھا حصّہ۔

۸۔ خلع کا حق :

جس طرح خاوند کو حق ہے کہ اگر بیوی کے ساتھ اس کا نباہ نہ ہو سکے تو وہ اس کو طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح بیوی کو حق ہے کہ اگر اس کا اپنے خاوند کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے تو وہ اس سے علیحدگی حاصل کرلے جس کو شریعت کی اصطلاح میں خُلع کہتے ہیں۔

اُسوۂ نبوی :

حریمِ نبوی کے جو واقعات ہم تک پہنچے ہیں وہ زن و شوہر کے باہمی تعلقات کے بارے میں اکمل و احسن نمونہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت خدیجہ سے شادی کی تو آپؐ کی عمر صرف پچیس برس تھی اور جناب خدیجہؓ کی چالیس برس۔ اس کے باوجود حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اُن کی زندگی بھر آپؐ کے تعلقات بے مثال طور سے خوشگوار رہے۔ اُن کی وفات کے بعد حضرتِ خدیجہؓ کو یاد فرماتے تو بعض دفعہ آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ مجھے کسی عورت پر کبھی ایسا رشک نہیں آیا جیسا جناب خدیجہؓ پر۔ حالانکہ مجھے ان کا دیدار بھی نصیب نہیں ہوا۔[1] حضورؐ ان کی سہیلیوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ جب کبھی بکری ذبح کرتے تو ان کے گھروں میں بھجواتے تھے۔[2] بعد میں آپؐ کے نکاح میں

---

[1] ریاض الصالحین باب فضل برّ اصدقاء الوالدین .... بحوالہ صحیحین بخاری مناقب اصحاب الرسول

[2] ریاض الصالحین باب فضل برّ اصدقاء الوالدین .... بحوالہ صحیحین۔

تقریباً نو ازواج رہیں، تاہم عدل و مساوات کے لحاظ سے آپؐ کا گھر ایک جنت تھا۔ گزران بہت سادہ تھی۔ بارہا فاقے گزر جاتے مگر ہر سختی میں سب برابر کے شریک تھے۔ اس کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ آپؐ نے کسی بیوی پر سختی کی ہو، تھپڑ مارنے یا پیٹنے کا تو گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

ایک دن حضرت ابوبکرؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ دروازے پر پہنچ کر اذن چاہا تو سنا کہ حضرت عائشہؓ اونچی آواز سے باتیں کر رہی ہیں۔ جب گھر میں داخل ہوئے تو حضرت عائشہؓ کو سزا دینے کے لئے پکڑ لیا اور فرمایا، میں یہ نہ دیکھوں کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بلند آواز سے بولے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام درمیان آ گئے۔ جناب صدیقؓ غصہ ہی کے عالم میں باہر تشریف لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا، دیکھا میں نے تجھے اس آدمی سے کیسے بچایا؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازواج مطہراتؓ کی نازک مزاجیاں خندہ پیشانی سے برداشت فرماتے تھے لیکن دین کے باب میں پورا نظم و ضبط تھا۔ جب سارا عرب زیر نگیں آ گیا تو امہات المومنینؓ نے آپؐ سے تقاضا کیا کہ اب اخراجات میں کشائش عطا ہونی چاہیئے۔ آپؐ نے انکار فرما کر کہا کہ ملت کے دیگر افراد پر تمہیں ترجیح نہیں دے سکتا۔ جیسی زندگی سخت کوشی کی پہلے تھی اب بھی رہے گی۔ بات بڑھی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کئی روز تک گھر میں ان سے علیحدہ ہو کر رہے۔ بالآخر وحی نازل ہوئی جس کے حکم کے بموجب آپؐ نے ان کو اختیار دے دیا کہ چاہیں تو سابقہ گزران قبول کریں۔ ورنہ طلاق لے کر جدا ہو جائیں۔ ازواجِ مطہراتؓ نے سرِ تسلیم خم کیا اور حسبِ سابق قناعت کی پونجی پر راضی رہیں۔

سوالات

۱۔ قرآن و سنت کی روشنی میں شوہر اور بیوی کے حقوق و فرائض بیان کیجئے۔

۲۔ اسلام میں رشتۂ زوجیت کی اہمیت بیان کیجئے۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کی رُو سے ایک مثالی شوہر اور مثالی بیوی کے اوصاف بیان کیجئے۔

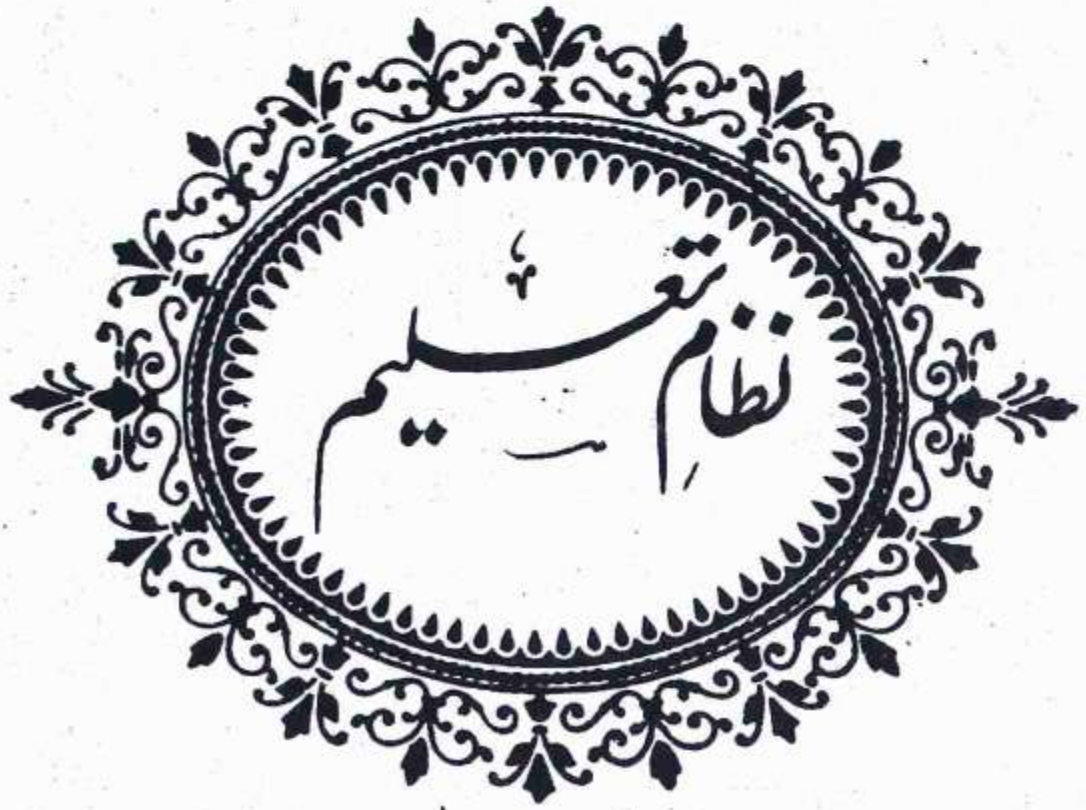
نظام تعلیم

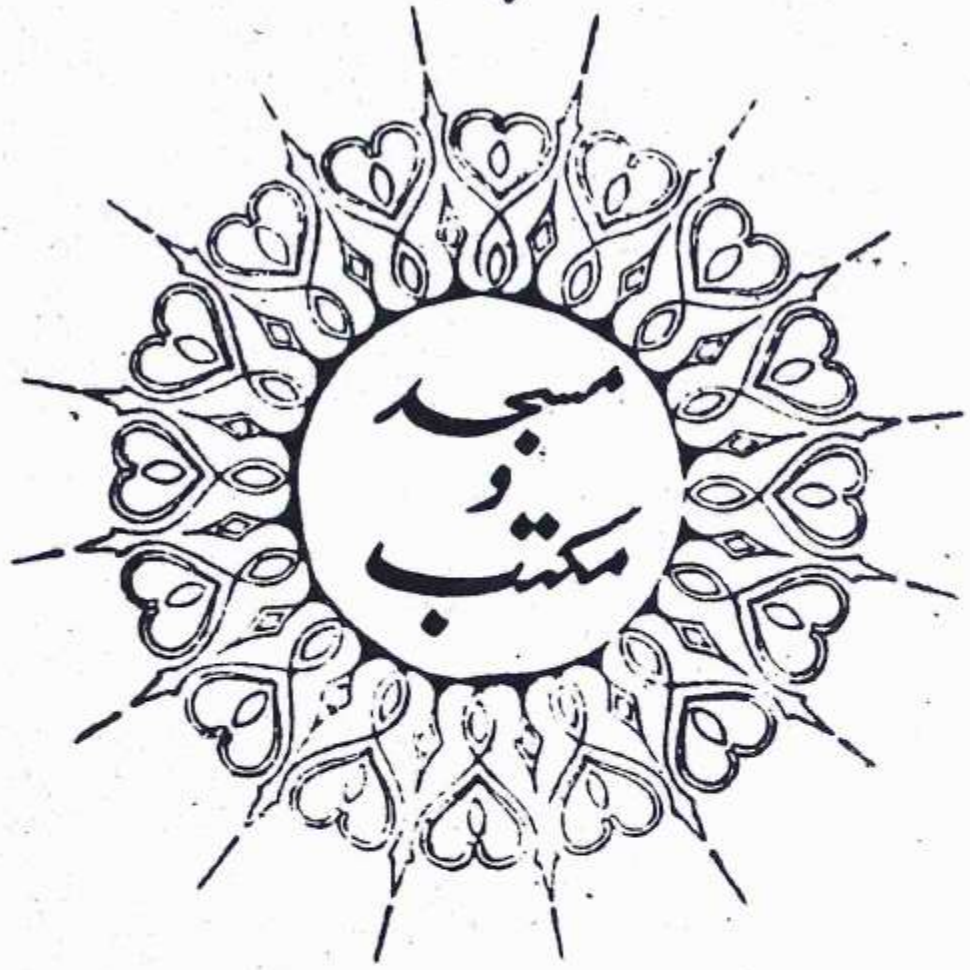
مسجد و مکتب

اِسلامی نظامِ تعلیم

علم کا مفہوم : علم کے لغوی معنی ہیں: (۱) جاننا، آگاہ ہونا۔ (۲) خبر۔ حکمت اس علم کو کہتے ہیں جو عمل کے سانچے میں ڈھل جائے اور فراست کا نور رکھتا ہو۔ فن بھی اگرچہ علم کو کہتے ہیں لیکن اس میں حکمت کی سی وسعت نہیں۔

علم حقیقی معنی میں وہی ہے جو صحیح ہو۔ ایک حدیث کی رو سے علم اچھی چیز کے یاد رکھنے ہی کا نام نہیں بُری معلومات سے دور رہنا بھی اس کا لازمی عنصر ہے۔

علم دو ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ (۱) حواس خمسہ ؛ (۲) قلب (یا کشف)

علم کی وسعت : اگرچہ افضل علم دین کا علم ہے لیکن حق یہ ہے کہ علم کی دنیا ازبس وسیع ہے، وہ سب علوم و فنون جو فلاحِ انسانی اور رضائے الٰہی کے لئے کام آئیں۔ صحیح علم کے دائرہ میں آتے ہیں اور قربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ قرآنِ حکیم نے کائنات کے مطالعہ اور ان کی تحقیق و جستجو کی ستائش کی ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی یاد بھی دل میں موجزن رہے۔ یہی سائنسی علوم کا حرفِ آغاز ہے۔ اسلام نے علم کے سب مفید شعبوں میں بڑھنے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ اہلِ اسلام نے نئے سے نئے علوم و ایجاد کر کے دنیا کے سامنے پیش کئے۔

تعلیم :

تعلیم سے مراد ہے دوسروں کو علم دینا، سکھانا۔ ظاہر بات ہے کہ اسلام اسی علم اور فن کی تعلیم کا روادار ہے جو انسان کی فلاح کا ضامن ہو، اس کی دنیا اور آخرت کے لئے مفید ہو۔

اسلام میں علم اور تعلیم کی اہمیّت :

(۱) وجہ فضیلت : اسلام میں علم اور تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ انسان کا سب سے پہلا معلّم تو خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہے : وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ، یعنی آدمؑ کو تمام اسماء (چیزوں کے نام یا چیزوں کے نام رکھنے کی صلاحیت) سکھا دیئے اور یہی چیز انسان کی فضیلت کی وجہ بنی۔ اسی بناء پر فرشتوں نے آدمؑ سجدہ کیا۔

(۲) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پہلی وحی میں ہی پڑھنے کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ اس نے انسان کو تعلیم دی اور اسے وہ کچھ سکھا دیا جو کہ وہ نہیں جانتا تھا۔

ارشاد ربانی ہے :

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ (سورۃ العلق : ۳-تا۵)

"(اے نبی) پڑھئے اور آپؐ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی۔ اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے انسان پر بے شمار احسانات ہیں، اس کی تخلیق، اس کو زندگی بخشنا اور پھر اس کی ربوبیت، لیکن پہلی ہی وحی میں انسان کی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے جس احسان کا ذکر فرمایا وہ اس کی تعلیم ہے۔

(۳) نبی کریمؐ معلّم ہیں :

ہر نبی کا فرضِ منصبی یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کرے اور یہی منصب نبی آخر الزماں صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا تھا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

سورۃ آل عمران ، آیت ۱۶۴

" ان کو اللہ تعالیٰ کی آیات سناتا ہے اور ان کو پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

(۴) علم کی فضیلت واہمیت کی بابت آیاتِ قرآنیہ :

قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر علم اور علم کی فضیلت و اہمیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے جن سے مسلمانوں کو تعلّم و تعلیم کی ترغیب ملتی ہے، مثلاً :

(الف) قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ

" (اے نبی) کہہ دیجئے کہ کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں۔" (سورۃ الزمر: آیت ۹)

(ب) وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

(سورۃ طٰهٰ ، آیت ۱۱۴)

" اور کہہ اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ کر۔"

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ دعا سکھائی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں اور تحصیلِ علم کے راستہ کی کوئی منزل نہیں ہے۔ علم ایک سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ لہٰذا انسان جس قدر بھی علم حاصل کرے مزید علم حاصل کرنے کا ذوق و شوق برقرار رہنا چاہیئے۔ عمر کے یا علم کے کسی مقام پر جا کر بھی علم کی جستجو ختم نہیں ہونی چاہیئے۔

(ج) یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ

" تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور

اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

جن کو علم بخشا گیا ہے اللہ اور ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا (سورۃ مجادلہ، آیت ۱۱)

(د) اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (سورۃ فاطر، آیت ۲۸)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔"

(ہ) وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ

"اور یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لئے دیتے ہیں، مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔" (سورۃ العنکبوت، آیت ۴۳)

تعلّم و تعلیم کی بابت احادیث نبویہ:

نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے، جن کا فرضِ منصبی ہی لوگوں کی تعلیم و تربیت تھا اور جو ہمیشہ اس علیم و خبیر سے دعاگو رہتے تھے کہ میرے علم میں اضافہ کر، اپنی اُمّت کو اپنے متعدد ارشادات میں تلقین فرمائی ہے کہ علم سیکھتے اور سکھاتے رہو۔ چند احادیث کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

(الف) طلب علم فرض ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ [1]

(علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے)

اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلم خواتین کو بھی دین کی ضروری تعلیم دیا کرتے تھے۔ اسی طرح اُمّہاتُ المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا ایک فریضہ یہ تھا کہ وہ مومن خواتین کو دینی مسائل سے آگاہ کریں۔

(ب) طلب علم نفل عبادت سے افضل ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قلیل علم کثیر (نفل) عبادت سے بہتر ہے۔ [2] یہاں تک کہ آپؐ نے قرآن حکیم کی ایک آیت کے تعلّم (سیکھنے) کو سو رکعت (نفل) نماز سے بہتر بتایا ہے۔ [3]

ایک اور حدیث میں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ عالم کو عابد پر ایسے ہی فضیلت حاصل ہے

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب العلم۔ [2] الترغیب والترہیب، جلد ۱

[3] الترغیب والترہیب، جلد ۱

جیسے چودھویں کے چاند کو سب ستاروں پر[1] حضورؐ نے عالم کو چودھویں کے چاند سے اس لئے تشبیہ دی ہے کہ وہ دنیا کو دین کی روشنی سے منوّر کرتا ہے۔

(ج) مومن تحصیل علم سے کبھی سیر نہیں ہوتا :

علم کا اُفق بے حد و حد ہے، اس کی وسعتیں کائنات کی طرح پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے جو آدمی طلبِ علم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتا ہے۔ وہ مہد سے لے کر لحد تک بھی اس کے لئے کوشاں رہے تو اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ مومن نیک علم سے کبھی سیر نہیں ہوتا حتیٰ کہ جنّت میں پہنچ جاتا ہے۔[2] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ طالبِ علم اور طالبِ دنیا دونوں کا جی نہیں بھرتا البتہ دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ کہ طالبِ علم اللہ تعالیٰ کی رضا میں بڑھے جاتا ہے اور طالبِ دنیا سرکشی میں ترقی کرتا ہے۔[3]

(د) طلبِ علم کے دوران موت شہادت ہے :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا فرمان ہے کہ طالبِ علم کو علم کی تلاش کے دوران میں موت آجائے تو وہ شہید ہوتا ہے۔[4]

اسی طرح ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ جو آدمی علم کی تلاش میں نکلتا ہے وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہوتا ہے۔[5]

حضورؐ کا فرمان ہے کہ جب بھی کوئی آدمی علم کی طلب میں روانہ ہونے کو جوتا، موزہ یا لباس پہنتا ہے تو جوتے پر قدم رکھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔[6]

تعلّم و تعلیم عہدِ رسالت میں :

اسلام نے تحصیلِ علم پر لفظی تاکید کرنے اور اسے ایک فضیلت قرار دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے لئے ایک عملی نظام وضع کیا ہے۔ یہ نظام قرآنِ حکیم کے نزول کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ قرآنِ حکیم ابتداء ہی سے کتاب کی صورت میں لکھا اور پڑھا گیا۔

اسلام سے قبل عرب کے لوگوں نے کتاب کی صورت بھی شاذ و نادر دیکھی تھی۔ لیکن قرآنِ حکیم کے

---

[1] مشکاۃ، کتاب العلم
[2] مشکاۃ، کتاب العلم
[3] مشکاۃ، کتاب العلم
[4] جامع بیان العلم
[5] الترغیب والترہیب
[6] الترغیب والترہیب

نزول نے ہر مسلمان کو خواندگی عطا کی۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت میں اس قدر فضیلت ہے کہ یہ ملتِ اسلامیہ کا شعار یعنی امتیازی علامت قرار پائی۔ آج تک دیہات میں بھی یہ حال ہے کہ جو بالغ مرد یا عورت قرآن شریف نہ پڑھ سکے اسے حرماں نصیب سمجھا جاتا ہے۔

ایک وقت وہ تھا کہ مکّہ کے بھرپور شہر میں کل سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ عورتوں نے بھی قرآن لکھنا اور پڑھنا شروع کیا۔ اور تو اور غلام بھی صاحبِ قلم ہو گئے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم جب ہجرت کے سفر پر روانہ ہوئے تو ایک کافر سراقہ بن جُعشم نام تعاقب میں آیا لیکن پھر نادم ہو کر امان کا طالب ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ہمراہ حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ اُن کے آزاد کردہ غلام عامرؓ بن فہیرہ بھی تھے۔ آپؐ نے عامرؓ کو حکم دیا اور انہوں نے امان نامہ لکھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سفر میں بھی قلم دوات کا سامان ساتھ تھا۔ کیوں نہ ہو جب کہ قرآن حکیم کی پہلی وحی میں قلم کی تعریف نازل ہوئی۔

بدر کی جنگ میں قریش کے بعض اشخاص اسیر ہوئے۔ ان میں سے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان سے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا کہ اگر دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو تو آزاد ہو۔ آپؐ نے مسجدُ النبی میں ایک مکتب قائم کیا جس کو صُفّہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مدینہ میں کئی مسجدیں تھیں جن میں بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ مسلمانوں میں شاید ہی کوئی آدمی ہو جو لکھنا نہیں تو کم از کم پڑھنا نہ جانتا تھا۔ یہ ایک ایسا علمی کارنامہ ہے کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت کے بدولت ہر مسلمان نے لازماً تعلیم حاصل کر لی جو شاید کروڑوں روپیہ کی لاگت سے بھی حاصل نہ ہو سکتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ میں مرد تو مرد عورتیں بھی لکھ پڑھ لیتی تھیں بعض صحابیات نے قرآنِ حکیم کے علاوہ حدیث کی کتابیں بھی قلمبند کیں۔

علم خاندانی میراث نہیں : علم کی متاع کسی خاص گروہ، طبقہ یا خاندان کے لئے مختص نہیں۔ ہر شخص اپنی اہلیت اور ظرف کے بموجب یہ سرمایہ اکٹھا کر سکتا ہے۔

اسلام میں نہ تو شودروں کی طرح کوئی ایسا طبقہ قرار دیا گیا ہے جو علم کے قریب ہی نہ جائے اور نہ برہمنوں کی طرح کوئی ایسا خاندان نامزد ہے جو علم کے کسی شعبے کا واحد اجارہ دار ہو۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے۔ جب یہ نعرہ بلند کیا جاتا ہے کہ اسلام میں برہمنیت

نہیں اور علمِ دین کو کسی طبقہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا تو بعض اصحاب اسے غلط معنی پہناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علماء کی جماعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ان اصحاب کی غلط فہمی ہے۔ برہمنیت کے عدم وجود سے مراد یہ ہے کہ علم کوئی موروثی یا خاندانی چیز نہیں۔ اس سے مدعا ہرگز نہیں کہ کسی فن میں اس کے عالم یا ماہر کو سند نہ مانا جائے۔ کوئی مریض ڈاکٹر کے علاج کے دوران میں وفات پا جائے تو کسی عامی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ڈاکٹر کی جگہ چھین کر خود ڈاکٹر بن بیٹھے۔ اسی طرح اگر علمائے دین سے بھی کوئی غلطی ہو جائے تو محض اس غلطی کی بناء پر کوئی شخص ان کے مرتبہ کا حق دار نہیں ہو جاتا، جب تک ان کے برابر مستند علم حاصل نہ کرلے۔ اگر ناقص علم والے افراد کمال والوں سے برابری کے دعوے کرنے لگیں تو علم کے سب شعبوں کو نقصان پہنچے گا۔

اسلام کا پہلا مکتب۔ صُفّہ: اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلا مکتب صُفّہ ہے۔ جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے خود قائم فرمایا۔ صُفّہ کے لغوی معنی سائبان کے ہیں جب قبلہ بجائے بیت المقدس کے کعبہ ہوا تو مسجد النبی کے پہلے چھت کے نیچے طلبا کی سکونت گاہ بنی۔ اس چھت کو صُفّہ کہتے ہیں اور یہاں کے مکین طلباء کو اصحابِ صُفّہ کہتے ہیں۔

صُفّہ رہائشی مکتب تھا۔ یہ اسلام کی پہلی یونیورسٹی ہے۔ اس مدرسہ سے عصرِ حاضر کے مدرسے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کا عالم ہی اور تھا۔ یہاں علم اور فقر دونوں کی قولی اور عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ اصحاب صُفّہ کا اکثر وقت معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی صحبتِ مبارکہ میں گزرتا تھا۔ یہ اصحاب حضورؐ کے فیوض سے ہر وقت بہرہ مند ہوتے تھے۔ ان کی تعلیم قرآنِ حکیم، تفسیر، حدیث اور فقہ تک محدود نہ تھی بلکہ وہ جو کچھ پڑھتے تھے اس کی عملی تربیت بھی حاصل کرتے تھے۔

صُفّہ کی یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے زر و سیم اور سامانِ راحت کی حاجت نہ تھی۔ فقر ہی اصحاب صُفّہ کا سرمایہ تھا۔ مطلب یہ نہیں کہ وہ گداگری کرتے تھے یا دیگروں کے دستِ کرم کے منتظر رہتے تھے۔ نہیں۔ بلکہ ان حضرات سے جہاں تک ہو سکتا محنت مزدوری کرتے تھے اور جو اجرت ملتی اس سے زندگی کی بنیادی ضرورتیں مہیا کرتے تھے۔ ان ضرورتوں کی فہرست یہ ہے: روکھی سوکھی روٹی اور پھٹا پرانا لباس۔ ان کا لباس بالعموم ایک چادر یا ٹاٹ وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا جو ٹخنوں تک بدن کو ڈھانپے رکھتا تھا۔ بارہا فاقے گزر جاتے۔ بعض دفعہ بھوک سے اس قدر نڈھال ہوتے کہ عین حالتِ نماز میں گر جاتے تھے۔ ناواقف لوگ ان کی ہیئت دیکھ کر گمان کرتے کہ دیوانے ہیں۔ یہ نیک نہاد

بندے بے شک ظاہر بین نگاہ کے لئے دیوانے تھے لیکن سچ پوچھو تو علم وحکمت کے خزانے تھے جو آدمی خود کو اپنے نصب العین میں گم کردے وہ بعض لحاظ سے دیوانہ نظر آتا ہے۔ اصحابِ صفہؓ نے خود کو علم کے شوق میں محو کر رکھا تھا۔ اس لئے مجذوب نظر آتے تھے۔ انہوں نے علم وحکمت کے دائرے کو دُور دُور پھیلایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم انہیں نومسلم قبیلوں میں تعلیم مسائل کے لئے روانہ فرماتے تھے۔ اسلام نیا نیا پھیل رہا تھا۔ اور عرب کے چپے چپے میں اسلام کے دشمن پَر تولے بیٹھے تھے۔ اصحابِ صفہؓ کی جان خطرہ میں رہتی تھی، تاہم یہ اللہ کے بندے سر ہتھیلی پر رکھ کر فرائض ادا کرتے تھے! ان مہمات میں کئی اصحابِ صفہؓ شہادت کا جام نوش کر گئے۔

اصحابِ صفہؓ صرف راہِ علم کے مسافر نہ تھے بلکہ میدان جہاد کے غازی بھی تھے۔ غزوات اور مہمات میں حصہ لیتے تھے اور سپاہیانہ جوہر دکھاتے تھے۔

خلافتِ راشدہ: خلافتِ راشدہ کا دور آیا تو تعلیم وتدریس میں اور وسعت ہوئی۔ بچوں کو قرآن حکیم، کتابت، اخلاقی اشعار اور امثالِ عرب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ معلمین کے لئے حکومت کی طرف سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ بچوں ہی کی تعلیم پر توجہ نہ تھی۔ تعلیم بالغان کا بھی اہتمام تھا۔ فقہ کی تعلیم کے لئے ہر صوبہ میں تنخواہ دار فقہاء اور معلم روانہ کئے گئے جو مسجدوں میں بیٹھ کر درس دیتے تھے۔ ایک ایک فقیہ کے پاس ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔

جو لوگ تجارت اور کاروبار کرتے تھے حضرت عمرؓ انہیں مجبور کرتے کہ اپنے کاروباری شعبے کے بارے میں فقہی مسائل سیکھیں۔ دکانداروں اور تاجروں میں فقہ کی معلومات کی کمی دیکھتے تو کوڑوں سے ان کی تواضع کرتے اور انہیں علم حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کے پاس بھیجتے تھے۔ کاروباری اصحاب اگر فقہی مسائل سے آگاہ نہ ہوں تو عین ممکن ہے کہ وہ کمائی کے ناجائز ذرائع اختیار کرلیں۔

خلافتِ راشدہ کے بعد: بعد کے ادوار میں حکومت سے زیادہ خود علماء نے ترویج علم کی طرف توجہ دی۔ بے شمار علماء نے اپنی زندگیاں اس مقصد کے لئے وقف کردیں۔ بعض فرمانرواؤں اور امراء نے بھی ذاتی دلچسپی لی۔ حضرتِ معاویہؓ نے شاہی کتب خانہ قائم کیا۔ ولید اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے بھی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ نادار طلبہ اور ان کے علماء کے لئے جنہوں نے منظور فرمایا وظائف جاری کئے۔ ہارون الرشید کو تحصیل علم کا اس قدر شوق تھا کہ بغداد سے چل کر مدینہ میں امام مالکؒ کے پاس حدیث سننے آیا۔ ایک درس میں شامل ہونے جاتا تو کھجور کے ایک تنے پر بیٹھ کر عام طلبہ کے ہمراہ حدیث لکھتا تھا۔ عباسی خلفاء نے

علم کے پودے کو جانِ عزیز کی طرح سنبھالا۔ دارالحکومت بغداد میں دنیا بھر سے علماء اکٹھے کئے۔ یہاں تقریباً بیس مدرسے ایسے تھے جو محلات کی سی وسعت اور شان رکھتے تھے۔

تعلیم کی اشاعت میں اصحابِ ثروت نے بھی دلچسپی لی اور ذاتی خرچ سے عظیم مدرسوں کی بنا دی۔ ان کے ساتھ بڑے بڑے وقف قائم کئے جن سے لاکھوں کی آمدن تھی۔ طلبہ کی رہائش اور خوراک کا بھی انتظام تھا۔ شفاخانے بھی ملحق تھے۔ ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ مستند اور شہرت یافتہ علماء کو ان مدرسوں کی زمامِ تعلیم سونپی جاتی تھی۔ طلباء دُور دراز کے سفر طے کر کے یہاں آتے تھے۔

ملّتِ اسلامیہ میں علم کا نظام زیادہ تر اس کے فرزندوں کی ذاتی کاوشوں سے قائم رہا ہے۔ اس نظام کو زندہ اور مستحکم رکھنے کے لئے فقط علمی روح کی ضرورت تھی جس سے اسلامی دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہ تھا۔ لیکن اب جب کہ حکومت کے فرائض کا دائرہ بہت پھیل گیا ہے نظامِ تعلیم بھی حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔ یہ نظام جبھی صحیح معنی میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا ہر فرد اس کا دلدادہ ہو اور اسے خوب سے خوب تر دیکھنے کے لئے بے تاب ہو۔

اسلام میں تعلیم کا نصب العین :

کوئی کوشش اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک اس کا نصب العین مقرر نہ ہو۔ بغیر کسی مقصد کے جو کام بھی شروع کیا جائے وہ عبث ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسلام میں تعلیم کا نصب العین واضح کر دیا جائے۔

اسلام میں تعلیم کا نصب العین بہت وسیع ہے۔ اس کا مقصود صرف حروف و الفاظ سے آشنا ہونا نہیں بلکہ دین کی خدمت ہے یعنی پوری اسلامی زندگی کی تعمیر۔ اسلامی تعلیم فرد کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دین کی حفاظت و اشاعت کی عظیم مہم میں حصہ دار ہو سکے۔

دینی زندگی کے دو پہلو ہیں، یعنی روحانی اور دنیوی۔ عملی طور سے روحانیت کو دنیاداری سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نظری نقطہ نگاہ سے ہم ان پر الگ الگ بحث کر سکتے ہیں۔

روحانیت :

اسلامی تعلیم روحانی اور اخلاقی ہر لحاظ سے کامل تربیت کی ضامن ہے۔ یہ مقصود محض کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے شخصی نظیر اور تربیت کی بھی برابر کی حاجت ہوتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ معلّم اخلاقی اوصاف سے مالا مال ہو۔ معلّم اخلاقی جوہر سے خالی ہو تو شاگردوں کے اخلاق کو بگاڑتا ہے اور علم کی قدر و منزلت کو ضائع کرتا ہے۔

دنیاداری :

دنیا کا کاروبار از بس وسیع اور پیچیدہ ہے۔ اس کے لئے متعدد علوم مُدوّن کئے گئے ہیں۔ مثلاً سائنس، ریاضی، انجینئرنگ وغیرہ۔ ہم ان کو اگرچہ دنیوی علوم کا نام دیتے ہیں لیکن انہیں دینی خدمت کے جذبے سے حاصل کیا جائے اور محض تن پروری مقصود نہ ہو تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوتے ہیں۔ البتہ ایسے علوم سے پرہیز چاہیئے جو دین یا ملک کو الٹا نقصان دیں۔

اسلام مفید علوم و فنون کا پاسبان ہے۔ اہل اسلام نے متعدد علوم کی بنا رکھی اور ان سے ملک و ملّت کی خدمت کا کام لیا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ آدمی ان علوم میں اتنا نہ کھو جائے کہ روحانیت کو بھول بیٹھے اور دین سے غافل ہو جائے۔

طالب علم کے اوصاف :

طالب علم کو حسب ذیل اوصاف پیدا کرنے چاہئیں :

(۱) خوفِ الٰہی :

حدیث شریف میں ہے :

اَلْحِکْمَۃُ مَخَافَۃُ اللّٰہِ [1]

ترجمہ : حکمت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہے

جس علم کا آغاز خوفِ الٰہی سے نہیں ہوتا وہ رحمانی نہیں، شیطانی علم ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

(۲) پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے محبّت :

مسلمان اس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہوتا جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی محبّت سے سرشار نہ ہو اور حضورؐ کو اپنی جان اور اپنے والدین سے بھی عزیز تر نہ جانے۔

(۳) دین و شریعت کی پابندی :

ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی خواہشوں کو دین و شریعت کے تابع کر دے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے اسلامی مکاتب تربیت گاہ کا کام دیتے ہیں۔

(۴) قوم سے محبّت :

مکتبی زندگی کے دوران میں طالب علم کے ذہن میں قوم کی محبت بخوبی راسخ ہو جانی چاہیئے۔

---

[1] جامع الصغیر سیوطی

طالب علم پر یہ نکتہ خوب روشن ہو جائے کہ فرد کی زندگی قومی حیات سے وابستہ ہے۔ صحیح مسلمان وہ ہے۔ جو دین کے ساتھ ساتھ قوم و وطن سے بھی محبت رکھتا ہے اور اس کے سود و زیان کو اپنا سود و زیان سمجھتا ہے۔

(۵) حکومت کی اطاعت :

اسلامی حکومت کی اطاعت واجب ہے۔ حکومت کے مسائل کو سمجھنا ہر شخص کے احاطۂ قدرت میں نہیں۔ اس لئے حکومت کے ہر حکم پر وضاحت کی طلب ممنوع ہے۔ حکومت سے حتی الوسع تعاون کیا جائے۔

اسلامی حکومت سے تعاون کا جذبہ طلبہ کے ذہن میں راسخ نہ ہوگا تو ملک دشمن عناصر ان کے ناپختہ اذہان پر اثر انداز ہو کر ان کو مظاہروں اور ہنگاموں کی راہ پر رواں کر دیں گے جس سے ملک و ملت کی سالمیت پر زد پڑے گی۔

(۶) اسلامی ثقافت :

اسلام اپنے پیروؤں کے لئے زندگی کا ایک خاص سلیقہ مقرر کرتا ہے جسے آجکل ثقافت کہتے ہیں۔ اسلامی ثقافت ملت کے چہرۂ زیبا کے لئے نقش و نگار مہیا کرتی ہے۔ اسی میں ملت کی شانِ امتیاز ہے جس پر مسلمان کو بجا طور پر ناز ہوتا ہے۔ سادگی اور پاکیزگی ثقافت کی روح ہے۔ یہ اسے نشست و برخاست اور رہن سہن کے ایسے اسلوب سکھاتی ہے جو کسی خاص طبقہ سے مخصوص نہیں بلکہ امیر و غریب اور حاکم و محکوم سب انہیں اپنا سکتے ہیں۔ مختلف گروہوں کے درمیان غیریت پیدا نہیں ہونے پاتی اور وہ آپس میں کسی تکلف یا رکاوٹ کے میل جول رکھ سکتے ہیں۔ یہ ثقافت مساوات، ہمدردی اور سادگی کی امین ہے۔ اسلامی تعلیم ہمیں سکھاتی ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ان میں ہمدردی کا رشتہ ہے۔ وہ دولت کو فضول اور بے کار سامانِ عیش پر ضائع نہ کریں۔ اسے اپنے بھائیوں کے فائدے میں خرچ کریں۔

اسلامی ثقافت عیش پرستی اور سہل کوشی سے بچاتی ہے اور زندگی کی مشقت سے عہدہ برآ ہونے کے لائق کرتی ہے۔ جو طلبہ مدرسہ کی زندگی میں عیش کوشی اور راحت پسند ہو جائیں وہ قوم کیلئے بوجھ بن جاتے ہیں۔

مسجد و مکتب

علم ایک مذہبی فریضہ ہے، جس کی بجا آوری کے لئے مکتب کے ساتھ مسجد کا تعاون لازم ہے ورنہ اس کو وہ تقدس حاصل نہ ہو سکے گا جس کا وہ سزاوار ہے بلکہ ایک نقطۂ نگاہ سے مسجد کو مکتب پر اولیت حاصل ہے۔ شروع میں مسجدیں ہی درس گاہوں کا کام دیتی تھیں۔ جب مکتب کہیں کہیں علیحدہ ہوئے تو ان میں بھی مسجدوں کی سی شانِ تقدس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

مسجد

مفہوم: مسجد کے لغوی معنی ہیں سجدہ گاہ۔ اس لحاظ سے ہر وہ جگہ مسجد ہے جہاں ایک مسلمان بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں سجدہ ادا کرتا ہے۔ ہر پاکیزہ جگہ مسلمان کی سجدہ گاہ ہو سکتی ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارے لئے ساری زمین مسجد بنائی گئی ہے[1]۔

اصطلاح میں مسجد اس جگہ کو کہتے ہیں جس کو جماعتی نماز کے لئے مستقلاً وقف کر دیا گیا ہو۔

مسجد میں جیم مکسور ہے۔ اگر جیم مفتوح ہو تو اس کے معنی وہ جگہ ہوں گے جہاں حالتِ سجدہ میں سر رکھا جاتا ہے جو اس وقت ہمارا موضوعِ بحث نہیں۔

مقاصد:

مسلمان پر پنج وقتہ نماز فرض ہے۔ سوائے مجبوری کے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ اذان سنتے ہی محلہ کی مسجد میں نمازِ باجماعت پڑھنے کے لئے مستعد ہو جانے کا حکم ہے۔

مسجد کے امام سے توقع رکھی جاتی ہے کہ علمِ دین سے واقف ہو۔ وہ محلہ کے بچوں کو دین کی ابتدائی تعلیم دیتا ہے۔ اہلِ محلہ کی مذہبی رہنمائی کرتا ہے اور ان کے شرعی مسائل کے حل کرنے کے لئے فتوے دیتا ہے۔ مسجد سے ہر مسلمان کا گہرا تعلق ہوتا ہے وہ اس کی زندگی میں مرکزی مقام رکھتی ہے۔

مسجد روحانی بالیدگی، اخلاقی طہارت بدنی پاکیزگی اور ماحول کی صفائی کی تصویر پیش کرتی ہے۔

مسجد نور کا مسکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں اپنی ذات کو نور سے تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ نور کی ارضی جلوہ گاہیں مساجد ہیں۔ حضرت ابنِ عباس رض کا قول ہے کہ مسجدیں زمین میں اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں۔ آسمان والوں تک ان کا نور اس طرح پہنچتا ہے جیسے ستاروں کی روشنی زمین والوں تک (تفسیر خازن)۔ جنابِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے زمین کی سب جگہوں میں محبوب ترین جگہ مساجد ہیں[2]۔

---

[1] مسلم کتاب المساجد (شروع سے پانچویں حدیث) [2] مسلم کتاب المساجد باب فضل الجلوس فی مصلاہ بعد الصبح وفضل المساجد

مسجد کا اولین مقصد بے شک پنج وقتہ نماز ہے لیکن اسکے مقاصد اور فوائد کو صرف پنج وقتہ نماز تک محدود نہیں رکھا گیا۔ اس بارہ میں کچھ فقہی اختلافات ضرور ہیں لیکن ہمارے لئے فیصلہ کن چیز اُمّتِ اسلامیہ کا وہ متواتر عمل ہے جو صدیوں سے ہمارے سامنے ہے۔ اہل اسلام نے اسلام کے کسی دور میں مسجد کو محض نماز تک محدود نہیں رکھا۔ چھوٹے بڑے درس اور ملی اجتماع آئے دن مسجدوں میں ہوتے رہے ہیں جن میں وقت کے اَئمہ کرام بہ نفسِ نفیس شامل ہوئے۔

مسجد مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بنیادی اور اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہم اس کا جائزہ درج ذیل عنوانوں کے تحت لیں گے :

(۱) عبادت میں گہرائی :

عبادت اکیلے بھی ہو سکتی ہے لیکن جماعتی طور سے عبادت کرنے کا دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ سب افراد ایک دوسرے سے اثر انداز ہوتے ہیں اور دل کی محویت فزوں تر ہوتی ہے۔

(۲) مسجد دینی شعار ہے :

مسجد دینِ اسلام کی ایک درخشاں علامت ہے۔ اس کی عمارت میں سادگی کے باوصف ایک دل آویزی ہوتی ہے جو عبادت کی طرف مسلسل دعوت دیتی ہے۔ مسجد کے ساتھ تقدس وابستہ ہوتا ہے، اس کو دیکھتے ہی دل میں احترام اور محبّت کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔

قومی یا دینی شعار قوم و ملّت کے امتیاز اور خود آگاہی کو برقرار رکھنے میں اہم حصہ لیتے ہیں۔ ہر قوم اپنے شعار سے محبّت کرتی ہے اور اس کی آن پر جان دیتی ہے۔ یہ اس کی ملی بیداری اور غیرت کا ثبوت ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر حساس اور غیرت مند مسلمان کے دل میں مسجد سے محبت رہتی ہے۔ وہ اس کی شانِ تقدس کو بلند سے بلند تر دیکھنا چاہتا ہے۔

مسجد سے پنج وقتہ اذان کی غلغلہ انگیز صدا اٹھتی ہے۔ اذان بھی اسلام کا ایک ممتاز شعار ہے۔ یہ سطوتِ اسلام کا مظہر ہے۔ مسلمان کے دل میں تکبیر کا ہر نیا غلغلہ ایمان کا ایک تازہ جوش برپا کرتا ہے۔ ادھر اسلام کے دشمنوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اذان کی آواز پر تلملا اٹھتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں ایسے لمحات کی کمی نہیں جب ہم نے اعداء کی مہیب فوجوں کو صرف تکبیر کے نعروں سے لرزا کر مغلوب کیا۔

(۳) مسجد مسلمان کا پہلا مکتب ہے :

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسلام میں پہلا مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ مسجد النبیؐ میں تھا۔ اس کو صُفّہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپؐ کی زندگی میں مدینہ میں اور بھی

مسجد میں بن گئی تھیں۔ ان مسجدوں میں بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔

مسلمان بچے کو سب سے پہلے جس چیز کی تعلیم دی جاتی ہے وہ قرآن شریف ہے۔ ابنِ خلدون لکھتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی تعلیم اہل اسلام کا شعار ہے۔ اسلام کی تقریباً پہلی تین صدیوں میں مسجد ہی درس گاہ ہوتی تھی۔ جب نئی درسگاہ کی ضرورت ہوتی تو ایک اور مسجد بنا لیتے تھے۔ یعنی عبادت اور تعلیم اسلام میں لازم و ملزوم ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں جاکر الگ مدرسوں کا اہتمام ہونے لگا۔

ہر مسجد کے ساتھ عام طور سے کمرے ہوتے ہیں۔ یہ طلبہ کی اقامت گاہوں کا کام دیتے رہے ہیں۔ یہاں جو نادار طلبہ مقیم ہوتے ہیں قوم کی طرف سے ان کے خرچ کا بھی انتظام ہوتا ہے۔

(۴) اسلامی ثقافت :

مسجد اسلامی ثقافت سے بہرہ مند کرتی ہے۔ اسلامی ثقافت کی روح و رواں تین چیزیں ہیں:

پاکیزگی ۔ سادگی ۔ مساوات اور ہمدردی ۔

ان تینوں چیزوں کی تعلیم کا آغاز اور تکمیل مسجد ہی میں ہوتی ہے۔

پاکیزگی : نماز کے لئے وضو لازم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پاکیزگی کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اگر میں اپنی اُمت پر شاق نہ جانتا تو ہر نماز کے لئے مسواک ضروری قرار دیتا۔

مسجد میں آنے سے پہلے نمازی اس بات کا اہتمام کرلیتا ہے کہ کپڑے پاکیزہ ہوں اور جسم پر کوئی غلاظت نہ ہو۔ اس پنج وقتہ اہتمام سے دل میں پاکیزگی کا جذبہ راسخ ہو جاتا ہے۔

سادگی : نماز ادا کرنے کے لئے سب تکلفات برطرف کرنے پڑتے ہیں۔ ریشمی لباس اور طلائی انگوٹھی وغیرہ سے بھی احتراز کرنے کا حکم ہے ورنہ نماز کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مسجد میں اٹھنا بیٹھنا نہایت سادگی سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سادہ لباس اور سادہ ہیئت میں جائے۔

مساوات اور ہمدردی : مسجد میں ہر طبقہ کے لوگ شانہ بشانہ شریکِ نماز ہوتے ہیں۔ امیر و غریب اور حاکم و محکوم کی تفریق نہیں ہوتی۔ کسی شخص کو اجازت نہیں کہ اپنی جگہ کسی امیر آدمی کے لئے خالی کرے۔ اصحابِ رتبہ اور اصحابِ دولت کے دماغ سے کبر و نخوت کا نشہ اگر مٹ نہ جائے تو کم ضرور ہو جاتا ہے۔

(۵) آداب کی تعلیم :

مسجد میں متفرق آداب بالخصوص معاشرتی آداب کی دیر پا تعلیم ملتی ہے۔ ہر شخص نہایت

مؤدب ہو کر مسجد میں داخل ہوتا ہے۔ بھاگ کر آنے کی اجازت نہیں چاہے نماز کا وقت نکل رہا ہو۔ سلیقہ اور وقار کے ساتھ آنے کا حکم ہے۔ نماز بذاتِ خود سلیقہ اور خود اطواری کی مظہر ہے۔

مسجد کے آداب سے تقدس وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں جو آداب سکھے جاتے ہیں ان کی عمر بھر حفاظت کی جاتی ہے۔

(۶) پابندیِ اوقات :

نماز باجماعت کے اوقات مقرر ہیں۔ جن میں کسی کے جاہ و مرتبہ کے لئے کوئی رعایت نہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وقت پر ادا شدہ نماز کو افضل اعمال میں شمار فرمایا ہے[۱] آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے پانچ نمازوں اور ان کے رکوع و سجود اور اوقات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق جانتے ہوئے ان کا دھیان رکھا وہ جنت میں داخل ہوا[۲] اذان کی آواز کان میں پڑتے ہی مستعد ہو جانا چاہیئے۔

مسجد میں وقت پر پہنچنا ضروری ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ قسم اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ میں نے چاہا کہ حکم دوں اور ایندھن اکٹھا کیا جائے، پھر نماز کا کہوں اور اذان دی جائے، پھر کسی کو کہوں اور وہ نماز کی امامت کرے۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کی طرف جاؤں (جو گھروں میں بیٹھ رہے ہیں) اور ان کے ہوتے ہوئے ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔[۳]

(۷) تنظیم

نماز باجماعت کمال نظم و ضبط اور ترتیب کی طلب گار ہے۔ شانہ سے شانہ ملا ہوا ہو۔ ترتیب میں رخنہ نہ ہو، خوش نما صف بندی ہو۔ امام کی اطاعت میں تنظیم کی روح پوری طرح کارفرما ہو۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صفیں سیدھی باندھو اور آگے پیچھے نہ ہو ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔[۴] آپؐ نے صفوں کی درستی کو نماز کی تکمیل اور اس کا حسن قرار دیا ہے۔[۵] حضرت عمرؓ نے صفیں درست کرنے کے لئے تنخواہ دار ملازم رکھا ہوا تھا۔

جماعت کو دل کی خوشی سے محض رضائے الٰہی کی خاطر امام کی پیروی کرنی چاہیئے۔ حدیث ہے کہ امام کو اس کی پیروی کرنے کے لئے تو مقرر کیا جاتا ہے[۱] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے

---

[۱] ترمذی ابواب الصلوٰۃ [۲] الترغیب والترہیب، جزء ۱ [۳] ریاض الصالحین فضل صلاۃ الجماعۃ

[۳] مسلم کتاب الصلوٰۃ ، باب تسویۃ الصفوف ....

[۴] ایضاً

[۵] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب انما جعل الامام لیؤتم بہ۔

کہ کیا وہ جو امام سے پہلے سر اٹھاتا ہے اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کا سر بنا دے۔[1]

نماز میں انتہائی خاموشی اور سکون کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ نماز کے اشارہ ہی میں نہیں بلکہ امام کے خطبہ کے دوران میں بولنا منع ہے۔ اگر کوئی دوسرا آدمی بول اُٹھے تو اسے بھی اشارہ سے منع کیا جائے جناب ہادیِ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جمعہ کے روز امام خطبہ دے رہا ہو اور تو نے اپنے ساتھی سے کہا کہ چپکا رہ تو تُو نے لغو حرکت کی۔[2] مطلب یہ کہ اسے اشارہ سے خاموش کرو۔

(۸) خود ضبطی :

مسجد میں آداب و قواعد کی جو پابندی کی جاتی ہے وہ کسی قانونی گرفت کے خوف سے نہیں بلکہ صرف تقویٰ کے جذبہ سے ہوتی ہے۔ اس سے خود ضبطی کی تربیت ملتی ہے۔ انسان میں اپنے جذبات اور میلانات کو قابو میں رکھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے اور وہ معاشرہ اور حکومت کی پابندیوں کو بھی خوشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

(۹) شیرازہ بندی :

مسجد میں آنے والے سب مُسلمان ایک ہی نصب العین کے پابند ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جو اُخوت کا سنگِ بنیاد ہے۔ ناآشناؤں سے شناسائی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ اور مسائل کی خبر ملتی ہے۔ تعاون کا جذبہ پنپتا ہے۔ تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ رشتۂ اُخوت مضبوط تر ہو جاتا ہے۔

(۱۰) ملّی شکوہ :

جماعتی شیرازہ بندی سے اپنے بیگانے ہر ایک میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ میں کس قدر اخوت اور ہمدردی ہے۔ اہلِ اسلام کے ملّی شکوہ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ ان کی ہمت بڑھتی ہے اور اغیار مرعوب ہوتے ہیں۔

(۱۱) روح و مادہ میں توازن :

مسجد انسان کی کاروباری مصروفیتوں کی یک رُخی کو مٹا کر کاروبار اور عبادت میں صحیح توازن پیدا کرتی ہے۔ دل ہر وقت دنیا میں اُلجھا نہیں رہتا بلکہ اللہ تعالےٰ کو بھی یاد کر لیتا ہے۔

---

[1] مسلم کتاب الصلوٰۃ، باب سبق الامام برکوع ..... بخاری۔
[2] بخاری، کتاب الجمعہ۔ باب الانصات ...، مسلم

اس سے کاروبار میں نیکی کا عنصر غالب رہتا ہے۔

مکتب

مفہوم : مکتب یا مدرسہ تعلیم کی جگہ کو کہتے ہیں۔ بعض اہلِ علم کے خیال میں مکتب ابتدائی درس گاہ اور مدرسہ بڑی درس گاہ کے معنی رکھتا ہے لیکن یہ فرق ضروری نہیں۔ بالخصوص موجودہ دور میں مکتب اور مدرسہ ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔

اہمیت : قوموں کی تاریخ میں مکتب کو نہایت بلند اور معزز مقام حاصل ہوتا ہے۔ اقوام اپنے ممتاز مکاتب اور ان کے تعلیمی کارناموں پر ناز کرتی ہیں۔ اچھے مکاتب کا تاریخ پر گہرا اثر ہوتا ہے اور دیرپا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ قوم کو ایک نئی زندگی اور نئی حرکت عطا کرتے ہیں۔ ان سے علماء فارغ ہو کر نکلتے ہیں۔ وہ تعمیری کارناموں میں نمایاں حصہ لیتے ہیں اور تاریخ کی لوح پر اپنا نام ثبت کر جاتے ہیں مدرسہ سے اس کے فارغ طلبہ کو عمر بھر عقیدت رہتی ہے۔ وہ مدرسہ کی زندگی اور اساتذہ کا خیال جب بھی دل میں لاتے ہیں ان کے سینے عقیدت اور محبت کے جذبات سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ طالب علمانہ زندگی کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ یہ تصویر ہمیشہ دل کے کسی گوشے میں محفوظ پڑی رہتی ہے اور انسان کے خیالات اور احساسات پر اثر ڈالتی رہتی ہے۔ کوئی چیز جس قدر محبوب ہو اسی قدر زیادہ عمیق اثر پیدا کرتی ہے۔ مدرسہ سے انسان کو اس قدر محبت ہوتی ہے کہ جب کبھی اس کی یاد دل میں آتی ہے جی یہی چاہتا ہے کاش طالب علمی کے دن لوٹ آئیں۔ اگر ہم کسی قوم کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی پوری تصویر کاغذ پر کھینچ سکیں تو اس میں مکتبوں اور مدرسوں کے نقوش جا بجا نظر آئیں گے۔

مکتب انسانی زندگی کے متعدد شعبے تعمیر کرتا ہے مثلاً :

(۱) علم (۲) اُخوت (۳) نظم و ضبط (۴) آداب
(۵) استاد کا اخلاقی اثر (۶) جسمانی صحت (۷) گھریلو زندگی کی تربیت

ہم ان پر ذیل میں فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے۔

(۱) علم :

علم کا اکتساب یوں تو گھر پر بھی استاد کے زیر نگرانی ممکن ہے اور کتابیں خرید کر ذاتی طور سے

مطالعہ کیا جا سکتا ہے، لیکن جماعت میں بیٹھ کر علم حاصل کرنے کے جو فوائد ہیں وہ انفرادی تعلیم میں نہیں۔ بچے کو تنہا بٹھا کر پڑھنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اکتا جاتا ہے اور اس کو پڑھائی میں وحشت ہونے لگتی ہے۔ بچے طبعاً جماعت پسند ہوتے ہیں۔ بالخصوص ہم عمر بچوں کی صحبت میں وہ چہک اٹھتے ہیں۔ اور ان کے قویٰ جولانی دکھانے لگتے ہیں۔ بچے کی ذہنی اور بدنی صلاحیتیں اس کے ہم عمر لڑکوں میں خوب پروان چڑھتی ہیں۔ اس کو الگ رکھا جائے تو وہ اپنی زندگی کے حصار میں مقید ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کے دائرہ میں وسعت پیدا نہیں ہوتی۔ سلاطین اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام محل میں خاص اساتذہ کے زیر اہتمام کرتے تھے۔ لیکن یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کے ساتھ ہم عمر اور ہم سبق بچے بھی شامل ہوں۔ چاہے یہ بچے شاہی خاندان اور امراء و وزراء ہی کے ہوں۔

بچہ کو جب شروع میں علم پر لگایا جاتا ہے تو اس کی آزاد طبیعت علم کو ایک بوجھ سمجھتی ہے۔ اس کے کندھے پر یہ عظیم بوجھ رکھ کر اسے اگر تنہا بٹھا دیا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ پہاڑ کے نیچے دب گیا ہوں۔ لیکن جس وقت وہ جماعت میں آکر شریک ہوتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ زندگی کی اس مہم میں وہ اکیلا نہیں، اس کے سینکڑوں رفیق ہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ہم جماعت ساتھی اس کا بوجھ ہلکا کر رہے ہیں۔ یہ بوجھ صرف خیالی طور سے نہیں حقیقی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مثلاً سبق یاد کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ بعض وقت ایک بات کو کتاب سے بار بار پڑھتے ہیں لیکن حافظہ میں نہیں بیٹھتی لیکن اسے دوسرے کی زبان سے سنتے ہیں تو ہمیشہ کے لئے ازبر ہو جاتی ہے۔ طالب علم اپنے ساتھیوں کی زبان سے جو کچھ سنتا ہے وہ آسانی سے، بغیر کسی کوفت کے، اس کے ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ مکتب میں طلبہ کے باہم دور کرنے کا عام رواج ہوتا ہے۔ اس دور کے بیش بہا فوائد ہیں۔ طلبہ کی یادداشت اور فہم پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ طبیعت پر بوجھ نہیں ہوتا اور سبق میں جی لگتا ہے۔ علم سے رغبت پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ روح میں سما جاتا ہے۔

قرآن شریف کو آدمی اکیلے بیٹھ کر پڑھے تو بے شک اس کی شیرینی سے روح کیف یاب ہوتی ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم دوسرے کی زبان سے یہ کلام سنتے ہیں تو ایک اور ہی عالم طاری ہو جاتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہا کسی صحابیؓ کو حکم دیتے کہ قرآن کی تلاوت کریں، آپؐ ان کی زبان سے کلام الٰہی سن کر محظوظ ہوتے۔ ہر سال رمضان کے مبارک مہینہ میں حضرت جبرئیلؑ تشریف لاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرآن حکیم کا دور کرتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ لوگ جب کسی مسجد میں جمع ہوتے ہیں، مل کر قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں اور

اس کو آپس میں دَور سے پڑھتے ہیں تو ان پر تسکین نازل ہوتی ہے اور اللہ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے، فرشتے ان کو چھپا لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے مقربین میں یاد کرتا ہے[1] قرآنِ حکیم کا علم افضل علم ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی جو علم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اختیار کیا جائے۔ وہ دین کے ذیل میں آجاتا ہے۔ جب کوئی جماعت اس علم کے لئے باہم بیٹھتی ہے تو جیسا کہ گذشتہ سطور میں گذر چکا ہے: وہ سکون اور راحت محسوس کرتی ہے۔ نہ صرف علم سے بلکہ معلّم، مکتب اور ہم جماعتوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ جہاں یہ محبت پیدا ہو جائے وہاں برکت اور کامیابی کا نصیب ہو جانا لازم ہے۔ جناب ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے:

یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ ترجمہ: جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے[2]

(۲) اخوت:

مکتب ایک نئی برادری کی بنیاد رکھتا ہے جس میں محبت کا اتنا قوی اثر ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر برقرار رہتی ہے۔ ہم جماعت کے ساتھ پائیدار اُنس ہوتا ہے۔

ہم جماعتوں کی ایک مستقل برادری قائم ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ایک مکتب کے جس قدر قدیم طلبا رہوتے ہیں ان کی بھی ایک برادری وجود میں آجاتی ہے۔ دو آدمیوں کو جب اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں تو ان میں ایک قلبی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر اس قدر خوشی محسوس کرتے ہیں جیسے گم کردہ متاع ہاتھ آگئی ہو۔ کئی مدرسوں اور کالجوں میں طلبۂ قدیم کی انجمنیں ہیں۔ یہ انجمنیں ایک وسیع برادری کی ضامن ہوتی ہیں۔ ان کا سال میں عموماً ایک بار اجتماع ہوتا ہے۔ جہاں بچھڑے ہوئے دوست آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ اور تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔

اس اخوت کی بناء ہمیشہ مدرسہ کا اشتراک ہی نہیں ہوتا بلکہ بارہا معلّم کا اشتراک بھی ہوتا ہے بعض معلّمین کا علم کی تاریخ اور شاگردوں کی زندگی پر نمایاں اثر ہوتا ہے۔ شاگرد ان کے دامنِ فیض سے وابستہ ہونے کو مایۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے استاد کا نام فخر سے لیتے ہیں اور اس کے دیگر شاگردوں سے محبت رکھتے ہیں۔ چاہے انہوں نے ایک ہی مکتب میں اس استاد سے نہ پڑھا ہو۔ بارہا ان اساتذہ کا علمی اثر شاگردوں کی آئندہ نسلوں میں بھی متوارث ہو جاتا ہے اور اس خاندان کے لوگ

---

[1] اربعینِ نووی بحوالہ مسلم۔ [2] الجامع الصغیر سیوطی

فخر کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں بزرگ نے فلاں عالم سے فیض پایا تھا۔

مکتب یا معلم کے دائرۂ اثر کی اُخوت وسیع اور مستحکم ہوتی ہے اور پشتوں تک باقی رہتی ہے۔

(۳) نظم وضبط :

مکتب کی زندگی انضباط کی تصویر ہوتی ہے۔ طالب علم کے دل میں آہستہ آہستہ نظم وضبط کی روح گھر کی جاتی ہے۔ وہ نظم وضبط کی ضروری جزئیات عمر کے ابتدائی حصہ میں سیکھ لیتا ہے، اور زندگی بھر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان جزئیات کا احاطہ مشکل ہے ان میں بعض درج ذیل ہیں :

معلّم کی اطاعت ۔

وقت پر آنا ۔ نظام الاوقات کی پابندی۔

وقت ضائع نہ کرنا۔

روز کا کام روز کرنا ۔

جماعت میں سکون سے بیٹھنا ۔

ساتھیوں کے حقوق کا خیال رکھنا ۔

کسی پر زیادتی نہ کرنا ۔

بغیر رخصت کے جماعت سے باہر نہ جانا ۔

چھٹی لیے بغیر مکتب سے غیر نہ ہونا ۔

کھیل کے میدان میں قواعد کا پابند ہونا ۔

وقت پر سونا ۔

وقت پر جاگنا ۔

اعتدال سے سونا ۔

اعتدال سے کھانا

(۴) آداب :

مکتب میں انسان شائستہ آداب اور نیک اطوار سیکھتا ہے۔ اساتذہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کے سلیقہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ آدابِ مکتب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں چند درج ذیل ہیں :

اساتذہ کی تعظیم : اس تعظیم کا یہ اثر ہوتا ہے کہ عام بزرگوں کی تعظیم بھی اخلاق کا جزو ہو جاتی ہے۔

اَدب سے بولنا۔
بدزبانی نہ کرنا ۔
صفائی رکھنا
سلیقہ سے اُٹھنا، بیٹھنا اور چلنا پھرنا۔
بغیر ضرورت کے نہ کھانسنا، نہ تھوکنا اور نہ ناک صاف کرنا ۔
اپنی پڑھائی میں دھیان رکھنا، توجہ اِدھر اُدھر نہ ہٹانا۔
کتابوں اور کاپیوں کو صاف اور سلیقہ سے رکھنا ۔

(۵) اُستاد کا اخلاقی اثر :

وہی علم صحیح علم ہے جو روحانیت کو بلند کرتا ہے۔ اس لئے معلّم کا نیک اور بلند اخلاق ہونا ضروری ہے ورنہ نظام تعلیم میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ معلّم سے جس روحانی رفعت اور اخلاق پاکیزگی کی توقع کی جاتی ہے۔ اس کی توقع والدین سے بھی نہیں ہوسکتی۔ والدین کا دائرہ اثر گھر کی چاردیواری تک ہوتا ہے۔ معلّم پوری ملّت پر اثر انداز ہونے کا بیڑا اٹھاتا ہے اس لئے اس کے اخلاق میں چودھویں کے چاند کی سی تنویر ہونی چاہیئے تاکہ وہ سارے عالم کو اپنے پاکیزہ، جاں فزا اور روح پرور نور سے سیراب کر سکے۔ اسلام نے اخلاق کے ایسے بے نظیر معلّم پیدا کئے ہیں کہ وہ کسی اور مذہب میں ہوتے تو لوگ انہیں دیوتا یا پیغمبر تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔
اسلامی نقطۂ نگاہ سے معلّم میں درج ذیل اوصاف کا ہونا لازم ہے۔

(ا) خوفِ الٰہی :

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امام ابوحنیفہ رح کا ایک بچّے کے پاؤں پر پاؤں آگیا۔ بچّے نے چیخ کر کہا، اللہ سے نہیں ڈرتا۔ امام ابوحنیفہ رح غش کھا گئے۔ اسلام اپنے اساتذہ سے اسی قسم کے خوفِ الٰہی کا طالب ہے۔

(ب) شریعت کی پابندی :

اسلام میں متعدد ایسے علماء کرام گزرے ہیں کہ ان کے اقوال ہی نہیں، افعال بھی شریعت میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

(ج) وقار اور متانت :

خلیفہ ہارون الرّشید نے امام مالک رح سے درخواست کی کہ میرے پاس حاضر ہو کر مجھے

حدیث پڑھایئے۔ امام مالکؒ نے انکار کیا اور فرمایا، علم کو پست نہ کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تجھے پست کر دے گا۔

(د) قربانی :

اسلام کی آن کی خاطر علماء کرام نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ نے اس راہ میں جو شدائد اٹھائے ہیں اُن کے ذکر سے زہرہ گداز ہوتا ہے۔

(س) شفقت :

استاد والدین سے بھی بڑھ کر شفیق ہوتا ہے۔ والدین کے دو چار بچے ہوتے ہیں لیکن استاد کے ذمے سینکڑوں شاگردوں کی نگرانی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا قلب وسیع ہوتا ہے۔ شاگردوں سے اپنے بچے سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہے۔

ہر صاحبِ اخلاص شخص میں یہ طبعی وصف ہوتا ہے کہ وہ دیگر لوگوں کو بھی نیک اخلاق سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔ معلّم کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ طلبہ کی سیرت کو اس حد تک بلند کرے کہ ملت اسلامیہ کو ان پر ناز ہو۔ اسلام میں ایسے معلّمین کا شمار نہیں جنہوں نے قوم کے اخلاق میں انقلاب پیدا کر دیا۔

(ح) جسمانی صحت :

ہر مکتب کا ایک مقرر نظام الاوقات ہوتا ہے۔ نظام الاوقات بناتے وقت طالب علم کی زندگی کے سب شعبوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ جسمانی ریاضت کو خصوصیت سے وقت دیا جاتا ہے۔ تاکہ طلبہ کی صحت قائم رہے۔ پہلے زمانے میں زندگی کا ڈھب ہی ایسا تھا کہ طلبہ کی صحت ٹھیک رہتی تھی۔ وہ محنت اور مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے نظام الاوقات میں جسمانی ریاضت کو خصوصیت سے الگ وقت نہیں دیا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی انہیں شمشیر زنی اور شاہسواری کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی۔ ہمارے اسلاف میں ایسے علماء کی کمی نہیں جو میدان جہاد میں سپاہیانہ شان سے نکلتے تھے۔

(ط) گھریلو زندگی کی تربیت :

کئی مکتبوں کے ساتھ اقامت گاہیں ہوتی ہیں۔ یہاں طالب علم کو چھوٹے پیمانے پر گھریلو زندگی کی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ ضرورت بھر کا مختصر سامان سنبھالنے، خورد و نوش کا انتظام کرنے، پوشاک اور اس کی دُھلائی اور حفاظت وغیرہ کی اسے زندگی میں پہلی بار تربیت ملتی ہے اور وہ سیکھتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کیسے کھڑا ہو۔

اُستاد اور شاگرد کے حقوق و فرائض

اُستاد کے حقوق (شاگرد کے فرائض)

جماعتی تدریس کرنے والے اُستاد کے شاگردوں پر بہت سے حقوق ہوتے ہیں جن کو شاگردوں کے فرائض بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے چند اہم حقوق درج ذیل ہیں:

۱۔ اُستاد کی علمی قابلیت پر اعتماد:

استاد کا اپنے شاگردوں پر سب سے پہلا حق یہ ہے کہ وہ اس کی علمی قابلیت پر اعتماد کریں، یہ اعتماد تعلّم و تعلیم کی شرطِ اوّلیں ہے۔ اگر استاد پر اعتماد ہی نہ ہو تو استاد کیا سکھا سکتا ہے اور شاگرد بھی اس سے کیا سیکھ سکیں گے۔ لہٰذا شاگردوں پر لازم ہے کہ وہ مکمل اعتماد کے ساتھ استاد سے وہ کچھ لیتے جائیں جو کہ وہ انہیں سکھاتے، اس کو چیلنج نہ کریں، نہ اس سے سوال پوچھیں جن کے پیچھے تعلّم کے بجائے استاد کا امتحان لینے کا مقصد کارفرما ہو۔ ہر معاملے میں استاد کی رائے کو وقیع جانیں۔ اگر کبھی ایسی صورت حال درپیش ہو جائے کہ شاگرد ذہنی اعتبار سے استاد سے زیادہ تیز ہو اور ایک خاص شعبے میں اس کی معلومات استاد سے زیادہ ہوں تو شاگرد کو چاہیئے کہ استاد پر بے اعتمادی کا اظہار کرنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ کسی اور استاد سے کسبِ فیض کرنا شروع کر دے۔ استاد پر عدم اعتماد کا اظہار اس کو بحیثیت استاد کے قتل کرنے کے مترادف ہے، اس کے بعد وہ تدریس کے فرائض انجام دینے کے قابل نہ رہے گا۔

۲۔ اُستاد کی اطاعت:

اُستاد کا حق ہے کہ شاگرد اس کی اطاعت کریں اور شاگردوں پر لازم ہے کہ اپنے اُستاد کے حکم کی تعمیل کریں۔ تدریس کے سلسلے میں اُستاد کی ہدایت پر بلا چون و چرا عمل کریں۔ استاد بہتر جانتا ہے کہ کس مرحلے میں کونسا کام شاگردوں کے لئے بہتر ثابت ہوگا، جس طرح ڈاکٹر یا طبیب کو بہتر طور پر اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مریض کو کس وقت کونسی دوا استعمال کرنی چاہیئے۔ اگر شاگرد اپنی مرضی کریں گے اور استاد کے احکام و ہدایات پر عمل نہ کریں گے تو وہ علم حاصل نہ کر سکیں گے۔ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: جس سے میں نے ایک حرف بھی سیکھا میں اس کا غلام ہوں۔

۳۔ ادب و احترام:

استاد کا مقام تعظیم و تکریم کا مقام ہے، یہ پیغمبرانہ منصب ہے۔

اگر شاگرد تہ دل سے اپنے استاد کا احترام نہ کرے گا تو وہ علم کی دولت سے محروم رہے گا۔ ادب و احترام کے ضمن میں تو استاد کا درجہ باپ سے بھی بڑھ کر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

" دنیا میں تمہارے تین باپ ہیں، ایک وہ جو تمہاری پیدائش کا باعث ہے، دوسرا وہ کہ جس نے تمہارے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی اور تیسرا وہ کہ جس سے تم نے علم حاصل کیا اور ان تینوں میں سے بہترین تمہارا اُستاد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ تو عام طور پر جسمانی پرورش کرنے کی خدمت سرانجام دیتا ہے جب کہ اُستاد اس کی ذہنی و روحانی پرورش کرتا ہے لہٰذا شاگرد کو چاہیئے کہ وہ اپنے استاد کی اپنے باپ سے بڑھ کر عزت و احترام کرے: اس کے سامنے اونچی آواز میں بات نہ کرے۔ اس کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھے۔ کبھی کوئی گستاخانہ بات یا سوءِ ادب والی حرکت نہ کرے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ میرے اُستاد حماد جب تک زندہ رہے میں نے ان کے مکان کی طرف کبھی پاؤں نہیں پھیلائے۔ اُستاد کی اس قدر تعظیم و توقیر کرنے سے مرتبہ بھی تو اللہ نے انہیں نہایت بلند اور ارفع عطا فرمایا، امام اعظم کہلائے، جس محلے میں رہتے تھے اس محلے کا نام اعظمیہ پڑ گیا، اور آج بھی کروڑوں مسلمان ان کے فقہی مسلک کے پیرو اور ان کے نام کی نسبت سے حنفی کہلاتے ہیں۔ سچ ہے کہ با ادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔

۴۔ غیر ضروری سوالات سے احتراز:

شاگردوں کو اپنے استاد سے صرف سمجھنے اور علم میں اضافے کی غرض سے سوالات پوچھنے چاہئیں اور غیر متعلق اور غیر ضروری سوالات پوچھنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ استاد نے جو سبق پڑھایا ہو اس میں جو باتیں سمجھ نہ آئی ہوں ان کے بارے میں سوالات کرنے چاہئیں یا اس سبق سے متعلق کوئی سوال کرنا چاہیئے۔ غیر ضروری اور غیر متعلق سوالات پوچھنا سوءِ ادب ہے اور اس سے ممکن ہے کہ استاد مشکل اور پریشان کن صورت حال سے دوچار ہو جائے۔ استاد عالمِ کل نہیں ہوتا کہ وہ ہر طرح کے سوالات کا جواب دے سکے، جو سبق اس نے پڑھایا ہے اس کے بارے میں اس کی معلومات لازماً کافی ہوں گی۔ مگر ضروری نہیں کہ دوسرے موضوعات پر بھی اسے کافی معلومات حاصل ہوں یا اس کا علم مستحضر ہو۔ اگر شاگرد سوال پوچھے اور استاد کو اس کا جواب نہ آتا ہو تو اس سے استاد کو شرمندگی لاحق ہو سکتی ہے۔ اور اس کا بحیثیت استاد اپنے اوپر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سوال پوچھنے والے شاگرد کے علاوہ دوسرے شاگردوں کا بھی اُستاد پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ ایسی صورت میں تعلّم و تعلیم دونوں ممکن نہ رہیں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم

سے قومِ موسیٰؑ کی طرح غیر ضروری سوالات پوچھنے سے منع فرمایا ہے، مسلمان طلبہ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے۔

۵۔ آدابِ مجلس :

شاگرد کا فرض ہے کہ استاد کے حضور میں مجلس کے آداب کو ملحوظ رکھیں۔ تلامذہ کو استاد کے سامنے بیٹھنے کے یہ آداب معلّمِ انسانیت، حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلس سے سیکھنے چاہئیں۔ صحابہ کرامؓ کا بیان ہے کہ وہ مجلس نبوی میں اس طرح بیٹھتے تھے :

كَأَنَّ عَلَىٰ رُءُوسِنَا الطَّيْرُ

" گویا ہمارے سروں پہ پرندے بیٹھے ہیں"۔ (صحیح بخاری)

اس کا مطلب ہے کہ نہایت متوجہ اور ہمہ تن گوش ہو کے بیٹھتے تھے۔ گویا کہ سروں پر پرندے بٹھا رکھے ہیں کہ ذرا حرکت کی تو وہ اڑ جائیں گے۔ استاد کے سامنے دھیمی آواز اور تواضع وانکسار کے ساتھ بات کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں صحابہ کرامؓ کو تلقین کی تھی کہ اپنی آواز کو نبیؐ کی آواز سے اونچا مت ہونے دو اور آپؐ کے ساتھ اس طرح اونچی آواز میں باتیں نہ کرو جس طرح آپس میں کرتے رہتے ہو۔ نبی کریمؐ صحابۂ کرام کے معلّم تھے۔ لہٰذا اس سے یہ اصول اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان تلامذہ کو چاہیئے کہ کبھی اپنی آواز کو استاد کی آواز سے اونچا نہ ہونے دیں، بلکہ دھیمے لہجے میں اور شائستگی کے ساتھ بات کریں۔

اسی طرح جب استاد پڑھا رہا ہو تو اسے ٹوکنا نہیں چاہیئے۔ اس سے استاد کا فکری تسلسل منقطع ہو جاتا ہے۔ سبق سے اس کا دھیان ہٹ جاتا ہے۔ کسی شاگرد کو کوئی ایسی حرکت بھی نہیں کرنی چاہیئے جس سے استاد کا دھیان سبق سے ہٹ جائے۔

۶۔ خدمت :

اُستاد کی خدمت کرنی چاہیئے، جس حد تک بھی ممکن ہو۔ پہلے زمانے میں تو شاگرد اپنے اُستاد کی جُوتیاں سیدھی کیا کرتے تھے۔ محبّت و احترام کے جذبے کے ساتھ استاد کی خدمت کیا کرتے تھے۔ اور استاد کی خدمت کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت و خوش بختی سمجھتے تھے۔ اب بھی شاگردوں کو چاہیئے کہ استاد کی خدمت کریں۔ جب وہ تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد برسرِ روزگار ہو جائیں تو اپنے اساتذہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں، خلوص و محبّت کے اظہار کے لئے کبھی کبھار اپنے اُستاد کو حسبِ توفیق کوئی تحفہ دے دیں۔ استاد کا درجہ باپ کے برابر ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے تو جب حقیقی باپ کی خدمت کرنے کا حکم ہے تو استاد کی خدمت کرنا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے اور

مقصد صرف خلوص و محبّت کا اظہار ہونا چاہیئے۔

۷۔ دُعائے خیر :

دنیا میں انسان کا خیر خواہ والدین اور اساتذہ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا۔ جس طرح والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا کامیاب زندگی بسر کرے، ترقی کرے، عزت و شہرت پائے بلکہ ویسے ہی استاد کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا شاگرد زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔ والدین، اور اُستاد دونوں کو بے لوث محبّت ہوتی ہے۔ باقی تمام رشتوں میں کوئی نہ کوئی غرض وابستہ ہوتی ہے۔ انسان کی ترقی اور کامیابی پر بسا اوقات حقیقی بھائی تک کو حسد ہونے لگتا ہے۔ لیکن والدین اور استاد کبھی حسد نہیں کرتے۔ اس لئے شاگرد کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے استاد کے ساتھ خلوص اور محبّت رکھے، والدین کی طرح استاد بھی اس کا محسن اور بہی خواہ ہے۔ اگر استاد زندہ ہو تو اس کے لئے نیک تمنّا رکھے، اس کی عدم موجودگی میں اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے اس کی درازیٔ عمر اور صحت و تندرستی کی دعا کرے۔ اگر فوت ہو جائے تو اس کے لئے دعائے مغفرت کرے، جیسے ہمیں اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

شاگرد کے حقوق اُستاد کے فرائض

جس طرح استاد کے حقوق ہیں، جو شاگرد کے فرائض ہیں، اسی طرح شاگرد کے بھی کچھ حقوق ہیں جو استاد کے فرائض شمار ہوتے ہیں۔ شاگرد کے چند اہم حقوق درج ذیل ہیں :

۱۔ شفقت و محبّت :

اُستاد اور شاگرد کا رشتہ ایسے ہی ہے جیسے باپ اور بیٹے کا۔ اگر بیٹے پر لازم ہے کہ باپ کی عزت و توقیر کرے تو باپ پر بھی لازم ہے کہ وہ بیٹے کے ساتھ شفقت و محبّت کے ساتھ پیش آئے۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ شاگرد کا فرض ہے کہ استاد کا ادب و احترام کرے تو استاد پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے شاگرد کے ساتھ شفقت و محبّت کا رویہ اپنائے۔ اگر استاد سنگدلی و سرد مہری اور بے اعتنائی کا رویّہ رکھے گا تو فطری بات ہے کہ شاگرد کے دل میں بھی اس کے لئے مطلوبہ عزت و احترام نہ ہو گا۔ مسلمان کو تو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے سے ہر چھوٹے پر شفقت کرے جب کہ استاد اور شاگرد کا تعلق تو بہت گہرا اور مضبوط ہے، لہٰذا شاگرد تو شفقت اور

نرمی کا بدرجۂ اولیٰ مستحق ہے۔ انسانی تعلقات دو طرفہ ہوتے ہیں، یک طرفہ کبھی نہیں چل سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ استاد تو نفرت اور لاپروائی کا برتاؤ کرے اور شاگرد پھر بھی استاد کی دل سے عزت کرے۔

۲۔ علمی قابلیت :

استاد کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو علم کی دولت سے مالا مال کرنے کی کوشش مسلسل کرتا رہے۔ اس نے اپنے شاگردوں کو فیض یاب کرنا ہے، جب اس کا اپنا دامنِ علم ہی تہی ہوگا تو وہ اپنے شاگردوں کو کیا دے سکے گا۔ اس ضمن میں اسے مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں :

(الف) کسی بھی شعبے کا علم ہو وہ جامد نہیں ہوتا، ہمیشہ ارتقا پذیر رہتا ہے، لہٰذا استاد کو چاہیئے کہ وہ مسلسل مطالعہ کرتا رہے اور اپنے شعبے کے علم کے جدید ترین رجحانات سے آگاہ رہے تاکہ اس کے شاگرد بھی اس علم میں ہونے والی پیش رفت سے باخبر ہو جائیں۔

(ب) تمام علوم کا باہم گہرا ربط اور تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے استاد کو چاہیئے کہ وہ اپنے مطالعے میں وسعت پیدا کرے اور دوسرے متعلقہ علوم کی اہم باتوں سے واقفیت حاصل کرے۔

(ج) کلاس میں تدریس کے لئے جانے سے پہلے سبق کو اچھی طرح تیار کر کے جائے خواہ وہ اس سبق کو ہزار مرتبہ پڑھا چکا ہو۔ اس سے ایک تو اس کو اچھی طرح استحضار ہو جائے گا اور دوسرے از سرِ نو تیار کرنے سے کوئی نیا نکتہ ذہن میں آ جائے گا۔

مختصر یہ کہ استاد کو ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس نے تشنگانِ علم کی پیاس بجھانی ہے۔ اس نے ان کو ذہن کی غذا فراہم کرنی ہے۔ جس طرح باپ اپنی اولاد کے لئے زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھا رزق کما کر فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح استاد پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی ذہنی غذا کما کر فراہم کرے تاکہ اس کے شاگرد علمی اعتبار سے تندرست و توانا ہوں۔ شاگرد ہمیشہ اسی استاد کی عزت کرتے ہیں جو قابل ہو۔

۳۔ محنت اور ذاتی ربط :

استاد کا فرض ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی تدریس محنت اور دلچسپی سے کرے۔ وہ کوشش کرے کہ جو کچھ وہ پڑھا رہا ہے وہ اس کے شاگردوں کے ذہن نشین ہو جائے۔ شاگردوں کے چہروں سے پتا چل جاتا ہے کہ ان کو بات سمجھ آئی ہے یا نہیں۔ اسی طرح استاد کو چاہیئے کہ ہر شاگرد کے ساتھ ذاتی ربط و تعلق قائم کرنے کی کوشش کرے تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ اس کا کوئی شاگرد کسی ذاتی اور نفسیاتی الجھن کی وجہ سے تو تعلیم میں پیچھے نہیں رہ رہا۔ شاگردوں کی کاپیاں وغیرہ چیک کرنے میں

بھی محنت سے کام لے۔

۴۔ تعلیمی و نفسیاتی اصولوں کا اطلاق :

استاد کو چاہیئے کہ تعلیم کے دوران میں تعلیمی و نفسیاتی اصولوں کو استعمال کرے۔ یہ اصول علماء و ماہرین نے برس ہا برس کی محنت و تحقیق کے بعد دریافت کئے ہوتے ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں مثلاً اسے تدریج کے اصول پر عمل کرنا چاہیئے، پہلے آسان، پھر قدرے مشکل، پھر اس سے مشکل۔ علم کو آسان اور زود فہم بنا کے پیش کرنا چاہیئے۔ شاگردوں کی ذہنی استعداد اور نفسیات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے اور اس طرح کے دیگر اصول۔ یعنی اسے ایسے تمام طریقے استعمال کرنے چاہئیں جو مفید ہوں۔

۵۔ مساوات :

استاد پر لازم ہے کہ وہ اپنے کسی شاگرد کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کرے بلکہ سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرے، کسی بھی وجہ سے ان میں کوئی تفریق نہ کرے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ لائق اور محنتی شاگرد استاد کو زیادہ اچھا لگتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے ہی اپنی توجہ کا مرکز بنالے اور دوسرے شاگردوں سے بے اعتنائی برتے بلکہ کمزور شاگردوں پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ اسی طرح امارت و غربت، یا مذہبی مسلک، برادری، علاقہ وغیرہ کسی بناء پر بھی کسی شاگرد کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کرنا چاہیئے۔

۶۔ سیرت و کردار کی عمدہ مثال :

اسلام میں تعلیم کا مقصد صرف معلومات فراہم کرنا ہی نہیں بلکہ تزکیہ یعنی اخلاقی تربیت ہے۔ اور اخلاقی تربیت محض زبانی وعظ و نصیحت کرنے سے نہیں ہوا کرتی۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ سب سے بڑی تلقین مثال ہوتی ہے۔ استاد کو چاہیئے کہ اپنے شاگردوں کے سامنے سیرت و کردار کی عمدہ مثال پیش کرے جس کی وہ تقلید کریں۔ معلمی پیغمبرانہ منصب ہے، تمام انبیاء کرام نے تعلیم و تزکیہ کا فریضہ انجام دیا۔ معلم اعظم آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی یہ فریضہ سرانجام دیا، مگر کیسے؟ محض زبانی وعظ و نصیحت سے نہیں بلکہ اپنے کردار و سیرت سے۔ آپؐ کے اخلاق کی عظمت کی گواہی تو خود ذاتِ باری تعالیٰ نے دی ہے:

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (آپ یقیناً عظیم اخلاق پر ہیں)

اسی طرح آپؐ کی حیات طیبہ کو اسوۂ حسنہ یعنی بہترین مثال قرار دیا ہے۔ اگر اُستاد کے

گفتار و کردار میں فرق ہوگا تو اس سے شاگردوں کی دل شکنی ہوگی، وہ بددل ہو جائیں گے۔

۷۔ سوال پوچھنے کا حق:

شاگردوں کو یہ حق حاصل ہے کہ فہمِ درس کے لئے ضروری اور متعلقہ سوال اپنے استاد سے پوچھیں اور استاد کا فرض ہے کہ وہ ان سوالات کے اطمینان بخش جواب دے، جب تک سوال پوچھنے والے شاگرد کی پوری طرح تسلی نہ ہو جائے استاد کو چین نہیں آنی چاہیئے۔ متعلقہ اور ضروری سوالوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے کیونکہ شاگرد کو اگر بات سمجھ نہیں آئی تو اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ اپنے اُستاد سے پوچھے۔ اگر وہ اپنے اُستاد سے سوال نہ پوچھے گا تو پھر کس سے پوچھے گا۔ اس کو جھڑکنا یا ملامت نہیں کرنی چاہیئے کہ تمہیں یہ بھی نہیں آتا۔ نہ ہی استاد کے چہرے سے ایسا کوئی تاثر ملے کہ اُستاد نے سوال پوچھنے کو پسند نہیں کیا۔ اس ضمن میں یہ بات استاد کے ذہن میں رہنی چاہیئے کہ سوال کا درست جواب دے، اگر بالفرض اسے اس سوال کا جواب معلوم نہیں تو غلط جواب دینے کے بجائے صاف بتا دے کہ اسے اس کا جواب معلوم نہیں اور وہ کل کو معلوم کر کے بتائے گا۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

"اگر کسی نے بغیر علم کے مسئلہ بتایا تو اس کا وبال بتانے والے کے اوپر ہوگا۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ میں مسلسل دو سال تک ارادہ کرتا رہا کہ امیرالمومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث کی بابت سوال کروں مگر آپ کے رعب کی وجہ سے میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر ایک حج کے موقع پر جب وہ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر واپس ہونے لگے تو میں نے جی کڑا کر کے کہا: امیرالمومنین دو سال سے ایک حدیث کے متعلق سوال پوچھنے کا ارادہ کئے ہوئے ہوں مگر آپ کے رعب کی وجہ سے بات نہیں کر سکا۔ فرمایا: یوں نہ کہا کرو، جو کچھ پوچھنا ہو بلا جھجک پوچھ لیا کرو، علم ہوگا تو بتا دوں گا ورنہ کہہ دوں گا کہ مجھے معلوم نہیں۔ لہٰذا سوال کو اپنی انا یا عزت کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیئے اور غلط جواب دینے سے لازماً احتراز کرنا چاہیئے۔

۸۔ اخلاقی تربیت:

استاد کو صرف اپنے مضمون کی معلومات فراہم کرنے تک ہی اپنی تدریسی سرگرمی کو محدود نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ اسے یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ شاگردوں کی اخلاقی تربیت بھی اس کی ذمے داری ہے۔ اسلام میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ یعنی اخلاقی تربیت کو بھی لازم قرار دیا

اخلاقی تربیت کے لئے ایک تو سیرت وکردار کی اعلیٰ مثال پیش کرنا ضروری ہے، جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے چاہیئے کہ گاہ بہ گاہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اقدار عادلنشیں انداز سے پرچار کرتا رہے۔ استاد کی بتائی ہوئی باتیں عام طور پر ذہنوں میں راسخ ہوجاتی ہیں اور عمر بھر محفوظ رہتی ہیں، جن سے رہنمائی ملتی رہتی ہے۔

سوالات

۱۔ اسلام میں تعلیم کے کیا مقاصد ہیں؟ (یا اسلام میں تعلیم کی نوعیت کیا ہے)؟
۲۔ اسلام میں تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے اس پر مفصّل نوٹ لکھیئے۔
۳۔ قرآن وحدیث کے حوالے سے اسلامی معاشرے میں تعلیم کی نوعیت واہمیت بیان کیجئے۔
۴۔ اسلامی معاشرے میں مسجد کے کردار (یا اس کی اہمیّت) کو بیان کیجئے۔
۵۔ اسلامی معاشرے میں مکتب کی اہمیّت بیان کیجئے۔
۶۔ اسلام میں مکتب کے ارتقاء اور اسلامی معاشرے میں اس کے کردار کو بیان کیجئے۔
۷۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے استاد اور شاگرد کے حقوق وفرائض بیان کیجئے۔

معاشرہ

مُعَاشَرہ

مفہوم : معاشرہ کے لغوی معنی ہیں، آپس میں مل جُل کر زندگی گزارنا۔ اصطلاح میں معاشرہ اس اجتماع کا نام ہے جس کے سامنے کوئی مقصد ہو۔

وہ گروہ یا ہجوم جو بغیر کسی مقصد کے اکٹھا ہو گیا ہو اس کو معاشرہ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ریوڑ کو معاشرہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جانوروں کے سامنے کوئی اجتماعی مقصد نہیں ہوتا۔

اسلام میں معاشرہ کی اہمیّت :

معاشرہ کی ایجاد انسان کی طبیعت میں داخل ہے۔

انسان مَدَنِیُّ الطبع ہے۔ اس کی جبلّت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ دیگر انسانوں کے ساتھ مل کر رہے۔ اس جبلّت میں انسان کے ساتھ کئی حیوان بھی شریک ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ حیوان محض اندھی جبلت اور طبیعت کی بے اختیار خواہش سے اکٹھے ہوتے ہیں۔ انسان جبلّت کی مجبوری ہی سے ملاپ نہیں کرتا بلکہ یہ ملاپ عقل کے تابع ہوتا ہے اور اس کے سامنے ایک مقصد اور نصب العین بھی ہوتا ہے۔

اسلام معاشرہ کی اہمیت پر بہت زور دیتا ہے۔ رُہبانیت اور کنج نشینی کو خلافِ فطرت اور ممنوع قرار دیتا ہے۔ اسلام اس حقیقت کو سامنے رکھتا ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو معاشرہ ہی میں رہ کر بروئے کار لا سکتا ہے۔ وہ اگر معاشرہ سے کٹ جائے تو اس کا ذوقِ نمو فنا ہو جاتا ہے اور اس کے لئے روحانی اور مادی دونوں لحاظ سے ترقی کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔

جو چیز انسان کی طبعی خواہشوں اور فطری حاجات میں داخل ہو اس کی اہمیّت پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کا صحیح اور صالح قیام کس طرح عمل میں لایا جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ معاشرے سے مقصود کیا ہے۔

مقصد :

معاشرہ کے مقصد کے بارے میں اس وقت دو مختلف اور متضاد نظریے دنیا میں کارفرما ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ معاشرہ کا مقصد اس کی اجتماعی بہبُود ہے۔ دوسرے نظریہ کی رُو سے معاشرہ محض ایک بنا وٹی چیز ہے۔ اس کا اصل مقصود فرد کی بہبود ہے۔ ایک نظریہ فرد کا طرف دار ہے اور دوسرا معاشرہ کا۔ دونوں نظریوں کے حامی اس وقت نہ صرف زبان و قلم کے ہنگامے کر رہے ہیں، بلکہ

جنگ کے لئے بھی پر تول رہے ہیں۔

اسلام ان دونوں نظریوں میں سے کسی کا بھی روادار نہیں۔ اس کا اعلان ہے کہ معاشرہ کا مقصود نہ خود معاشرہ ہے نہ فرد۔ اس کا نصب العین اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (۵۱ : ۵۶)

ترجمہ: اور میں نے جنّ و انس کو اپنی عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔

زندگی کا اوّلیں مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ارضی خلیفہ کی حیثیت میں اس کے احکام بجالائے۔ معاشرہ ہو یا فرد، اس کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے جو احکام صادر فرمائے ہیں۔ اُن سے فرد اور معاشرہ کے باہمی تعلق کا از خود فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ان احکام پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام فرد یا معاشرہ میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا۔ بلکہ دونوں میں اعتدال اور توازن قائم رکھتا ہے۔ کبھی فرد معاشرہ پر اپنی زندگی نثار کرتا ہے اور کبھی معاشرہ فرد پر جان لٹانے کو بے تاب ہو جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ کے بنیادی اوصاف :

اسلامی معاشرہ کی درج ذیل بنیادی صفات ہیں :

(۱) استحکام (۲) عوامیت (۳) سادگی
(۴) وضعداری (۵) ہمدردی (۶) بے کار مشاغل سے اجتناب
(۷) عدل و احسان (۸) مساوات (۹) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

ذیل میں ہم ان کا فرداً فرداً ایک حد تک تفصیلی جائزہ لیں گے :

۱۔ استحکام :

وہی معاشرہ مفید ہو سکتا ہے جو خوب پختہ ہو۔ اس کے افراد میں قریبی رابطہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کے نفع و نقصان اور دُکھ سُکھ میں شریک ہوں۔ کوئی فرد دوسرے کی ویرانی میں اپنی آبادی کے سامان تلاش نہ کرے۔ معاشرہ کے سب افراد کے اذہان میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو کہ ایک کا عروج دوسرے کا عروج اور ایک کی پستی دوسرے کی پستی ہے۔

معاشرہ کے استحکام کے لئے اس کی دو لازمی شرطیں ہیں :

وحدتِ فکر۔
وحدتِ عمل۔

وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کے درمیان پوری ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔ جس معاشرہ میں یہ ہر دو وصف نہ ہوں وہ انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسلام فکر کی جو وحدت لایا ہے وہ کسی اور مذہبی یا سیاسی نظریہ کے دامن میں نہیں ملتی۔ اس فکری وحدت کی بنیاد ایمان ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان۔ اللہ کی کتابوں پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان اور یوم آخر پر ایمان، یہ پانچ عقائد ہر سچے مسلمان کے دل میں راسخ ہوتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر ہر فرد اپنی ذہنی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ چونکہ بنیاد ایک ہے اس لئے اختلاف کا امکان بہت کم ہو گا۔ ادنیٰ اختلاف کی اسلام میں اجازت ہے، لیکن جہاں خلیج زیادہ وسیع ہونے لگے وہاں اسلام کی تعلیمات اس کو روکنے کے لئے موجود ہوتی ہیں۔ جس قوم کا ایک اللہ، ایک قرآن، ایک نبی، ایک قبلہ اور ایک شریعت ہے، اس میں فکر کی دوئی اور انتشار کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس میں روح و مادہ کا حسین امتزاج رہے گا۔

وحدتِ فکر کے بعد وحدتِ عمل کا درجہ آتا ہے۔ وحدتِ عمل کا آغاز ارکانِ اسلام سے ہوتا ہے۔ ان پانچ ارکان پر عمل کی عمارت کھڑی کرنے کے لئے اصولی احکام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرما دیئے ہیں۔ اس لئے اختلاف کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ البتہ بعض لوگ ان احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو کر معاشرہ میں رخنے پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مجرم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے کردار کو دیکھ کر خود ان پر تو ہم منافقت کا حکم نہیں لگا سکتے، لیکن ان کے اعمال کے بارے میں ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ منافقانہ اعمال ہیں۔

اسلام اپنے پیروؤں کے فکر و عمل کو بیڑیاں نہیں پہناتا۔ اصول کی پابندی ضرور لگاتا ہے لیکن فروع میں آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ بشرطیکہ اصول سے تصادم نہ ہو۔ معاشرہ میں جو رسم یا رواج راہ پا جائے اسلام اس کو منظور کر لیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اسلامی اصول کی روح سے بغاوت نہ کرتا ہو۔

جس طرح قانون شکنی کا انسداد ضروری ہے۔ اسی طرح معاشرہ کی آداب شکنی کا انسداد بھی لابدی ہے۔ معاشرہ منظم، متحد اور مضبوط ہو تو اس کے قواعد کی خلاف ورزی کی جرأت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ صرف ہم نشینی بند کرنے سے بڑے بڑے سرکش افراد گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ معاشرہ میں وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل نہ ہو تو اس میں اتحاد اور تنظیم تلاش کرنا بے سود ہو گا۔

۲۔ عوامیت:

معاشرہ کے انداز اور ساز و سامان ایسے ہونے چاہئیں کہ غرباء ان میں بار پاتے ہوئے جھجک

نہ جائیں۔ جس معاشرہ میں دولت مندوں کا جداگانہ طبقہ قائم ہو جائے اور عوام کو الگ دھکیل دیا جائے اس میں جلد ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ مکہ کے ایک رئیس نے حضرت عمرؓ کی دعوت کی۔ کھانا چُنا گیا تو نوکر الگ کھڑے ہو گئے۔ فاروق اعظمؓ ناراض ہوئے اور فرمایا، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھے جو نوکروں کو ساتھ بٹھانے میں عار جانتے ہیں۔ حضرت معاویہؓ کا طریقہ تھا کہ سائلوں کو کھانے کے وقت بلاتے تھے اور انہیں دسترخوان پر بٹھا کر ان کی معروضات سنتے تھے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت معاویہؓ کی پیروی میں اگر نوکروں اور سائلوں کو دسترخوان پر بٹھانا مشکل ہی ہو تو اپنی محفل کو اس قدر تصنع آمیز تو نہ کیا جائے کہ غریب اجنبی کے قدم ہیبت سے لڑکھڑا جائیں۔ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی وہ مجلس جس کا دروازہ غریبوں پر بند ہو سب سے بڑھ کر شر انگیز مجلس ہوتی ہے۔

اسلام اپنے دولت مند پیروؤں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ ان کی مجلس اس انداز کی ہو کہ غریب آدمی بھی اسے اپنی مجلس سمجھے۔ یہ مجلس مسلمان ایک طرف غیر مسلم کے سامنے بھی اجنبی نہ ہو۔ اسلامی معاشرہ کو ہر مذہب و ملت کے فرد کے لئے رحمت کی آغوش ہونا چاہیئے۔

۳۔ سادگی :

انسانی فطرت کا ورق ازبس سادہ ہے۔ طبع انسانی کی سچی اور دیرپا سازگاری اسی معیشت سے ہوتی ہے جو تکلف سے بیگانہ ہو۔ سادہ زندگی طلب کا دامن دراز نہیں کرتی۔ نمائشی اور آرائشی زندگی ہر آن نئے نئے کھلونوں کے لئے مچلتی ہے۔ نئے سے نیا مسئلہ اُٹھاتی ہے۔ انسان فالتو مسئلوں کی فکر میں لگ جاتا ہے اور انسانیت کا اصل مسئلہ دل سے اتر جاتا ہے۔

ہم جوں جوں تکلفات بڑھائیں گے ان کو برقرار رکھنے اور نباہنے کے لئے نئے تکلفات کی ضرورت ہو گی۔ اخراجات روز افزوں ہوں گے۔ پریشانیاں ہجوم کریں گی۔ دولت کی طلب زور پکڑتی رہے گی۔ مزید دولت پیدا ہو گی بھی تو اپنی جلو میں نئی ضرورتوں کو لیتی آئے گی جو ثروت اپنے کندھے پر نئی احتیاجوں کو اٹھاتی لائے وہ تباہی کی نقیب ہوتی ہے۔

معاشرہ کے ہر فرد کو دوسرے فرد کا خیال رکھنا چاہیئے۔ مسلمان بھائیوں کے دُکھ کو بھول کر اپنی خوشی میں کھو جانا اسلامی معاشرے کا آئین نہیں۔ ایسے سامان بے شک ناگزیر ہیں جن سے انسانی ترقی میں مدد ملتی ہے، لیکن ایسے ہیں جب کہ سینکڑوں بھائیوں کو تن ڈھانپنے کو کپڑا نہ ملتا ہو، اینٹوں اور پتھروں کو لباس پہنا کر اپنی شان بڑھانا اور اسے تمدن کا کمال اور تہذیب کا جزو سمجھنا حرام ہے۔

۴۔ وضع داری : اسلامی معاشرہ میں آفاقی رنگ ہوتا ہے۔ تاہم اس کو دیگر معاشروں

سے امتیاز حاصل ہے۔ اس کی افادیت پر اسلامیت کی چھاپ ہوتی ہے۔

اسلام کے امتیازی آداب و خصائص ہیں جو اسلامی معاشرہ کو ایک خاص وضع عطا کرتے ہیں۔ اٹھنے، بیٹھنے، کھانے پینے، گفتگو اور لباس وغیرہ کے بارے میں اسلام نے خاص ہدایات دی ہیں جن سے کڑی پابندیاں تو عائد نہیں ہوتیں، لیکن زندگی میں ایک ایسا اسلوب پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر دیکھنے والا شخص مسلمان کو پہچان جاتا ہے۔

ہر قوم کے معاشرتی خصائص ہوتے ہیں جن سے قومی تشخص اور خودداری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ملی حمیت زندہ رہتی ہے اور احساس قومیت مضبوط رہتا ہے۔

قومی وضع داری کا ایک اور عظیم فائدہ یہ ہے کہ ماضی سے تسلسل باقی رہتا ہے۔ اسلام کا ماضی نہایت شاندار ہے۔ اسلام نے معاشرت اور ثقافت میں ساری دنیا کی رہنمائی کی ہے۔ ہمیں اس ماضی سے لاتعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ہم نے اپنے پاکیزہ اور پُرشکوہ ماضی سے رشتہ توڑ لیا تو اپنا مقام ہمیشہ کے لئے گم کر بیٹھیں گے۔

۵۔ ہمدردی :

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھتا ہے اور اس سے ہمدردانہ میل ملاپ رکھتا ہے۔ بناوٹی روابط اور منافقانہ سلوک قوم کی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مخلصانہ تعاون کرنا چاہیئے۔ مشکل میں ایک دوسرے کے کام آئیں اور وقت پڑنے پر ایثار کا ثبوت دیں۔

۶۔ بے کار مشاغل سے اجتناب :

ہر معاشرہ میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے افراد فرصت کے لمحات کو کس طرح بسر کریں۔ اس کے لئے لوگوں نے تفریح کے مختلف مشاغل سوچ رکھے ہوتے ہیں۔ اسلام تفریح پر پابندیاں نہیں لگاتا، لیکن ایسے مشاغل سے منع کرتا ہے جن میں دین و دنیا کا نقصان ہو۔

فرصت کے مشاغل ایسے ہونے چاہئیں کہ طبیعت کو راحت بھی ملے اور انفرادی یا قومی لحاظ سے فائدہ بھی حاصل ہو۔

۷ ۔ ۸ ۔ ۹ ۔ عدل و احسان، مساوات اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی خصوصیات کی تفصیل اسلامی تہذیب و تمدن کی خصوصیات کے ضمن میں بیان کی جا چکی ہے، وہاں دیکھ لیجئے۔

اَقارِب (رشتہ دار)

اہمیت : رشتہ داری فطری چیز ہے :

اسلام ہمیں سچے مسلمانوں سے قلبی تعلق رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی فطری محبت کو بھی ملحوظ رکھتا ہے اور قربت کے لحاظ سے درجہ بدرجہ حقوق قائم کرتا ہے، اقارب یعنی رشتہ داروں کے حقوق اوروں پر فائق ہیں۔

رشتہ داروں سے انسان کو طبعی محبت ہوتی ہے۔ اگر کبھی نارائنی پیدا ہو بھی جائے تو اس کو دور کرنے کا ہمیشہ امکان رہتا ہے اس لئے رشتہ داروں کے ساتھ جو معاشرت قائم ہو وہ مضبوط رہتی ہے۔

رشتہ داری زندگی کی قوت ہے :

جس جاں نثاری کا ثبوت رشتہ دار دیتے ہیں اس کی توقع اوروں سے مشکل ہے۔ مستحکم برادری والے انسان کا دل مضبوط رہتا ہے۔ اسے علم ہوتا ہے کہ مصیبت کے وقت رشتہ دار ہر ممکن قربانی دیں گے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنے بھائی اور عم زادے کے دم سے (اکیلا) آدمی کثیر ہوتا ہے[1] آئے دن کی زندگی میں رشتہ دار اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور اس کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ رشتہ داروں کی موجودگی میں پریشانیاں حتی الوسع قریب نہیں آتیں۔ انسان کے ذہنی اور بدنی قویٰ محفوظ رہتے ہیں اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔

رشتہ داری سے تعمیری منصوبے کامیاب ہوتے ہیں :

رشتہ داری ایک عظیم قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ رشتہ داروں کے سامنے جب کوئی فلاح و بہبود کا منصوبہ آتا ہے تو وہ اسے ایثار اور تن دہی کے ساتھ انجام پذیر کرتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ اس منصوبہ کو ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ رقم کی ضرورت ہو تو سب اپنا اپنا حصہ خوشی سے ادا کرتے ہیں۔ اگر چند آدمی ادا نہ کر سکیں تو منصوبہ ملتوی نہیں ہوتا بلکہ صاحب مقدور رشتہ دار ان کا حصہ ادا کرتے ہیں اور حساب بعد میں طے ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کو چونکہ اپنی ہی نہیں رشتہ داروں کی بھلائی

---

[1] کنز العمال جلد ۸ ص ۲۳۸ حدیث ۳۷۵۱

بھی منظور ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دل لگا کر کام کرتا ہے۔ مکان بنانے ہوں، کنوئیں کھودنے ہوں، کھیت آباد کرنے ہوں، جہاں بھی رشتہ داروں کا تعاون ہو وہاں توقع سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرابت نوازی، حسنِ خلق اور خوشگوار ہمسایگی سے بستیاں آباد اور عمریں دراز ہوتی ہیں[1]۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس نیکی کا سب سے جلد ثواب ملتا ہے وہ صلۂ رحم (قرابت) ہے۔ حتیٰ کہ خاندان والے فاجر بھی ہوں، لیکن رشتہ داری بحال رکھتے ہوں تو ان کے اموال نمو پذیر ہوتے ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی ہے اور کوئی خاندان ایسا نہیں کہ اس کے اندر اتحاد ہو اور اس کو احتیاج آئے[2]

قرابت رحمتِ الٰہی کی مظہر ہے

اللہ تعالیٰ نے رشتۂ قرابت میں اپنی رحمت اور برکت ودیعت کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی برکتوں کی ایک سبیل یہ مقدس رشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بندوں سے خوش ہوتا ہے جو رشتہ داری کو مٹنے نہیں دیتے۔ ان پر رحمتوں کی بارش کرتا ہے، ان کی زندگی کے رخنے بھرتا ہے اور ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیتا ہے۔ جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

- (۱) رَحِم (قرابت) کی اصل رحمٰن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا ہے کہ جس نے تجھے جوڑے رکھا اسے استوار رکھوں گا اور جس نے تجھے توڑا اسے شکستہ کر دوں گا۔[3]
- (۲) جو آدمی چاہتا ہے کہ اس کی عمر بڑھے، رزق کشادہ ہو، بری موت سے بچے اور اس کی دعا مقبول ہو اسے چاہیئے کہ رشتۂ قرابت کو جوڑے۔[4]

سورۃ الرعد میں اللہ تعالیٰ نے عقل مندوں کی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا ہے اسے ملاتے ہیں، یعنی وہ قرابت کو توڑتے نہیں بلکہ سالم اور قائم رکھتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ

"(اور عقل والے وہ ہیں) جو اس (رشتے داری کے) تعلق کو برقرار رکھتے ہیں جس کو برقرار رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے" (سورۃ الرعد : ۲۱)

---

[1] کنز العمال جلد ۲۔ حدیث رقم ۱۷۸۸
[2] کنز العمال جلد ۲ - حدیث ۱۸۲۹ -
[3] مشکوٰۃ کتاب الآداب باب برالوالدین
[4] کنز العمال (الکمال) جلد ۲ حدیث ۱۸۴۲ -

اس بارے میں ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے چند ارشادات درج ذیل ہیں :

احادیث نبویہ

- جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ رشتۂ قرابت کو پیوستہ رکھے۔[1]
- اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان باللہ کے بعد محبوب ترین عمل رشتۂ قرابت کا جوڑنا ہے۔[2]
- قریبی رشتہ داروں کا تو اکثر لوگوں کو خیال رہتا ہی ہے، لیکن دور کے رشتہ داروں کو لوگ دل سے اُتار دیتے ہیں۔ حضورؐ نے ان کے بارے میں بھی تلقین فرمائی ہے کہ اپنے انساب سیکھو، جن سے تم اپنی قرابت استوار رکھتے ہو۔[3]
- اقارب کی دل جوئی کسی حال میں نظر انداز نہ کی جائے۔ جو آدمی اپنے رشتہ دار سے محبت کا تپاک کم کرتا ہے وہ بہت بڑی کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے۔
- حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اپنی قرابت کو تازہ کرتے رہو چاہے سلام کے ذریعے ہی ہو۔[4] مراد یہ کہ اور کوئی خدمت انجام نہ دے سکو تو وقت ملاقات سلام کرکے قرابت کی یاد زندہ کرتے رہو۔

بدخواہ رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک :

بارہا ایسے رشتہ داروں سے پالا پڑ جاتا ہے جن کے دل محبّت سے خالی ہوتے ہیں۔ ان سے سوائے کینہ کے اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ ایسے رشتہ دار بے شک پریشانی اور ملال کا باعث ہوتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقع بھی مہیّا کر دیتے ہیں۔ ان کی کینہ پروری، اور شر انگیزی کو برداشت کرکے ان کے ساتھ حسنِ سلوک رکھا جائے تو اس کے عوض بے حساب اجر ملتا ہے۔ احادیث میں ان سے تعلقات سالم رکھنے کی نہایت تاکید ہے۔

حدیث نبوی

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں۔ میں ان سے تعلق رکھنا چاہتا ہوں اور وہ توڑتے ہیں میں ان سے بھلائی کرتا ہوں اور وہ

---

[1] ریاض الصالحین باب اکرام الضیف و باب برّ الوالدین۔
[2] کنز العمال ج ۲ - حدیث رقم ۱۷۸۸
[3] کنز العمال ج ۲ - حدیث رقم ۱۷۹۷
[4] کنز العمال ج ۲ - حدیث رقم ۱۷۸۵

میرے ساتھ برائی کرتے ہیں۔ میں ان سے حلم کرتا ہوں اور وہ اکھڑپن کرتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، اگر تم ویسے ہی ہو جیسا کہ بتا رہے ہو تو ان کے منہ میں راکھ بھر رہے ہو جب تک اس حال پر رہو گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مددگار تمہارے ساتھ مامور رہے گا۔[1]

قرابت ختم کرنے کی سزا:

جو آدمی قرابت ختم کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا حق دار ہوتا ہے۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

- قرابت قطع کرنے والے کا عمل قبول نہیں ہوتا[2]
- قاطع قرابت جنت میں داخل نہیں ہوگا[3]
- ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجلس میں فرمایا کہ آج میرے پاس وہ نہ بیٹھے جو قاطع قرابت ہے۔ ایک نوجوان حلقہ سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کی اپنی خالہ سے کچھ بدمزگی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے لئے بخشش کی دعا کی اور وہ پھر مجلس میں واپس آگیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جن لوگوں میں کوئی قاطع قرابت ہو ان پر رحمت نازل نہیں ہوتی۔[4]

نبیِّ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابت دار:

جناب ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت کا آغاز فرمایا تو آپؐ کو اپنے خاندان کے سامنے خصوصیت سے تبلیغ کرنے کا حکم ہوا۔ اگرچہ آپؐ کا چچا ابولہب آخر تک آپؐ کا دشمن رہا، لیکن دیگر چچاؤں اور ان کی اولاد نے آپؐ کی حفاظت کے لئے جانیں وقف کر دیں حالانکہ ان میں سے سب افراد اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے۔ شعب ابی طالب کے تین سال کے محاصرہ میں آپؐ کے خاندان نے آپؐ کے ہمراہ سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ ان لوگوں نے عظیم مالی ایثار کئے۔ حضرت ابو طالب نے اپنی ساری تجارت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت کی فکر میں ضائع جانے دی۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے ایثار کو منظور فرمایا اور مالِ غنیمت میں حضور کے مسلم قرابت داروں کا حصہ مقرر کیا۔ ان سے محبت رکھنا جزوِ ایمان ہے۔

---

[1] ریاض الصالحین باب برّ الوالدین
[2] کنز العمال ج ۲ - حدیث رقم ۱۸۴۴
[3] کنز العمال ۲ حدیث رقم ۱۸۵۹
[4] ایضاً حدیث رقم ۳۵۶۱

حقوق | مسلم اور غیر مسلم سب رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک

اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ ساتھ رشتہ داروں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى

(اور والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو)

اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۲۶ میں ارشاد فرمایا:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ یعنی "اور رشتہ داروں کو اس کا حق دو۔"

مسلمانوں کے حسنِ سلوک کے مستحق ان کے سب رشتہ دار ہیں۔ چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، لیکن سب کے حقوق یکساں نہیں۔ جو حقوق مسلم رشتہ داروں کے ہیں وہ کافر رشتہ داروں کے نہیں ہو سکتے۔ غیر مسلم رشتہ داروں کو قلبی رفیق نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن ان کو حاجت ہو تو جہاں تک ہو سکے ان کی مدد کی جائے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک بار اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے بارے میں فرمایا کہ فلاں لوگ میرے رفیق نہیں۔ میرا قلبی رفیق اللہ تعالیٰ ہے اور نیک مسلمان۔ البتہ ان غیر مسلم اقربا کے ساتھ میرا خون کا رشتہ ہے۔ یعنی اسے اس کی نم سے تر و تازہ رکھوں گا۔[۱]

مسلم رشتہ داروں میں فرقِ مدارج:

مسلم رشتہ داروں کے حقوق میں بھی فرق ہے جس کا تعلق زیادہ قریبی ہے۔ وہ حسنِ سلوک کا زیادہ حقدار ہے۔ ایک دفعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ عطا کرنے والا ہاتھ بالا ہے۔ اپنے عیال سے شروع کر۔ اپنی ماں کا دھیان رکھ اور باپ کا اور بہن کا اور بھائی کا، پھر قریب تر کا، اور قریب تر کا۔[۲] یعنی درجہ بدرجہ رشتہ داروں کا۔

وسعت:

رشتہ داروں کے حقوق گوناگوں اور بے شمار ہیں۔ ہمیں رشتہ داروں سے حتی الوسع انتہائی ایثار کرنا چاہیئے۔ ان کی مادی اور روحانی ہر لحاظ سے مدد مطلوب ہے۔ اگر ان کو کوئی حاجت پیش آئے تو اسے روا کیا جائے۔ وہ رنج یا پریشانی میں مبتلا ہوں تو دست گیری کی جائے۔ پس ماندہ ہوں تو انہیں ترقی کی راہ پر چلایا جائے۔ کوئی آدمی ان کی جان، مال، یا آبرو پر حملہ آور ہو تو ان کی حفاظت میں

۱۔ ریاض الصالحین باب برّ الوالدین ..... ۲۔ زاد المعاد ج ۲ صہ ۳۵۷

جان پر کھیل جانا چاہیئے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے:
تم میں بہترین آدمی وہ ہے جو اپنے خاندان کی مدافعت کرتا ہے جب تک گناہ کا مرتکب نہ ہو۔[1]

مالی مدد:

غریب رشتہ داروں کی مالی مدد واجب ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی

اور اپنا دلپسند مال رشتے داروں پر خرچ کرے (البقرہ: ۱۷۷)

نیز ارشاد ربانی ہے:

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ
فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی

ترجمہ: "لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتہ داروں پر، یتیموں اور مسکینوں پر اور مسافروں پر خرچ کرو۔" (البقرہ: ۲۱۵)

والدین، اولاد، دادا اور پوتا کا نفقہ چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم واجب ہے۔ ان کے بعد جو اقارب آتے ہیں۔ ان کے نفقہ کے واجب ہونے کے لئے اتحادِ دین ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک غریب بچہ تھا۔ اس کے چچیرے بھائی اس کو خرچ نہیں دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں قید میں ڈال دیا۔ ایک دفعہ ایک یتیم کا سرپرست حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا۔ آپؓ نے اسے یتیم پر خرچ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اگر مجھے اس کا کوئی ایسا رشتہ دار ملتا جس سے اس کا بعید ترین تعلق ہو۔ تو جب بھی میں اس پر نفقہ لازم قرار دیتا۔[2]

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ دار پر مال خرچ کرنے کا دوہرا اجر ہے ایک تو صدقے کا اور دوسرا رشتہ نوازی کا۔[3]

ایک صحابی حضرت ابوطلحہؓ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں عرض کی کہ میری فلاں جائیداد اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ ہے۔ آپؐ اسے جہاں چاہیں خرچ کریں۔ حضورؐ نے فرمایا، خوب! یہ بڑے کام کا مال ہے۔ یہ بڑے کام کا مال ہے۔ میری رائے ہے کہ اسے اقرباء کو دے دو۔ حضرت ابوطلحہؓ نے ان پر بانٹ دی۔[4]

---

[1] مشکاۃ ابواب البر والصلہ۔ [2] زاد المعاد۔ ج ۲
[3] ریاض الصالحین باب بر الوالدین [4] ریاض الصالحین باب بر الوالدین

روحانی مدد :

رشتہ داروں کو نیکی کی تبلیغ کی جائے، برائی سے روکا جائے اور خدمتِ دین کی طرف مائل کیا جائے۔ وہ گناہ کے ماحول میں گھر جائیں تو اس ماحول سے نکلنے میں ان کی مدد کی جائے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سب سے پہلے اپنے اقربا کو تبلیغ کرنے کا حکم تھا۔ ارشادِ ربانی ہے :

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ

چنانچہ نبی کریم ؐ نے سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوتِ حق دی۔

اقربا پروری کی حد :

اقربا پروری کا جذبہ قابلِ تحسین ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی رشتہ داروں کی خاطر جائز و ناجائز کی تمیز اٹھا دے۔ ہر غلط بات میں بھی ان کا ساتھ دے اور جب بھی موقع ملے قوم کی دولت اور بلند مناصب ان کے حوالے کر دے۔ یہ تعصّب ہے جس کی اسلام میں سخت ممانعت ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے کسی نے پوچھا، کیا اپنے خاندان سے محبت رکھنا تعصّب میں داخل ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، نہیں۔ تعصّب یہ ہے کہ آدمی اپنے خاندان کو ظلم کرنے میں مدد دے۔[1]

سُورَۃُ التوبہ میں ان لوگوں کو ظالم کہا گیا ہے جو کافر والدین اور بھائیوں سے قلبی تعلق رکھیں۔ (دیکھو آیت - ۲۳) کافر رشتہ دار مر جائے تو اس کے لئے مغفرت کی دعا مانگنے کی بھی اجازت نہیں۔

خاندان بندی اور رشتہ داری سے مقصود یہ ہے کہ ایک دوسرے سے آشنائی اور ہمدردی ہو نہ کہ دیگر خاندان والوں کے خلاف محاذ آرائی۔ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے رشتہ داروں کو اگر نقصان بھی پہنچتا ہو تو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى

" اور جب بات کرو تو عدل سے بات کرو خواہ وہ تمہارا قرابت دار ہی ہو۔"

ہمسایہ

ہمسایہ : حدیثِ نبوی کی رُو سے ہمسائگی کی حد اپنے مکان سے چاروں طرف چالیس گھر تک ہے۔[2] اس دائرہ میں خویش و بیگانہ اور مسلم و غیر مسلم سب شامل ہیں۔

---

[1] مشکاۃ ابواب البر والصلہ [2] جمع الفوائد (حدیث ۸۲۸۲) الترغیب والترہیب ۳ : ۳۵۳ ۔

مراتب :

ہمسائیگی کے مدارج میں اقربیت کے لحاظ سے فرق ہے۔ حدیث سے ظاہر ہے کہ وہ ہمسایہ جو مسلمان بھی ہے اور رشتہ دار بھی اس کے تین حق ہیں، ہمسایہ کے دو اور مشرک ہمسایہ کا ایک[1] اگر تفریق نہ ہو تو پھر جس کا گھر جتنا قریب تر ہوگا اس کا حق اسی قدر زیادہ ہوگا۔ حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار کیا کہ میرے دو پڑوسی ہیں۔ ہدیہ ان میں سے کس کو بھیجوں ؟ فرمایا، جس کا گھر قریب تر ہے۔[2]

اہمیت :

پڑوس کی اہمیت اخلاقی نقطۂ نگاہ ہی سے نہیں، معاشرتی ضروریات کے پیشِ نظر بھی واضح ہوتی ہے۔ ہمسایہ کے ساتھ ہمدردانہ راہ و رسم ناگزیر ہے وہ ہر وقت کا شریکِ رنج و راحت ہوتا ہے اور اگر بالفرض ایسا نہ ہو تو عین ممکن ہے کسی وقت شر یا مصیبت کا باعث بن جائے۔ نفع یا ضرر ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کا احتمال ہمسایہ سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ ایسے روابط برپا رکھے جائیں کہ ضرر کا سدِباب ہو اور نفع بہم پہنچ سکے۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ پڑوس کے تخریبی پہلو سے بچ کر اس کے تعمیری پہلو سے فائدہ اٹھایا جائے۔

حقوق — سرسری جائزہ ۔ احادیث نبویہ

(۱) ہمسایہ کے حقوق کا اندازہ مشکل ہے۔ اس ضمن میں قرآن کے احکام کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبرائیل مجھے ہمسایہ کے بارے میں یہاں تک تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ اسے وارث قرار دینے لگے ہیں۔[3]

ہمسایہ اگرچہ وارث نہیں ہوتا لیکن اسلامی قانون میں شفعہ کا حق بہت حد تک اسی کو حاصل ہے۔

ہمسایہ سے حسنِ سلوک اور اس کے حقوق کی بجاآوری کے بارے میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو عمومی ہدایات صادر فرمائی ہیں۔ ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:

(۲) قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس کا بندہ مومن نہیں ہوتا۔ جب تک اپنے

---

[1] احیاالعلوم حقوق الجوار [2] ریاض الصالحین بحوالہ بخاری۔
[3] ترمذی ابواب البر والصلہ۔ ریاض الصالحین بحوالہ مسلم و بخاری۔

پڑوسی کے لئے بھی وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے [1]

(۳) جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنے پڑوسی سے حسنِ سلوک رکھے۔ [2]

(۴) اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کے حق میں بہترین ہے اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہترین ہے [3]

پڑوسی کے حقوق اس قدر کثیر ہیں کہ ان کے بجالانے کے لئے بہت صبر و حوصلہ اور استقامت کی ضرورت ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

(۵) کیا تم جانتے ہو پڑوسی کا حق کیا ہے؟ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ پڑوسی کا حق وہی ادا کر سکتا ہے جس پر اللہ کی رحمت ہو۔ [4]

حضورؐ کی مراد یہ ہے کہ اس گراں بار فریضہ کو اٹھانا آسان نہیں۔ آدمی اس سے تبھی عہدہ برآ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہو۔

(۶) جو شخص اپنے پڑوسی کا حق ادا نہیں کرتا اس کا پڑوسی اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس سے انصاف چاہے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے دو ہمسایوں کا مقدمہ ہوگا۔ [5]

(۷) ارشادِ نبوی ہے کہ قیامت کے دن کتنے ہی پڑوسی اپنے پڑوسیوں کو پکڑے ہوئے ہوں گے اور کہیں گے، یا ربّ! اس نے ہم پر دروازہ بند کر دیا تھا اور اپنی بھلائی سے محروم رکھا تھا۔ [6]

(۸) ہمسایہ کے حقوق کی بجاآوری اخلاق کی کسوٹی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ! مجھے کیسے علم ہو کہ میرا عمل اچھا ہے یا برا؟ فرمایا، تو جب اپنے پڑوسیوں سے سنے کہ تو نے اچھا کیا ہے تو (جان لے) کہ تو نے اچھا کیا ہے۔ اور اگر اس سے سنے کہ تو نے برا کیا ہے تو (جان لے کہ) تو نے برا کیا ہے۔ [7]

(۹) جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑوسی کے مختصراً حسب ذیل حقوق گنائے گئے ہیں:

- تجھ سے مدد مانگے تو اسے مدد دے۔

---

[1] مسلم کتاب الایمان [2] مسلم کتاب الایمان [3] ترمذی ابواب البرّ والصلہ [4] احیاء العلوم حقوق الجوار۔
[5] مشکوٰۃ کتاب الآداب [6] الادب المفرد بخاری [7] مسلم کتاب الایمان۔

- تجھ سے ادھار مانگے تو ادھار دے۔
- محتاج ہو تو اس کی طرف توجہ کر۔
- بیمار پڑے تو عیادت کر۔
- اسے خوشی نصیب ہو تو مبارکباد دے۔
- اس پر مصیبت آئے تو دل جوئی کر۔
- مر جائے تو جنازہ کے ہمراہ جا۔
- اس کی اجازت کے بغیر اپنی عمارت اتنی بلند نہ اُٹھا کہ اس کے لئے ہوا میں رکاوٹ ہو۔ اسے اپنی ہنڈیا کی بُو کی تکلیف نہ دے۔ سوائے اس کے کہ تُو اسے بھی سالن بھیجے تو پھل خرید کر لائے تو اسے بھی دے، ورنہ گھر میں چھپا کر داخل کر۔ تیرے بچے اسے لے کر باہر نہ نکلنے پائیں تاکہ اس کے بچوں کو رنج نہ ہو۔[1]

تجزیہ :

پڑوسی کے حقوق کو درجِ ذیل عنوانوں کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے :

(۱) مجلسی ادارے۔ (۲) تحائف اور دعوتیں۔
(۳) تعاون و ایثار۔ (۴) پڑوسی کو ضرر نہ دینا۔
(۵) پڑوسی کے ضرر پر صبر کرنا۔

ذیل میں ان عنوانوں پر ہم قدرے تفصیلی نگاہ ڈالیں گے۔

۱۔ حُسنِ سلوک :

پڑوسی کے ساتھ، خواہ وہ رشتے دار ہو یا غیر رشتے دار، سکونت و رہائش کے اعتبار سے پڑوسی ہو یا عارضی پڑوسی، سفر، بازار، کلاس روم، ہوٹل میں کھانے کی میز پہ یا کوئی اور، اللہ تعالیٰ نے حُسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ

"اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، اور نیک برتاؤ کرو والدین کے ساتھ اور قرابت داروں اور یتیموں

---

[1] الترغیب والترہیب ج ۳۔

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ ۔۔۔ اور مسکینوں اور رشتہ دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ ۔"

(النساء : ۳۶)

۲۔ تحائف اور دعوتیں :

محلہ داری کا دوسرا اہم تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کی وقتاً فوقتاً دعوت کی جائے اور تحائف بھیجے جائیں ۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحائف کو محبت کا ذریعہ قرار دیا ہے ۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ جناب ابوذرؓ سے فرمایا کہ جب تو کچھ پکائے تو شوربا زیادہ بنا اور (اس میں سے) اپنے پڑوسیوں کی بھی خبر گیری کر ۔ [1] آپؐ نے ایک دفعہ مسلمان عورتوں سے خطاب کرکے فرمایا کہ ہمسائی اپنی ہمسائی کے لئے (کوئی ہدیہ) حقیر نہ جانے ، چاہے یہ بکری کا کھر ہو ۔ [2] مراد یہ کہ حسب توفیق گھر میں جو میسر آئے اس سے پڑوسن کی خاطر داری کرو ۔

تحائف کے حق دار غیر مسلم ہمسائے بھی ہوتے ہیں ۔ ایک دن حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ہاں ایک بھیڑ ذبح کی گئی ۔ آپؐ کا ایک غلام اس کی کھال اتار رہا تھا کہ آپ نے اس سے کہا " گوشت کی تقسیم ہمارے یہودی ہمسایہ سے کرنا ۔ آپ نے یہ بات بار بار دہرائی تو وہ بولا کہ آپ یہ بات کتنی بار کہیں گے ؟ جواب دیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں پڑوسی کے حق میں ہمیشہ نصیحت فرماتے رہے یہاں تک کہ ہمیں اندیشہ ہوا کہ اسے وارث قرار دے دیں گے ۔ [3]

۳۔ تعاون و ایثار :

محتاج اور دکھی ہمسایہ کی امداد واجب ہے اس سے گریز کرنا منافقانہ حرکت ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

> وہ شخص مومن نہیں جو خود شکم سیر ہوتا ہے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہتا ہے ۔ [4]

پڑوسی کی دستگیری سے کسی وقت دریغ نہ کیا جائے چاہے خود نقصان کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے ۔ اس عظیم ذمہ داری کے بجالانے میں فراخ دلی ، بلند حوصلگی اور ایثار کی ضرورت ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ کوئی شخص اپنی دیوار میں پڑوسی کو شہتیر رکھنے سے نہ روکے ۔

---

[1] مسلم کتاب البر والصلۃ [2] بخاری (کتاب الادب و کتاب الہبہ) وغیرہ
[3] احیاء العلوم جزء ۲ ۔ حقوق الجوار [4] جمع الفوائد ، مشکوٰۃ باب الشفقۃ ۔

حضرت ابوہریرہؓ نے یہ حدیث بیان کرکے ان لوگوں کو سخت زجر کیا تھا جن کا عمل اس کے خلاف تھا[1] ظاہر کی نگاہ تو یہی بتائے گی کہ جو شخص دیوار کا مالک ہے اسے حق ہے کہ کسی دوسرے آدمی کو شہتیر رکھنے سے منع کرے، مگر اسلام پڑوسی کو اس دیوار پر ہمسایگی کے واسطے سے کچھ اخلاقی حق ضرور دلواتا ہے۔

اسی نوعیت کا ایک مسئلہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں پیش ہوا۔ دو صحابیوں کا کھیتوں کا پڑوس تھا۔ ان میں سے ایک صاحب ضحاکؓ بن قیس نے دوسرے صحابی محمد بن مسلمہؓ کے کھیت سے پانی گزار کر اپنے کھیت تک پہنچانا چاہا۔ محمد بن مسلمہؓ نے انکار کیا۔ قضیہ عدالتِ فاروقی میں پہنچا۔ آپ نے محمد بن مسلمہؓ سے کہا کہ پانی گزرنے دیں۔ انہوں نے جواب دیا، نہیں۔ آپ نے فرمایا، آپ اپنے (مسلمان) بھائی سے وہ چیز کیوں روکتے ہیں جو اس کو کام دے گی اور آپ کو بھی۔ آپ اس سے شروع سے آخر تک آبپاشی کر سکتے ہیں۔ اس سے آپ کا نقصان بھی نہیں۔ انہوں نے پھر جواب دیا۔ اللہ کی قسم! نہیں۔ فاروق اعظمؓ نے فرمایا، اللہ کی قسم! یہ پانی ضرور گزرے گا چاہے آپ کے پیٹ پر سے ہو کر گزرے۔ چنانچہ آپ نے حکم دیا اور پانی کھیت میں گزار دیا گیا۔[2]

۴۔ پڑوسی کو ضرر نہ دینا:

ہر ہمسایہ کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اس کے ہمسایہ کو دور کے قرینہ سے بھی ناراضی کا موقع نہ ملے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے تو نے ہمسایہ کے کتے کو پتھر مارا تو ہمسایہ کو دکھ دیا۔[3]

ایمان کا تقاضا ہے کہ پڑوسی کو اذیت اور تکلیف دینے سے پرہیز کیا جائے۔ تاجدار انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ دے۔[4]

ایک بار آپؐ نے فرمایا، اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، پوچھا گیا، یا رسول اللہ کون؟ فرمایا، وہ شخص جس کی آفتوں سے اس کا پڑوسی مامون نہیں۔[5]

---

[1] بخاری کتاب المظالم۔ ابن ماجہ، ابواب الاحکام

[2] موطا کتاب الاقضیہ

[3] احیاء العلوم، حقوق الجوار

[4] بخاری کتاب الادب۔ ابوداؤد

[5] بخاری کتاب الادب

پڑوسی کو ضرر دینا دغابازی اور انسانیت سوز حرکت ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بتائی ہے کہ آدمی اپنے پڑوسی، بھائی اور باپ کو قتل کرے گا۔[1]

ہمسایہ کو اذیت اور تکلیف دینے کی اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت سزا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ چوری حرام ہے، مگر دس گھروں کی چوری ہمسایہ کے گھر کی چوری سے ہلکی ہے۔[2]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ! فلاں عورت کے نماز، روزہ اور خیرات کا بڑا چرچا ہے، لیکن اس نے زبان سے پڑوسیوں کو ستا رکھا ہے۔ فرمایا، یہ آگ میں جائے گی۔ پھر اس نے کہا کہ فلاں عورت کے بارے میں سنتے ہیں کہ نماز روزہ واجبی طور پر ادا کرتی ہے، پنیر کے ٹکڑوں کا صدقہ دیتی ہے اور پڑوسیوں کو نہیں ستاتی۔ فرمایا، وہ جنت میں جائے گی۔[3]

فتح مصر کے دوران میں فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے ایک چھاؤنی سے کوچ کا حکم دیا۔ سپاہی خیمے اکھاڑنے لگے تو دیکھا کہ فاتح مصر کے خیمہ پر کبوتری نے آشیانہ بنا کر انڈے دے رکھے ہیں۔ آپ نے کہا، یہ کبوتری ہماری ہمسایہ ہے۔ جب تک انڈوں سے بچے نکل کر اڑنے کے قابل نہ ہو جائیں خیمہ کو بحال رہنے دو۔ آپ نے آشیانہ پر ایک محافظ مقرر کر دیا۔ کچھ دن بعد جب واپس تشریف لائے تو خیمہ کے گرد ایک شہر بسا پایا جس کا نام (فسطاط (خیمہ) رکھا۔ یہ نام آج تک اسلامی ہمسایہ نوازی کی یادگار ہے۔

۵۔ پڑوسی کے ضرر پر صبر کرنا:

اسلام پڑوسی پر ستم کرنے ہی کو نہیں روکتا بلکہ حکم دیتا ہے کہ اس سے تکلیف پہنچے تو صبر و تحمل سے کام لو اور جہاں تک ہو سکے درگزر کرو۔ آغاز اسلام میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کافر پڑوسی آپؐ کو اس حد تک دق کرتے کہ آپؐ کے گھر جا کر ہنڈیا میں گندگی ڈال دیتے۔ آپؐ اتنا کہہ کر چپ ہو جاتے، اے بنو عبد مناف! یہ کیسا پڑوس ہے؟[4]

ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہمسایہ کی شکایت لے کر آئے۔ آپؐ نے فرمایا، جا اور صبر کر۔ وہ دو تین بار پھر آئے۔ آخر آپؐ نے فرمایا، گھر کا سامان رستہ میں ڈال دے۔ صحابیؓ نے ایسا ہی کیا۔ گزرنے والوں نے ان سے پوچھنا شروع کیا تو انہوں نے اپنا حال سنایا۔ لوگ ان کے

---

[1] الادب المفرد [2] الترغیب والترہیب جزء ۳ [3] ایضاً [4] ابن اثیر ابن کثیر۔

پڑوسی کو بد دعائیں دینے لگے تو پڑوسی آیا، اور ان سے کہا، آپ واپس (گھر) جائیں۔ آئندہ آپ میری ناگوار بات نہ دیکھیں گے۔ [1]

۶۔ محلّہ کے رفاہی ادارے :

محلّہ داری کے مجلسی اجتماع کی بنیاد نماز ہے۔ ہر شخص پر واجب ہے کہ محلّہ کی مسجد میں باجماعت نماز ادا کرے۔ مرد کو گھر میں بغیر عذر کے نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ مسجد کی نماز کا ایک فائدہ یہ ہے کہ پڑوس کے سب مسلمانوں کو دن میں پانچ بار اکٹھا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ایک دوسرے کے احوال اور مجلسی اور معاشرتی ضرورتوں سے باخبر ہوتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے کام آسکیں، معاشرہ کو مضبوط کریں اور مل کر منزلِ ترقی کی طرف گامزن ہوں۔

مجلسی اجتماعات کو مسجد تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ محلّہ میں ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں اور رفاہی اداروں کا بیڑا اٹھائیں۔

جس طرح گھر کی تنظیم ضروری ہے۔ اسی طرح محلہ کی تنظیم بھی لازم ہے، ورنہ ایک دوسرے کی تعمیری صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھایا نہیں جا سکتا۔

سوالات

۱۔ اسلام میں معاشرہ کی کیا اہمیّت ہے ؟ اسلامی معاشرے کی اہم خصوصیات قلمبند کریں۔

۲۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی معاشرے کے خط و خال واضح کریں۔

۳۔ اسلام میں قرابت داری کی کیا اہمیّت ہے ؟ قرآن و سنّت کی روشنی میں رشتہ داروں کے حقوق بیان کیجئے۔

۴۔ قرآن و سنّت کی روشنی میں ہمسائے کے حقوق بیان کیجئے۔

---

[1] ابوداؤد باب فی حق الجوار ۔

شہری

مفہوم : ریاست کا ہر باشندہ اس کے رکن کی حیثیت میں شہری کہلاتا ہے۔ شہری کا لفظ یہاں دیہاتی کے مقابل نہیں۔ اس میں شہر اور دیہات کے سب باشندے شامل ہیں۔

اسلامی شہریت میں مسلم و غیر مسلم سب شانہ بہ شانہ شریک ہو سکتے ہیں۔

شہریت کی شرطیں :

یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے کہ شہریت کی کامیابی کے لئے کن امور کی ضرورت ہے۔ اگرچہ مسلمان کے لئے تو سیدھی بات یہ ہے کہ نیک مسلمان ہو جانا ہی اچھا شہری ہونے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس سے مسئلہ کی وضاحت پوری طرح نہیں ہوتی۔ اس کا تفصیل جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ علم شہریت کے ماہرین اس پر درج ذیل عنوانوں کے تحت بحث کرتے ہیں :

(۱) شہری حقوق (۲) شہری فرائض (۳) اچھے شہری کے اوصاف

حقوق و فرائض کا مفہوم :

زندگی گزارنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی کا ماحول اور سامان عطا کیا ہے۔ ان پر کسی شخص واحد یا گروہ کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ اس ماحول اور سامان میں سب انسانوں کو شریک ہونے کا حق ہے۔ یہ حق جبھی قائم رہ سکتا ہے کہ آدمی خود بھی جیے اور دوسروں کو بھی جینے دے۔

جینا اور جینے دینا مل کر زندگی کو ترکیب دیتے ہیں۔ ان ہر دو اجزاء میں سے ایک جزو الگ کر دیا جائے تو زندگی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

جینے دینے کا مفہوم یہی نہیں کہ کسی کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کو جینے میں مدد دی جائے کیونکہ بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء ہیں۔ جسم کا ایک عضو تعاون سے رہ جائے تو دوسرے اعضاء کا دائرۂ عمل محدود یا ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی برادری میں عدم تعاون کا فوری نتیجہ رکاوٹ ہے لہٰذا تعاون کے بغیر چارہ نہیں۔

جینے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے انہیں حقوق کہتے ہیں اور جینے دینے کے لئے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہے انہیں فرائض کہا جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی حق ایسا نہیں جس کے ساتھ فرائض وابستہ نہ ہوں۔ حق بے لگام آزادی یا غیر محدود طلب کا نام نہیں۔ حق فرائض میں محصور رہتا ہے۔ مثلاً ہر آدمی کو اپنے مکان میں رہنے کا حق حاصل

ہے، لیکن اس حق کے ساتھ یہ فرائض لازم ہیں کہ پڑوسیوں کو شور و غل سے پریشان نہ کرے اور گلی میں غلاظت نہ پھینکے۔

۱۔ حقوق :

شہری حقوق کی درج ذیل قسمیں ہیں :

(۱) مذہبی حقوق (۳) معاشرتی حقوق

(۲) معاشی حقوق (۴) سیاسی حقوق

مذہبی حقوق : (ا) آزادیٔ عقاد :

مذہبی اعتقاد کے بارے میں قرآنِ حکیم کا فرمان ہے :

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲:۲۵۶) ترجمہ : دین میں کوئی جبر نہیں۔

مراد یہ کہ آدمی کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ اپنے عقیدہ کو تبدیل کرے۔ میثاقِ مدینہ اسلامی شہریت کا پہلا تحریری دستور نامہ ہے۔ اس میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ اس کی ایک شرط یہ ہے کہ حکومت ہر فرد کی زندگی کی محافظ ہوتی ہے۔

(ب) مُساوات :

معاشی مساوات اور معاشرتی مساوات میں فرق ہے۔ معاشرتی مساوات میں سب برابر کے حقدار ہیں۔ جیسا کہ آئندہ صفحات سے ظاہر ہے، لیکن معاشی مساوات سے یہ مُراد نہیں کہ ہر ایک کے پاس برابر کی دولت ہو۔ اسلام میں مَعاشی مُساوات سے یہ مُراد ہے کہ ہر ایک کو اپنی صلاحیت اور اہلیت کے بموجب محنت کے مساوی مواقع میسر ہوں۔ اگر ایک عہدہ کے لئے دو امیدوار ہوں، ایک امیر اور دوسرا غریب، تو اس کو انتخاب کیا جائے گا جو اہل تر ہو۔

تجارت و حرفت میں بھی سب کو برابر کے مواقع میسّر ہونے چاہئیں۔ کسی شخص کو صنعت و حرفت کے کسی شعبہ پر اجارہ قائم کرنے کا حق نہیں۔

(ج) آمدن اور خرچ :

ہر شہری کو کمائی اور خرچ کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ وہ قانونی اور اخلاقی حدود کا پاس رکھے۔ آمدن اور مصرف دونوں جائز ہونے چاہئیں۔ مثلاً شراب کی تجارت اور چوری کا مال حرام ہے۔ اسی طرح لہو و لعب وغیرہ میں دولت اڑانا ممنوع ہے۔

غیر مسلموں کے ہاں جائز و ناجائز کا تصور کچھ مختلف ہے۔ اس لئے ان کے ہاں آمدن اور خرچ

کے جو قاعدے ہیں اسلامی ریاست ان پر پابندی نہیں لگاتی بشرطیکہ ان سے ریاست کو نقصان نہ پہنچے۔ عیسائیوں کے ہاں شراب کی آمدن حلال ہے۔ اس لئے ان پر اس آمدن کی کوئی پابندی نہیں اور نہ انہیں شراب میں خرچ کرنے کی ممانعت ہے۔

معاشرتی حقوق (و) مساوات

(اوّل) آبرو :

معاشرتی لحاظ سے سب افراد برابر کی عزت کے مستحق ہیں۔ کوئی شخص کسی کو گالی بھی نہیں دے سکتا۔ بعض صورتوں میں گالی پر قذف (بہتان) کا اطلاق ہوتا ہے اور مظلوم عدالت میں جا کر نالش کرے تو مجرم کو اسی کوڑوں کی سزا ملتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مسلمانوں پر ایک دوسرے کی ہتک عزت حرام ہے۔

(دوم) قانونی مساوات :

اسلامی قانون کی نگاہ میں خلیفہ سے لے کر غلام بلکہ غیر مسلم تک سب برابر ہیں۔ ملک کا سب کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا بلکہ تبلیغ سے پھیلا ہے۔ اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم باشندوں کو تبدیلی مذہب پر مجبور نہیں کرتی۔

مسلمانوں کے اندر کئی فقہی مسالک ہیں۔ ان میں کوئی فقہی مسالک ہیں۔ ان میں کوئی بنیادی تصادم نہیں لیکن فروعی اختلافات ضرور ہیں۔ انسانی فکر و نظر کا اختلاف عین فطرت ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں بھی فروعی عقائد میں اختلاف ہے۔ کسی گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے گروہ کے اعتقادات کو جبراً بدلنے کی کوشش کرے۔ منصور اور ہارون نے چاہا کہ امام مالکؒ کے فقہ کو بزور شمشیر کل مملکت میں نافذ کریں لیکن حضرت امام مالکؒ نے فرمایا، علماء کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت پر ایک رحمت ہے کسی پر جبر کرنا روا نہیں۔

(ب) آزادی عبادت :

مسلم ہو یا غیر مسلم اس کو گھر یا عبادت گاہ میں اپنے طور سے عبادت کرنے کی اجازت ہے۔ اس میں کسی کو مزاحم یا خلل انداز ہونے کا حق نہیں۔

اسلام اجازت نہیں دیتا کہ غیر مسلموں کے گرجے توڑے جائیں۔ اسلامی حکومت ان کی حفاظت کی ضامن ہوتی ہے۔

معاشی حقوق : (۱) زندگی کا حق :

ہر انسان کو آزادی سے زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس حق کو نہ چھیننے اور نہ محدود کرنے کی اجازت ہے۔ اسلام میں اس بات کی ممانعت ہے کہ کسی آزاد شخص کو بیچ کر غلام بنالیا جائے۔ جنگی قیدیوں کو غلامی میں رکھا جا سکتا ہے لیکن ان کو آزاد کرنے کی متعدد ہدایات ہیں۔ غلام کو آزاد کرنے یا آزادی دلانے کا بے اندازہ اجر ہے۔ جو آدمی غلامی میں رہ جائیں۔ ان کے لئے اسلام میں اس قدر معاشی حقوق ہیں کہ دوسرے ادیان میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ بعض جرائم میں آزاد آدمی کو جو سزا ملتی ہے غلام کو اس سے نصف سزا دی جاتی ہے۔

کسی کو اجازت نہیں کہ دوسرے انسان کو بغیر وجہ کے پابند کرے یا قید میں ڈال دے۔ حکومت بھی کسی فرد کو ثبوتِ جرم کے بغیر جیل میں نہیں ڈال سکتی۔

اگر کوئی آدمی کسی کو قتل کر دے تو اسلام قصاص لینے کا حکم دیتا ہے۔ کسی کو زخمی کر دیا جائے تو حکومت ظالم کے بھی ویسا ہی زخم دے سکتی ہے، بشرطیکہ مظلوم شخص ظالم کو معاف نہ کر دے۔

فرمانروا ایک عامی کے مقابلہ میں بھی عدالت کے سامنے جائے گا۔ اور اس کے برابر کھڑا ہو گا۔ حضرت علیؓ کے عہد حکومت کا واقعہ ہے کہ آپ کی زرہ گم ہو گئی۔ زرہ کچھ مدت کے بعد ایک یہودی کے پاس دیکھی گئی۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا اور حضرت علیؓ بنفسِ نفیس فریقِ مقدمہ کی حیثیت تشریف لے گئے۔ آپ کے پاس چونکہ گواہ نہ تھا۔ اس لئے قاضی نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ آپ نے قطعاً برا نہ مانا۔ یہودی کو معلوم تھا کہ یہ زرہ حضرت علیؓ کی ہے لیکن قانونی ثبوت مہیا نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو نہ مل سکی۔ وہ اسلامی انصاف کا یہ عالم دیکھ کر اسلام لے آیا۔

ایک شخص نے مامون عباسی کے خلاف دعویٰ دائر کیا۔ مدعی اور مامون دونوں قاضی کے سامنے حاضر ہوئے۔ مدعی نے مامون کے بیٹھنے کے لئے چٹائی بچھائی تو قاضی نے کہا کہ اپنے حریف کو عدالت میں شرفِ مجلس نہ دو۔

اسلام کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں۔

قانونی مساوات کی ایک بنیادی ضرورت یہ ہے کہ قانون مفت ہو۔

(ب) جائیداد کا حق :

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ ریاست میں جائیداد بنائے لیکن اس اصولی حق پر چند فروعی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔

(ج) معاہدہ کا حق :

ہر مسلمان شہری کو دیگر افراد سے معاہدہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن کوئی ایسی شرط رکھنے کی اجازت نہیں جو اسلام کے خلاف ہو۔ اسلامی قوانین کے دائرہ کے اندر وہ ہر فرد کے ساتھ معاہدہ کرنے کا حق دار ہے۔

(د) پُرامن اجلاس :

ریاست کے شہریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ باہمی مشورہ یا قومی بہبود کی خاطر کھلا اجتماع کریں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اجلاس پُرامن ہو۔ اس سے فساد کا اندیشہ نہ ہو۔

سیاسی حقوق

اسلامی نقطۂ نگاہ سے سیاست کا مفہوم ہے، عقل کے تقاضا کے موافق کام کرنا۔ اسلام میں سیاست کا تصور یورپ سے مختلف ہے۔ اسلام اسے دین کے تابع رکھتا ہے اور جائز حدود سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ یورپ میں سیاست سے مُراد یہ لی جاتی ہے کہ اپنے فائدہ کی خاطر ہر جائز و ناجائز حربہ و حیلہ استعمال کیا جائے۔

اسلامی ریاست کے شہریوں کو اسلام مندرجہ ذیل سیاسی حقوق دیتا ہے :

۱۔ حق رائے دہی :

اس حق سے مراد یہ ہے کہ ہر شہری کو ریاست کے معاملات میں عمل دخل حاصل ہو۔ اسلامی ریاست میں ہر شہری کو امورِ ریاست میں دخل دینے کا حق حاصل ہے اور اس ضمن میں شہریوں کے درمیان رنگ، نسل، زبان، وطن، جنس پر امتیاز کا اسلام روادار نہیں ہے۔ کسی عربی کو عجمی پہ اور عجمی کو عربی پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ حاکمان کے انتخاب میں ہر شخص کو رائے دہی کا حق حاصل ہے۔ فقہا اس امر پر متفق ہیں کہ خلیفہ (اسلامی ریاست کا سربراہ یا حکمران) کے انتخاب کے بعد عوام سے بیعت (بیعت رائے دہی کے ہم معنی و مفہوم اصطلاح ہے) لینا ضروری ہے۔ اگر عوام بیعت نہ کریں (یعنی خلیفہ کے انتخاب کی منظوری اپنی رائے کے اظہار سے نہ دیں) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام نے اس انتخاب کو درست خیال نہیں کیا۔ لہٰذا یہ انتخاب صحیح نہیں ہے۔ گویا عوام کی منظوری کے بغیر اوپر سے جبراً و قہراً مسلط ہونے والی حکومت اسلامی تعلیمات کے منافی اور غیر اسلامی ہوگی۔ حکومت کے قیام کے پیچھے عوام کی مرضی و منشا کا کار فرما ہونا ضروری ہے، خواہ ان کی مرضی و منشا کے اظہار کی شکل و صورت کوئی بھی ہو (یعنی آپ اسے قدیم اصطلاح بیعت کا نام دیں یا جدید اصطلاح ووٹ کا نام دیں)۔

۲۔ حق نمائندگی :

اسلامی ریاست کے ہر فرد کو حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ مطلوبہ شرائطِ اہلیت پر پورا اترتا ہو، کہ وہ لوگوں کی مرضی و منشاء سے ان کا نمائندہ بن سکے، یعنی بذریعہ انتخاب حکمران بن سکے۔ اس ضمن میں اسلام نے رنگ، نسل، زبان وغیرہ کی کوئی قید نہیں لگائی۔ حکومت کسی خاص طبقے، خاص نسل، خاص زبان بولنے والے لوگوں کا حق نہیں ہے اور نہ ہی یہ میراث ہے کہ باپ کے بعد از خود بیٹے کو مل جائے۔ جو شخص بھی اسلامی ریاست کا سربراہ بننے کی اہلیت رکھتا ہو وہ سربراہ بن سکتا ہے بشرطیکہ لوگ اسے سربراہ بنانا چاہیں۔ البتہ یہ ظاہر بات ہے کہ اسلامی ریاست میں رہنے والی کسی غیر مسلم اقلیت کا فرد اسلامی ریاست کا سربراہ نہیں بن سکتا۔

۳۔ شوریٰ :

شوریٰ کے معنی ہیں مشورہ۔ اسلامی حکومت تمام معاملات شوریٰ کے اصول پر طے کرتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ

یعنی "اور ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پا جاتے ہیں"

(سورۃ الشوریٰ، آیت ۳۸)

ہر عاقل اور بالغ شہری کو مشورہ دینے کا حق حاصل ہے، مشورہ دینے میں اس پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔ اسلامی حکومت نہ تو شخصی ہو سکتی ہے اور نہ ہی آمرانہ۔ اسلامی ریاست کے شہری مجبور و مقہور نہیں ہوں گے۔ کہ جابر و آمر حکومت ان پر اپنی مرضی کے احکام لاگو کرتی رہے، بلکہ تمام قوانین ان کے نمائندوں کے ذریعے باہمی مشاورت کے اصول پر وضع کئے جائیں گے۔

۴۔ حکومت پر تنقید کا حق :

اسلامی ریاست کے ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ حکومت کی پالیسیوں اور فیصلوں پر تنقید کرکے ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرے۔ عوام حکومت کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی غلط پالیسی یا فیصلے کو تبدیل کرے۔ اسلامی حکومت اپنے اعمال کے لئے اللہ تعالیٰ کے آگے ہی نہیں عوام کے سامنے بھی جواب دہ ہوتی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے ایک بار تقریر کے دوران لوگوں سے فرمایا، مجھ پر تمہارے متعدد حقوق ہیں جن کے بارے میں تمہیں مجھ سے باز پرس کرنی چاہیئے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو بار بار سرِ مجلس ٹوکا۔ دوسرے آدمی نے کہا، تم نے حد کر دی، اب ختم کرو۔ حضرت عمرؓ نے

فرمایا، اسے کہنے دو۔ عوام ہمیں نہ ٹوکیں تو ان کا وجود بے سود ہے اور اگر ہم ان کی نہ سنیں تو ہم بے مصرف ہیں۔ آپ کا اعلانِ عام تھا کہ عُمّال (علاقائی حکّام) ہر سال حج کے موقع پر جمع ہوں، کسی کو ان کے خلاف شکایت ہو تو آکر بیان کرے۔ اسلام حکومت پر تنقید کا حق ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے کہ ظالم و جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہاد ہے۔

۵۔ حکومت کے مناصب:

اسلامی ریاست میں تمام عہدوں پر تقرر محض اہلیت کی بنیاد پر ہوگا اور ہر شہری، بشرطِ اہلیت، کسی بھی منصب پر فائز ہونے کا حقدار ہے۔ اس ضمن میں شہریوں کے درمیان کسی بھی قسم کا امتیاز نہیں رکھا جائے گا۔ کوئی بھی منصب کسی خاص طبقے، برادری، مخصوص رنگ، نسل یا زبان بولنے والوں کے لئے مختص نہیں ہوگا اور نہ ہی کسی منصب میں میراث چلے گی۔ کسی بھی قسم کا امتیاز اسلام کے عدل و مساوات کے اصولوں کے منافی ہے۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اہلیت رکھنے والے غلام بھی اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے۔ ہندوستان میں خاندانِ غلاماں اور مصر میں خانوادۂ ممالیک نے تو حکومت کی۔

نوٹ: اسلامی ریاست میں شہری کو وہ تمام سیاسی حقوق حاصل ہوں گے جو آج مہذب اور جمہوری ریاستوں کے شہریوں کو حاصل ہیں، بشرطیکہ وہ اسلامی اصولوں کے منافی نہ ہوں۔ مثلاً آج کی جمہوری ریاستوں میں سیاسی جماعت بنانے کا حق دیا جاتا ہے کیونکہ آج کی کثیر آبادی والی ریاستوں میں عوام سیاسی جماعتوں کے ذریعے ہی ریاستی امور میں دخل دیتے ہیں۔ یہ ایک منظم اور ترقی یافتہ صورت ہے جو انسان نے صدیوں کی جدوجہد اور تجربات کے بعد اپنائی ہے۔ آج کی اسلامی ریاستیں بھی کثیر آبادی اور دیگر امور و مسائل میں دنیا کی دوسری ریاستوں کے مشابہ ہیں۔ لہٰذا آج کی اسلامی ریاست میں شہریوں کو سیاسی جماعت بنانے کا حق حاصل ہوگا۔ جیسے آج بیعت کے بجائے ووٹ کا حق حاصل ہے اور جیسے خلیفہ کے بجائے صدر اور وزیر اعظم کے عہدے ہیں۔ جیسے آج شوریٰ کے بجائے قومی اسمبلی اور سینٹ ہے۔ اصل چیز نام اور شکل و صورت یا وضع و قطع نہیں بلکہ روح ہے۔

اسلامی ریاست میں شہری کے فرائض

اسلام جہاں شہری کو بہت سے حقوق دیتا ہے وہاں اس پر فرائض بھی عائد کرتا ہے۔ فرائض کے بغیر حقوق کا تصور محال ہے۔ اسلامی ریاست کے شہری پر مندرجہ ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں:

(الف) ریاست سے متعلق فرائض:

۱۔ اطاعت:

اسلام ہر شہری پر فرض عائد کرتا ہے کہ وہ حکومت کی اطاعت کرے اور قانون کی پابندی کرے۔ قرآن حکیم میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ۔

"اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے ارباب حکومت کی بھی۔" (سورۃ النساء: آیت ۵۹)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ رکھنے کی اور (حکومت کا حکم) سننے اور بجالانے کی، چاہے کوئی غلام تم پر امیر ہو جائے۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ چاہے وہ نکٹا حبشی غلام ہو۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور جو امیر کی اطاعت کرے اس نے میری اطاعت کی اور جو امیر کی نافرمانی کرے اس نے میری نافرمانی کی۔[2]

لیکن یہ بات واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی میں حکومت کی اطاعت فرض نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ مسلمان پر حکومت کی اطاعت لازم ہے۔ خواہ اسے حکم پسند ہو یا۔ پسند نہ ہو لیکن اگر وہ اللہ کی معصیت کا حکم دے تو پھر اطاعت نہیں کرنی چاہیئے۔

۲۔ حکومت سے تعاون:

اگر عوام حکومت سے تعاون نہ کریں تو حکومت اپنے فرائض منصبی سرانجام نہیں دے

---

[1] اربعین نووی، حدیث نمبر ۲۸۔ [2] مشکاۃ، کتاب الامارۃ، پہلی حدیث۔

سکتی اور نہ ہی تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے۔ اسلامی ریاست کے شہریوں کا فرض ہے کہ وہ نیکی، بھلائی اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں حکومت سے بھرپور تعاون کریں۔ قرآن حکیم میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

"تم نیکی اور تقویٰ کے معاملے میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور ظلم و زیادتی میں تعاون نہ کریں"۔

۳۔ ریاست سے وفاداری:

اسلامی ریاست کے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ ریاست کا خیر خواہ اور وفادار ہے۔ نہ تو خود کوئی ایسا کام کرے جس سے ریاست کو ضعف یا نقصان پہنچے اور اگر کوئی ایسی چیز دیکھے جس سے ریاست کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اسے دور کرے۔ اگر سرکاری ملازم ہے تو اپنے فرائض محنت، لگن اور دیانتداری سے سرانجام دے۔ سرکاری رازوں کا افشا نہ کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کے ہاتھ لگنے سے ریاست کو نقصان پہنچ جائے۔ رشوت ستانی اور اقربا پروری سے اجتناب کرے۔ لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے، قانون کا اطلاق لوگوں کے فائدے کے لئے کرے ان کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں۔ ملکی دفاع کے لئے جان و مال کسی چیز کی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ مختصر یہ کہ اپنے ذاتی مفاد پر ریاست کے مفاد کو ترجیح دے۔

۴۔ ٹیکسوں اور مالی واجبات کی ادائیگی:

ظاہر بات ہے کہ روپے پیسے کے بغیر کوئی حکومت اپنے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی اور نہ ہی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ حکومت نے سرکاری ملازمین کو تنخواہیں دینی ہوتی ہیں۔ ترقیاتی اور رفاہی منصوبے مکمل کرنے ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے لہٰذا اسے بے پناہ مالی وسائل درکار ہوں گے۔ یہ وسائل وہ ٹیکس اور مالی واجبات ہی تو ہیں جو حکومت لوگوں پر عائد کرتی ہے۔ بعض ٹیکسوں کو تو مذہبی تقدس حاصل ہے، مثلاً زکوٰۃ اور عشر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی حکومت جس قدر ٹیکس ضروری سمجھے لگا سکتی ہے۔ ہر شہری کا فرض ہے کہ دیانتداری اور خوش دلی کے ساتھ حکومت کو ٹیکس اور مالی واجبات ادا کرے۔

۵۔ ووٹ کا صحیح استعمال:

بیعت یا ووٹ کی صورت میں اپنی رائے کا اظہار بغیر کسی خوف اور لالچ کے کرنا چاہیئے۔

ووٹ ایک امانت ہے، اگر وہ اس کا صحیح استعمال نہ کرے گا تو خیانت کا مرتکب ہو گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو امانت دار نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں۔ اسی طرح حکومت کو مشورہ بھی دیانتداری اور خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے: اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ ..... یعنی جس سے مشورہ لیا جائے اسے امانت دار ہونا چاہیئے۔

۶۔ حکومت پر تعمیری تنقید:

حکومت کی پالیسیوں اور فیصلوں پر نظر رکھنا ہر شہری کا فرض ہے۔ اسی طرح ہر شہری کا فرض ہے کہ اگر وہ دیکھے کہ حکومت کی کوئی پالیسی، فیصلہ یا اقدام غلط اور نقصان دہ یا خلافِ اسلام ہے تو وہ اس کی نشاندہی کرے تاکہ حکومت اصلاح کر سکے۔ حکومت پر تعمیری تنقید کرنا ہر شہری کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہاد ہے۔ لہٰذا ہر شہری کو چاہیئے کہ کسی قسم کا خوف و خطر محسوس کئے بغیر تنقید کرے۔ اگر لوگ تنقید نہیں کریں گے اور غفلت کی نیند سو جائیں گے تو ایک اچھی حکومت بھی ظالم و جابر اور غلط کار بن سکتی ہے۔ شہریوں کی طرف سے تنقید کا تازیانہ حکومت پر مسلسل برستا رہنا چاہیئے۔

(ب) حقوق العباد کی ادائیگی:

مندرجہ بالا فرائض ریاست سے متعلق تھے جیسے معاشرے میں رہتے ہوئے شہری کو معاشرتی اور معاشی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ ویسے ہی اس پر معاشرتی اور معاشی فرائض بھی عائد ہوتے ہیں، جنہیں ہم دینی اصطلاح میں حقوق العباد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مختصر طور پر حقوق العباد سے مُراد ہے کہ ایک شہری کے ہاتھوں دوسرے شہریوں کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کے خون، اموال اور آبرو کا اسی طرح احترام کرنا چاہیئے جیسے ذوالحجہ کے مہینہ، مکہ کے شہر اور حج کے روز کا احترام ہوتا ہے۔ جان، مال اور آبرو سے متعلق حقوق کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ دوسروں کی جان محفوظ رہے:

جس طرح ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ ریاست میں اس کی جان محفوظ رہے اسی طرح اس

کا فرض ہے کہ اس کے ہاتھوں دوسروں کی جان محفوظ رہے۔ کسی شہری کو اجازت نہیں کہ وہ کسی دوسرے شہری کی جان یا جان سے کم تر (یعنی کسی عضو) پر جرم کا ارتکاب کرے۔ جو شخص کسی کو جان بوجھ کر قتل کرے گا اس کی سزا ابدی جہنم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنْ قَتَلَ مِنْكُمْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا

"تم میں سے جس نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے ایک جان کے ناحق قتل کو تمام بنی نوع انسان کا قتل قرار دیا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا

"جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔" (المائدۃ: ۳۲)

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ

"اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔" (الانعام: ۱۵۱)

اسی طرح کسی کے عضو پر جرم کرنا بھی ممنوع ہے اور جان یا عضو پر جرم کے ارتکاب کی صورت میں مجرم پر بدلے کا قانون (قصاص) لاگو ہو گا، جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور جراحت (زخم) کے بدلے جراحت۔

۲۔ دوسروں کے اموال محفوظ رہیں:

ہر شہری پر فرض ہے کہ وہ کسی کے مال کو نقصان نہ پہنچائے۔ مال کو نقصان پہنچانے کی کئی صورتیں ہیں:

چوری۔ ڈاکہ۔ رہزنی۔ سود خوری۔ جوئے بازی۔ ذخیرہ اندوزی (احتکار)۔ منافع خوری، ملاوٹ۔ رشوت۔ ان تمام صورتوں کی اسلام نے ممانعت کی ہے اور ان کے ارتکاب پر سخت سزائیں مقرر کر رکھی ہیں اور شدید وعیدیں سنائی ہیں۔

۳۔ دوسروں کی آبرو محفوظ رہے :

دوسروں کی عزت و آبرو پر حملہ کرنے کی کئی صورتیں ہیں :

گالی دینا ۔ بہتان باندھنا (قذف) ۔ بُرے نام سے پکارنا ۔ طعنہ دینا اور عیب گیری کرنا ۔ (ہمز، لمز) ۔ مذاق اڑانا ۔ چغلی کھانا ۔ زنا کا ارتکاب کرنا ۔ اسلام نے ان تمام صورتوں کی بیخ کنی کی ہے اور ان میں سے بعض جرائم پر سخت سزائیں مقرر کی ہیں ۔ (قذف کی سزا اسی کوڑے ؛ زنا کی سزا ایک سو کوڑے یا سنگساری) اور بعض پر سخت عذاب کی وعید سنائی ہے ۔

۴۔ اچھے شہری کے اوصاف :

اسلامی ریاست کے ایک اچھے شہری میں مختصراً حسب ذیل اوصاف ہونے چاہئیں :

ریاست کا وفادار ہو ۔

اچھے حقوق و فرائض سے آگاہ ہو ۔

حقوق کو فرائض پر بھاری نہ ہونے دے ۔ اپنے فرائض ادا کرے ۔

کم از کم بنیادی قوانین و قواعد کا علم رکھتا ہو ۔

روادار اور غیر متعصب ہو ۔

ریاست کی بین الاقوامی شہرت کا خیال رکھے ۔

امر بالمعروف اور نہی عَنِ المنکر کی تڑپ رکھتا ہو ۔

عالمگیر امن کا خواہاں ہو ۔

اچھی صحتؔ اور ذہانتؔ کا مالک ہو ۔ جان و بدن قوم کی امانت ہیں ۔ اس لئے نہ صرف ذاتی بلکہ ملی مقاصد کی خاطر بھی بدنی اور ذہنی صحت کی احتیاط رکھتا ہو ۔

کمزور طبع نہ ہو ۔ ضبطِ نفس کا خوگر ہو ۔

سوالات

۱۔ شہری سے کیا مراد ہے ؟ اسلامی ریاست میں شہری کے حقوق و فرائض بیان کیجئے ۔

۲۔ اسلامی ریاست میں ایک شہری کو کونسے حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ؟

۳۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک اچھے شہری کے اوصاف بیان کیجئے ۔

ریاست

مفہوم : ریاست میں چار چیزیں شامل ہوتی ہیں :

(۱) علاقہ (۲) آبادی

(۳) حکومت (۴) اقتدارِ اعلیٰ

ان کو ملا کر ریاست کہتے ہیں ۔

ریاست اور حکومت میں فرق :

حکومت اس ادارہ کا نام ہے جو کسی ریاست کا نظم ونسق چلاتا ہے ۔ حکومت ریاست کی خادم ہوتی ہے ۔ حکومت کو حسب ضرورت بدلا جا سکتا ہے ۔

ریاست کی اہمیّت : دین کی اشاعت :

دین کے استحکام اور اشاعت کے لئے ریاست کا وجود اگرچہ لابدی نہیں لیکن مفید ضرور ہے ۔ آغازِ اسلام میں جب تک اہل اسلام مکہ تک محدود تھے دین کی اشاعت بھی محدود تھی ۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مدینہ میں ایک آزاد اور خود مختار ریاست قائم فرمائی تو اسلام کی اشاعت تیز رفتاری سے ہونے لگی ۔

تنظیم :

ریاست کے بدولت قوم ایک رشتہ میں منسلک رہتی ہے اور انتشار سے محفوظ رہتی ہے ۔ ریاست قوم کو ایک مرکز پر جمع کر کے منظم کرتی ہے ۔

حکومت اور اس کے سربراہ کے بغیر قوم کی وحدت پریشان ہو جاتی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں بگاڑ آ جاتا ہے ۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ جب تین آدمی سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر کر لیں [1]

حکومت نہ ہو تو قوم میں اجتماعی قوت پیدا نہ ہو سکے ، بلائیں اور مصائب اس میں پنجہ گاڑ لیں ، دشمن کی فوج اسے پامال کر دے اور اس کے لئے دنیا میں کوئی باعزت مقام نہ ہو ۔ حکومت قوم کو منظم کر کے ہلاکت کی ہر یورش کا مقابلہ کرتی ہے ۔ جناب رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :

---

[1] ریاض الصالحین ، باب استحباب طلب الرفقۃ ۔

"حکومت کا سربراہ ڈھال ہوتا ہے جس کے پیچھے جہاد کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے بچاؤ کیا جاتا ہے۔" [1]

قومی ترقی :

حکومت سب ذرائع و وسائل کو ایک نظام میں لاکر افراد کی متحدہ قوت کے ذریعے قوم کو ترقی کی راہ پر چلاتی ہے۔ قومی ترقی کے لئے بعض دفعہ بڑے بڑے منصوبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ افراد کے بس کے نہیں ہوتے، حکومت ہی ان کا بیڑا اٹھا سکتی ہے۔

حکومت قائم کرنے کی تاکید :

قرآن حکیم اور احادیث میں حکومت قائم کرنے اور امراء کی اطاعت کی بہت تاکید آئی ہے۔ جو آدمی ریاست کا قائل نہ ہو اور عوام کے منتخب کردہ سربراہِ حکومت کو بغیر کسی دینی سبب کے نہ مانتا ہو وہ دوزخی ہے۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

(۱) جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور جو امیر کی اطاعت کرے اس نے میری اطاعت کی اور جو امیر کی نافرمانی کرے اس نے میری نافرمانی کی۔ [2]

(۲) اگر تم میں کوئی نکٹا غلام بھی حاکم ہو جائے اور کتاب اللہ کے بموجب حکم چلائے تو اس کی بات سنو اور حکم مانو۔ [3]

(۳) جو آدمی اس حالت میں مرے کہ اس کے گلے میں (سربراہِ حکومت) کی بیعت نہ ہو تو وہ کفر کی موت مرتا ہے۔ [4]

اقتدارِ اعلیٰ :

مثالی اقتدارِ اعلیٰ میں درج ذیل اوصاف کا ہونا ضروری ہے :

۱۔ وحدت :

اقتدارِ اعلیٰ کا صرف ایک مرکز ہو۔ اگر ایک سے زائد مرکز ہوں اور ایک دوسرے سے آزاد ہوں تو ان میں کسی پر اقتدارِ اعلیٰ کا اطلاق نہ ہو سکے گا۔ اقتدارِ اعلیٰ کو تقسیم ناپذیر ہونا چاہیئے۔ یہ حقیقی وجود رکھتا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ۔ پہلی حدیث۔ [2] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ پہلی حدیث۔
[3] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ دوسری حدیث۔ [4] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ۔

۲۔ تعین:

یہ بخوبی معلوم ہو کہ اقتدارِ اعلیٰ کس کے پاس ہے۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک کو اس کا نام معلوم ہو اور وہ اس کی اطاعت پر دل و جان سے یقین رکھتے ہوں۔ قوم کو اس بارے میں تذبذب نہ ہو۔

۳۔ حقیقت:

اقتدارِ اعلیٰ حقیقی ہو یعنی اس کا وجود برائے نام نہ ہو۔ کوئی اور ہستی اس کو اپنے اشاروں پر رقص کرانے والی نہ ہو۔ ایسا بھی نہ ہو کہ قانون تو اس کے نام سے چلتا ہو لیکن قانون بنانے والا کوئی اور ہو یا کوئی اور قومی تر طاقت اسے قانون بنانے یا بدلنے پر مجبور کرتی ہو۔

۴۔ حکمت:

اقتدارِ اعلیٰ حکیمانہ بصیرت سے متصف ہو۔ غلطی اور خطاء سے مبرا ہو کیونکہ ایک ہی غلطی بعض دفعہ پوری کی پوری ریاست کو فنا کر دیتی ہے۔

۵۔ عدل:

اقتدارِ اعلیٰ کو عادل ہونا چاہیئے۔ ہوس یا جانب داری اس کے فیصلہ پر اثر نہ ڈال سکے۔

۶۔ پائیداری:

اقتدارِ اعلیٰ نے اپنے استحکام کا ناقابلِ تردید ثبوت مہیا کر دیا ہو۔ اس کی قوت کا دلوں پر اس قدر رعب ہو کہ کسی کو اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کا خیال تک نہ آئے۔

۷۔ زوال ناپذیری:

اقتدارِ اعلیٰ کی پائیداری دائم ہونی چاہیئے، نہ تو انحطاط قبول کرے، نہ اس کی حدود کم ہوں، نہ اس کی قوت میں ضعف آسکے اور نہ یہ مٹ سکے۔ مختصراً ازلی و ابدی ہو۔

مندرجہ بالا اوصاف سوائے اللہ تعالیٰ کے نہ کسی فرد میں ہو سکتے ہیں اور نہ کسی انسانی ادارہ میں۔ اس لیے اسلام اللہ تعالیٰ ہی کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حیثیت اس زمین میں محض ایک نائب کی ہے جو دین و شریعت کے احکام کا نفاذ کر کے حاکمِ اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے۔

خلافتِ ارضی:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجموعی حیثیت میں زمین پر اپنا نائب بنایا ہے۔ اس نائب کے ذمے سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو دنیا میں بلند کرے اور اس کے آئین کا نفاذ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے۔ عبادت

کے دو گونہ معنی ہیں: ایک یہ کہ تعظیم و تمجید کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں ان کی پیروی کی جائے۔ اسے نماز و دعا کہہ لیجئے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کی جائے۔

جن و انس کے سوا دیگر اشیاء اللہ تعالیٰ کے حضور میں صلوٰۃ و تسبیح کا ہدیہ خود پیش کرتی رہتی ہیں اور اپنے فرائض اس طرح بجا لاتی ہیں کہ رتی بھر کی کسر نہیں رہتی۔ انسان کی فطرت میں آزادی کا میلان ودیعت ہے۔ اس لئے اس پر کچھ پابندیاں تجویز کر دی گئی ہیں۔ اور کچھ قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے گئے ہیں کہ یہ حدیں نہ پھلانگنے لگے۔

انسان سے اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور قواعد کی پابندی کون کرائے گا؟ خود انسان۔ یہ وہ ہستی ہے جو خود حاکم اور خود محکوم ہے۔ انسان اپنا حاکم ہے، لیکن حاکمِ اعلیٰ نہیں۔ حکمِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب حاکم یعنی خلیفہ ہے۔

خلافتِ الٰہی کی دعویدار وہی قوم ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی ہے، اس کے اقتدارِ اعلیٰ کو مانتی ہے اور اس کے نازل کردہ احکام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ جو قوم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتی یا اس کے احکام کو تسلیم نہیں کرتی وہ لاکھ زور آور، غالب اور متسلّط ہو، خلافتِ الٰہی کے شرف سے محروم ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک میں کوئی علاقائی حاکم بڑھ کر مرکزی حکومت سے باغی ہو بیٹھے تو اس کے غلبہ اور تسلّط کے باوجود اسے باغی کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے جو بندے اس سے باغی ہو جائیں وہ خلیفہ نہیں رہتے۔

سُورَۃُ النُّور (آیت ۵۵) میں اللہ تعالیٰ نے ان بندوں سے عطائے خلافت کا وعدہ فرمایا ہے جو

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں۔

(۲) نیک کام کرتے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

آیت کے آغاز میں "اٰمَنُوْا مِنْكُمْ" کے الفاظ ہیں یعنی تم میں سے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں۔ "مِنْكُمْ" (تم میں سے) کے لفظ صاف وضاحت کر رہے ہیں کہ جن میں مذکورہ اوصاف نہ ہوں وہ خلافت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

خلافت کی اہل قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ دین اس کے لئے مستحکم کر دیا جائے گا

یعنی کم از کم وہ خود دین پر سختی سے عمل پیرا ہو گی۔ دین سے ہٹ کر خلافتِ الٰہی کا قیام نہیں ہو سکتا۔

خلافت کا اہل ہونے کے لئے یہ تو لازم ہے کہ مومن قوم کو اپنے وطن میں پورا تمکّن اور استحکام حاصل ہو۔ اغیار کی طرف سے مامون اور بے خوف ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ ساری دنیا پر چھا جائے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے قرآنِ حکیم میں خلیفہ کہا ہے۔ آپ ساری دنیا کے حکمران نہ تھے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور خلافتِ راشدہ کے دور میں اسلامی قبضہ ساری دنیا پر نہیں پھیلا تاہم یہ خلافت، خلافتِ الٰہی تھی۔

خلافت، امارت، امامت، حکومت:

خلافت کے لئے امارت اور امامت کے لفظ بھی آتے ہیں لیکن آخری دو لفظوں میں عمومیت ہے اور بادشاہی کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ خلافت کا لفظ خاص ہے اور اصطلاحاً صرف اس امارت یا امامت کے لئے مستعمل ہوتا ہے جو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے طریقِ عمل کی پیرو ہو۔

حکومت کا لفظ جدید زمانے میں نہایت وسیع مفہوم کے ساتھ رائج ہے۔ خلافت، امامت اور امارت سب پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

ہمارے لئے خلافت کی صحیح اور قابلِ تقلید مثال خلافتِ راشدہ کی ہے۔ ہر دور کی اسلامی حکومت پر اس کی پیروی لازم ہے۔

شوریٰ:

خلافت کا حق پوری ملّت کو عطا ہوتا ہے۔ ملّت کے سب افراد نظم و نسق میں حصّہ دار ہوتے ہیں۔ وہ باہم مشورہ کر کے اپنی رضا سے کچھ اختیارات ایک دین دار اور اہل شخص کو سونپ کر اسے رئیس اعلیٰ مان لیتے ہیں۔ یہ شخص اصطلاحاً خلیفہ کہلاتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کہا ہے کیونکہ قوم کی سربراہی ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ چونکہ نبی تھے اس لئے ان کا انتخاب مشورہ سے نہیں ہوا۔ ویسے خلافت کے لئے باہمی مشورہ ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم اسے شوریٰ کا نام دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں مسلمانوں کے بارے میں ارشاد ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص (۴۲ : ۳۸)

ترجمہ: اور ان کا امر باہمی مشورہ سے ہوتا ہے۔

یعنی وہ اپنے کاموں میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں۔

ریاستی سطح پر آجکل اسے عموماً جمہوریت کہا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت کچھ مختلف ہے کیونکہ اقتدارِ اعلیٰ نہ قوم کے پاس ہوتا ہے اور نہ خلیفہ کے پاس بلکہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

خلیفہ کے تقرر اور عزل کا حق ساری قوم کو حاصل ہوتا ہے وہ آئے دن کے معاملات میں بھی رائے دینے کا پورا حق رکھتی ہے۔ خلافت کا تقاضا ہے کہ شوریٰ پر مکمل طور سے عمل کیا جائے تاکہ ملت کا ہر فرد خلافت میں حصہ دار ہو سکے۔ انسان مجموعی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ سوائے نبی کے کسی انفرادی شخص کو خلیفۃ اللہ کہنا بجا نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو کسی نے خلیفۃ اللہ کہا تو انہوں نے پسند نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ ثانی کو بھی ایک شخص نے خلیفۃ اللہ کہا تو فرمایا کہ خلیفۃ اللہ داؤد علیہ السلام تھے یا ان کی طرح کے دیگر پیغمبر۔

شوریٰ کی روح :

ضروری نہیں کہ ہر عہد اور ہر ملک میں شوریٰ پر عمل کی ایک ہی صورت ہو۔ مقصود فقط یہ ہے کہ اس کے تقاضے پورے کئے جائیں چاہے کسی طریقے سے ہوں۔

زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی، اس میں رسوم و قیود اور آئینی اور قانونی بندھن اس وقت تک کام دیتے ہیں جب تک دلوں پر اخلاق کی حکومت ہو۔ قوم صاحبِ کردار ہو اور دنیاوی کاروبار کی سوجھ بوجھ رکھتی ہو تو وہ زیادہ تکلفات میں پڑے بغیر آئین اور قانون کی لاج رکھے جاتی ہے۔ خلافتِ راشدہ کا دور ہمارے لئے مثال اور معیار کا کام دیتا ہے جو شخص قوم کا خادم ہوتا تھا وہی عزت اور اقتدار پاتا تھا۔ سب بڑے بڑے صحابہؓ عوام کے محبوب قائد تھے۔ انہوں نے موجودہ طرز کے انتخاب نہیں لڑے تھے لیکن عدیم المثال قربانیوں اور حکیمانہ بصیرت کے بدولت عوام کے دل جیت رکھے تھے۔ ان کے سامنے صرف قوم کی فلاح ہوتی تھی۔ ہوا و ہوس کا دخل نہ تھا، اور نہ من و تو کی تکرار سننے میں آتی تھی۔ وہ جو فیصلہ کرتے تھے عوام اس پر عمل کرنے کے لئے ہمہ تن آمادہ رہتے تھے۔ رہنماؤں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ عوام کے دلوں کی آواز ہوتے تھے۔ حکام عوام پر نعمت تھے اور عوام حکام پر مفتون۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بہترین امام یعنی حکمران وہ ہیں جنہیں تم چاہتے ہو اور وہ تمہیں چاہتے ہیں۔ تم ان کے لئے دعاگو ہو اور وہ تمہارے دعاگو ہیں۔ [1]

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ۔

حکومت کے فرائض :

۱۔ بیت المال کا صحیح مصرف :

حکومت کا فرض ہے کہ بیت کا المال کا صحیح استعمال کرے۔ ایک ایک پائی صرف جائز اور ضروری امور میں خرچ کرے۔ کسی مد میں فضول خرچی کو دخل نہ ہو۔

۲۔ جان، مال اور آبرو کی حفاظت :

ہر شہری کی چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرنا حکومت کے اولین فرائض میں شامل ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں ایک اسلامی سفیر رومی سلطنت میں مارا گیا۔ آپؐ نے اس کا انتقام لینے کے لئے فوراً ایک لشکر روانہ فرمایا جس کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی اور جسے روما کی لاکھوں کی فوج سے ٹکر لینی تھی۔

لوگوں کی حفاظت کے لئے پولیس کا خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص کسی کو زخمی یا قتل کردے یا اس کی ہتک کرے یا اس کا مال دھوکے سے یا جبر سے ہتھیالے تو اسے موزوں سزا دی جائے۔

۳۔ قومی دفاع :

حکومت کا فرض ہے کہ وہ اغیار کے مقابلہ پر اسلحہ اور ساز و سامان سے آراستہ فوج ہر وقت تیار رکھے۔ قرآنِ حکیم میں اس بارے میں تاکیدی ہدایات ہیں۔ ممکن ہو تو ہر مسلمان کو سپاہیانہ تربیت دی جائے۔

۴۔ عہدوں پر اہل افراد کا تقرر :

حکومت کی کل اس کے عملہ سے چلتی ہے۔ عہدوں پر موزوں ترین آدمیوں کا تقرر ہونا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے جس قدر احتیاط اور تحقیق ہو سکے ضروری ہے۔ عہدوں پر موزوں افراد کا تقرر ہو تو حکومت کی کامیابی میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی۔

۵۔ قومی وحدت کی حفاظت :

حکومت کو لازم ہے کہ وہ رعیت سے جزا فیائی اور نسلی عصبیت کو دور رکھے۔ عصبیت قوم کی جڑ کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔

۶۔ اَمر بالمعروف اور نہی عَنِ المنکر۔

حکومت کا فرض ہے کہ ملک میں نیکی کی اشاعت اور برائی کے استیصال کے لئے کوشاں رہے۔ اسلامی حکومتوں میں اس غرض کے لئے احتساب کے صیغے قائم رہتے ہیں۔ قوم کی قوت کا انحصار اخلاق

پر ہوتا ہے۔ اگر اخلاق اٹھ جائے تو قوم زندہ رہنے کے قابل رہتی ہے اور نہ حکومت بقاء کی حق دار۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمہ گیر عذاب نازل ہوتا ہے۔

۷۔ کفالتِ عامّہ :

اسلامی حکومت تمام شہریوں کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ کا قول ہے کہ دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا سویا تو اس کیلئے عمر جوابدہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں دین کی حفاظت اور اشاعت بھی اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔

اہلِ ذمّہ :

اہل ذمہ ان غیر مسلموں کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت میں مستقلاً آباد ہوں۔ ان کے حقوق کا کچھ تذکرہ سابقہ صفحات پر گزر چکا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے یہاں اتنا بتا دیا جائے کہ اسلامی حکومت اہل ذمہ کی جان و مال اور آبرو کی محافظ ہوتی ہے۔ وہ مذہبی آزادی کا پورا حق رکھتے ہیں۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ معاشی اور معاشرتی مساوات میسّر ہوتی ہے۔

اہل ذمہ کو فوجی خدمت لازم نہیں ہوتی۔ اس کے عوض ان اہلِ ذمہ کو جو فوجی خدمت کے قابل ہوں لیکن اس سے مستثنیٰ رہنا چاہیں ایک ہلکا سا ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے جسے جزیہ کہتے ہیں۔

ذمیوں کے ذاتی معاملات کے لئے ان کے مذہبی قوانین پر عمل ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں ان کے درمیان کوئی قضیہ پیدا ہو جائے تو ان کے اپنے منصف فیصلہ کرتے ہیں۔

جو اہلِ ذمّہ معذور اور حاجت مند ہوں ان کو قومی بیت المال سے وظیفہ ملتا ہے۔

○

سوالات

۱۔ ریاست سے کیا مراد ہے؟ اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ اسلام میں ریاست کا کیا تصور ہے؟

۲۔ اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیات بیان کیجئے۔

نوٹ: اس سوال کے جواب میں اللہ کی حاکمیت اعلیٰ، خلافت اور شوریٰ کا ذکر کرنے کے بعد حکومت کے فرائض کو ریاست کے فرائض کی حیثیت سے بیان کر دیجئے۔

۳۔ اسلام میں ریاست کی ضرورت و اہمیت بیان کیجئے۔

نوٹ: اسلام میں ریاست کی اہمیت "قومی ترقی"، "حکومت قائم کرنے کی تاکید" کے تحت جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا ذکر کیجئے اور پھر "حکومت کے فرائض" کے تحت جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کو بیان کر دیجئے۔ مگر اس سے پہلے یہ لکھیے کہ ریاست چونکہ مندرجہ ذیل امور اور خدمات سرانجام دیتی ہے اس لئے اس کا وجود ضروری ہے۔

۴۔ ریاست اور حکومت میں کیا فرق ہے؟ ریاست کی ضرورت و اہمیت قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کیجئے۔

اُمّت

مفہوم : اُمّت کے کئی لغوی معنی ہیں ، مثلاً :

(۱) زندگی کا رستہ یا طریقہ ۔

(۲) ایک نسل یا پشت ۔

(۳) ہر حیوانی روح مثلاً گائے ، بھینس ، گھوڑا ۔

(۴) خاندان ۔ (۵) ملک

(۶) جماعت یا قوم چاہے اس میں مختلف مذہبوں کے افراد شامل ہوں ۔

ایسی جماعت کے سامنے نبی دعوت پیش کرے تو اسے اُمّتِ دعوت کہتے ہیں ۔

۷ ۔ نبی کے پیرو ——— اسے اُمّتِ اجابت کہتے ہیں ۔

اس وقت ہمارے عنوان کا مفہوم آخری معنی کے اعتبار سے ہے یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے نام لیواؤں کی جماعت ۔ اسے عموماً اُمّتِ محمدیہ یا اُمّتِ مُسلمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اسے ملّتِ اسلامیہ بھی کہتے ہیں ۔

اُمّتِ مُسلمہ ایک وسیع اور عالمگیر ادارہ ہے ۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر مسلمان اس کا رکن ہے ۔ تمام ارکان کو اس ادارہ میں برابر کی اہمیّت حاصل ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ان پڑھ اور نادار شخص جو بظاہر ہیں آنکھ کو حقیر نظر آتا ہے ۔ کل جہاد کے موقع پر کوئی ایسی خدمت انجام دے جائے جو بڑے سے بڑے عہدہ دار کے حصہ میں بھی نہ آئی ہو ۔

رُکنیت کی بنیاد یا شرط ۔ صرف کلمۂ شہادت :

دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سب مسلمان اُمّتِ مسلمہ کے رکن ہیں ۔ اس رکنیت کے لئے کوئی رسمی فارم بھرنے یا چندہ جمع کرنے کی حاجت نہیں ۔ صرف اس قدر کافی ہے کہ آدمی زبان سے کلمۂ شہادت ادا کرے ۔ ہر وہ بچہ بھی اُمّتِ مسلمہ کا فرد ہوتا ہے جو اس اُمّت میں پیدا ہو ۔

کلمۂ شہادت انسان کو امت مسلمہ کی رکنیّت میں فوراً داخل کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ کسی اسلامی عقیدہ سے انکار نہ کرے ۔ ہم کسی کا سینہ چیر کر اس کی نیت کا بھید نہیں ڈھونڈ سکتے ، اس

لئے اگر کوئی شخص دھوکہ دینے کے لئے مسلمان بن جائے تو ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا کہ وہ منافق ہے۔ اسے اس وقت تک دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھ سکتے جب تک وہ اعلانیہ اسلام کے کسی بنیادی عقیدہ کا منکر نہ ہو جائے۔ ایسے شخص کے اعمال فاسقانہ بھی ہوں تو زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اعمال منافقوں کے سے ہیں۔ اس پر منافقت کا حکم نہیں لگ سکتا۔ اس کی بداعمالیوں سے بیزاری اور لاتعلقی کا اظہار ہو سکتا ہے لیکن اس کی ذات سے بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان نہ ہوگا۔ اسے اُمّتِ مُسلمہ کے حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

ایک صحابی حضرتِ مقداد بن الاسودؓ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی کافر سے میرا سامنا ہو جائے اور وہ تلوار کے وار سے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے، پھر کسی درخت کی اوٹ میں پناہ لے کر کہہ دے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں تو یا رسول اللہ! کیا اس کے ایسا کہنے کے بعد اسے قتل کر دوں؟ حضورؐ نے فرمایا، اسے قتل نہ کر۔ اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو اس کے قتل سے پہلے جو تیری منزلت تھی وہ اس کی ہو جائے گی اور اس کے یہ بات کہنے سے پہلی جو منزلت اس کی تھی وہ تیری ہو جائے گی۔

حضرتِ اُسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ فرمایا۔ ہم دشمن قبیلہ پر حملہ آور ہوئے۔ میں ایک شخص کے سر پر پہنچا تو اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ دیا۔ تاہم میں نے اسے برچھی مار دی لیکن میرے دل میں شبہ بیٹھ گیا۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا اس کے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنے کے باوصف تو نے اسے مار دیا؟ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اس نے محض اسلحہ کے خوف سے کلمہ پڑھا۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ اس کے دل سے آواز اٹھی تھی یا نہیں۔ حضورؐ یہ فقرہ بار بار دہراتے رہے۔ میری یہ حالت ہو گئی کہ میں نے چاہا کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔[1]

اُمّتِ اسلامیہ کی رکنیت کا دروازہ ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا ہے۔ قومی، نسلی یا جغرافیائی تفریق سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ہر رکن اس عالمگیر ادارے کی مساوات سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اہلیت ہو تو ایک سیاہ فام حبشی بھی خلافت پر فائز ہو سکتا ہے۔

اُمّت کا کوئی عہدہ یا منصب موروثی نہیں ہوتا۔ علم اور روحانیت کو بھی کسی ایک خاندان میں

---

[1] مسلم کتاب الایمان۔

مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں برہمنوں کی طرح کوئی ایسا طبقہ نہیں جو علم یا روحانیت کو اپنے لئے مخصوص کرے۔ اس امت میں شودروں کی کوئی ناپاک ذات نہیں۔ ہر مومن پاکیزہ ہوتا ہے۔

قوم اور اُمّت میں فرق :

اگرچہ بعض اوقات قوم اور اُمّت کو ایک ہی معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے اور فی الحقیقت قوم اور اُمّت بالکل مختلف معنی و مفہوم رکھنے والی اصطلاحیں ہیں۔ قوم کی بنیاد عام طور پر رنگ، نسل، زبان، وطن۔ سیاسی تنظیم کی وحدت اور مشترکہ معاشی اور دفاعی مفادات پر ہوتی ہے۔ جب کہ امت کی بنیاد صرف اور صرف دین اور اصول و نظریات پر ہوتی ہے۔ مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے افراد ایک ہی اُمّت سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی قوم کے افراد مختلف امتوں سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ اس کی وضاحت ان مثالوں سے اچھی طرح ہو جائے گی۔

(۱) پاکستان میں بسنے والے ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلمان سب پاکستانی قوم کے افراد ہیں۔ لیکن ان میں سے اُمّتِ مُسلمہ کے ارکان صرف اور صرف مسلمان ہیں۔

(۲) امریکی قوم، روسی قوم، جرمن قوم، چینی قوم، جاپانی قوم، مصری قوم، ہندوستانی قوم وغیرہ دنیا کی سب اقوام کے جو افراد مسلمان ہیں وہ سب کے سب اُمّتِ مسلمہ کے ارکان ہیں۔

ان مثالوں سے واضح ہو گیا کہ اُمّت ایک وسیع تر چیز ہے جب کہ قوم محدود تصورات پر مبنی۔ اُمّت بنی نوعِ انسان کی وحدت کی علمبردار ہے کہ اس میں رنگ، نسل، زبان، جغرافیہ وغیرہ کسی بھی قسم کے امتیاز کو روا رکھنے کی گنجائش نہیں ہے جبکہ قوم کی بنیاد ہی یہ امتیازات ہیں۔ لہٰذا قوم بنی نوعِ انسان کے اتحاد میں رکاوٹ ہے۔

اُمّتِ مسلمہ کی امتیازی خصوصیات :

قرآن و حدیث سے امتِ مسلمہ کی کئی امتیازی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے بعض اہم خصوصیات درج ذیل ہیں :

۱۔ بہترین اُمّت :

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُمّتِ مُسلمہ کو بہترین اُمّت قرار دیا ہے، یہ اس اُمّت کا سب سے بڑا اعزاز اور سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ

"تم ایک بہترین اُمّت ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔

الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور
سورہ آل عمران ۳ : ۱۱۰ اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

مذکورہ بالا آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُمّتِ مسلمہ کو بہترین اُمّت اس لئے قرار دیا ہے کہ لوگوں کی اصلاح و ہدایت کی ذمے داری اب انہیں کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے، یہ انسان کا دنیا میں اہم ترین منصب ہے۔ انبیاء اور رسولوں نے بھی یہی فریضہ سرانجام دیا تھا جو اب اُمّتِ مسلمہ کو سونپا گیا ہے۔ اُمّتِ مسلمہ کے افراد نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے یعنی یہ دنیا میں خیر کے علمبرداروں کی زندگی بسر کریں گے۔ اس خصوصیت کی حامل اُمّت واقعی بہترین کہلانے کی مستحق ہے۔ یعنی بہترین اپنے رنگ، نسل اور زبان وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہیں، جیسا کہ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم انبیاء کی نسل سے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے لاڈلے ہیں بلکہ یہ تو اپنے رول اور سیرت و کردار کی وجہ سے بہترین اُمّت ہے۔ فضیلت کی اس وجہ پر کسی صاحبِ عقل کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اُمّتِ وَسط!

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اُمّتِ مُسلمہ کو اُمّتِ وسط قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک اُمّتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔ (البقرۃ، آیت: ۱۴۳)

اُمّتِ وسط سے مراد میانہ روی والا گروہ ہے، جو اعتدال کی روش پر قائم رہے۔ افراط و تفریط، انتہا پسندی سے اجتناب کرے۔ دنیا کی دوسری قوموں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہو۔ سب سے اعلیٰ و اشرف گروہ، جس کا تعلق سب لوگوں اور قوموں کے ساتھ حق اور راستی کا ہو، ناحق اور باطل تعلق کسی کے ساتھ نہ ہو۔ بلاشبہ اعتدال اور میانہ روی کی راہ ہی خیر اور سلامتی کی راہ ہے۔ اعتدال کی روش ہی بہترین روش ہے، اُمّتِ مسلمہ جس دین کی حامل ہے وہ سراسر عدل کے اصولوں پر مبنی ہے، اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دین کی پیروی کرنے والی اُمّت فی الواقع "اُمّتِ وَسَط" ہے۔

۳۔ دینِ کامل کی حامل امت:

اُمّتِ مسلمہ جس دین کی پیروکار ہے وہ کامل دین ہے۔ سیّدنا آدم علیہ السلام سے لے کر امام الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے انبیائے کرام جو مذاہب و ادیان لے کر آئے وہ کامل نہ تھے بلکہ ارتقائی مراحل طے کر رہے تھے تا آنکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں

تشریف لائے اور بنی نوعِ انسان کی اصلاح و ہدایت کے لئے دین اسلام ساتھ لائے۔ یہ دین کامل ہے، انتہائی ترقی یافتہ ہے، اب اس میں کوئی کمی نہیں۔ اس دین کے کامل ہونے کی شہادت اللہ تبارک و تعالیٰ نے دی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدۃ، ۵: ۳)

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے، اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا ہے۔"

۴۔ آخری اُمّت:

چونکہ اُمّتِ مسلمہ کو جو دین عطا کیا گیا ہے وہ کامل دین ہے اور اب اس میں کسی ترمیم و اضافہ اور ارتقاء کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبوّت و رسالت کے سلسلے کو منقطع کر دیا ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی یا رسُول نہیں آئے گا۔ لہٰذا اُمّتِ مسلمہ بھی آخری امت ہے۔ قرآنِ حکیم میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ کہا گیا ہے۔ اسی طرح احادیثِ نبویہ بھی اس حقیقت پر صراحت اور قطعیت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمت ہو۔

۵۔ عالمگیریت:

اُمّتِ مسلمہ کی ایک امتیازی خصوصیت اس کا عالمگیر ہونا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جتنے بھی انبیاء و رُسل آئے وہ کسی خاص قوم، نسل یا ملک میں مبعوث ہوئے اور ان کا پیغام ایک خاص عرصے تک کے لئے ہوتا تھا اس کے بعد دوسرا نبی یا رسول آجاتا تھا۔ لہٰذا اُمّتِ محمدیہ سے پہلے کی تمام اُمتیں نسلی، قومی، علاقائی یا وقتی تھیں۔ ان سب سابقہ اُمتوں کے برعکس اُمّتِ مسلمہ ایک عالمگیر اُمّت ہے۔ اس کی بنیاد نسل، قوم یا وطن نہیں اور نہ ہی یہ ایک خاص مدت تک کے لئے ہے کیونکہ اس اُمّت کے نبی و رسول حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساری دنیا کے انسانوں کے لئے مبعوث کیا گیا ہے اور آپؐ کا دین آخری دین ہے جو قیامت تک کے لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لئے کافی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ (سبا، ۳۴: ۲۸)

"اور (اے نبیؐ) ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔"

اسی طرح ایک اور مقام پہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف ، ۷ : ۱۵۸)

" (اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ اے لوگو بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔"

پس دنیا کا کوئی بھی انسان ، خواہ وہ کسی رنگ ، نسل ، علاقے ، زبان ، قوم ، مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ کلمۂ شہادت پڑھنے کے بعد اُمّتِ مُسلمہ کا فرد بن جائے گا۔

۶۔ اخوّت :

پوری اُمّتِ مسلمہ ایک برادری ہے خواہ اس کے افراد پوری دنیا میں منتشر اور پھیلے ہوئے ہوں اور کسی بھی نسل ، قوم یا ملک سے تعلق رکھتے ہوں اور چاہے کوئی بھی زبان بولتے ہوں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹ : ۱۰) یعنی " مومن تو ایک برادری ہے۔"

کتنا گہرا اور مضبوط رشتہ قائم کیا ہے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس اُمّت کے افراد کے مابین! جس طرح بھائی اپنے بھائی کا ہمدرد ، خیر خواہ ، مخلص ، محبت کرنے والا ، مدد کرنے والا ، غمخوار و غمگسار ہوتا ہے اسی طرح کے جذبات اُمّتِ مسلمہ کے تمام افراد ایک دوسرے کے لئے رکھتے ہیں۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک حدیث ہے کہ " مسلمان ، مسلمان کا بھائی ہے ، وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔" اسی طرح ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ : تُو مسلمانوں کو باہمی ہمدردی ، محبت اور شفقت میں ایک جسم کے مانند پائے گا ، کہ اگر اس کے ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کا محمد علی باکسر جب فتح حاصل کرتا تھا تو ہزاروں میل کے فاصلے پہ پاکستانی مسلمان خوش ہوتے تھے۔ اور جب اس کو شکست ہوئی تو یہ سب افسردہ ہو گئے تھے جب کہ محمد علی کے اسلام لانے سے قبل اس کو یہاں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اگر مسلمانوں میں حقیقی بھائیوں والے جذبات مفقود ہوں تو سمجھیئے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں یا ان کا ایمان کمزور ہے۔ (اخوت پر تفصیلی بیان آگے آ رہا ہے)۔

۷۔ خصوصی شعائر :

شعائر جمع ہے شعار کی ، اس کا معنی امتیازی علامت اور نشان ہے۔ اس سے مُراد وہ امتیازی علامات ہیں جو دوسروں میں نہ ہوں۔ ہر قوم اور امت کے کچھ شعائر ہوتے ہیں جن سے اُن کی پہچان ہوتی ہے۔ اُمّتِ مسلمہ کے بھی بعض شعائر ہیں جو اس کے ساتھ مختص ہیں اور جن

سے اس کے افراد اور سوسائٹی کی پہچان ہوتی ہے۔ اُمّتِ مسلمہ کے بعض خصوصی شعائر یہ ہیں:

ملاقات کے وقت آداب کہنے (Greetings) کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔ ایک مسلمان السّلام علیکُم (تم پر سلامتی ہو) کہتا ہے تو دوسرا جواب میں وَعلیکُم السّلام کہتا ہے۔ ان کی عبادت گاہیں مخصوص طرز اور وضع قطع کی ہیں جن کو مساجد کہتے ہیں۔ اذان، نماز، حج، روزہ، قبلہ، قربانی، نعرہ تکبیر یہ سب شعار ہیں۔ ان شعائر کو زندہ رکھنا اُمّت کی مرکزیت اور وحدت کو زندہ رکھنا ہے۔ ان شعائر سے اُمّت مسلمہ کی صرف شناخت ہی نہیں ہوتی بلکہ ان سے ملّی حمیّت اور شان و شکوہ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

حقوق و فرائض:

اُمّتِ مسلمہ کے باہم برادرانہ حقوق ہیں۔ اسے ہم اُخوّت کا جامع نام دیتے ہیں۔ اس پر مکمل بحث آئندہ صفحات میں آئے گی۔

اُمّت کی قوت جس قدر زیادہ ہو وہ اعداء کی یورش سے اسی قدر مامون رہتی ہے۔ اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، یعنی تبلیغ اور دفاع۔ تبلیغ کا مقصد صرف اُمّتِ مسلمہ کی عددی توسیع نہیں بلکہ اس سے اعلیٰ تر ہے۔ اسی طرح جہاد کا مقصد محض جان کا نہیں بلکہ نیکی کا دفاع ہے جیسا کہ آئندہ صفحات سے ظاہر ہوگا۔

بہرحال اُمّت کے حقوق و فرائض پر ان تین عنوانوں کے تحت نظر ڈالی جا سکتی ہے۔

یعنی (۱) اخوّت (۲) تبلیغ (۳) جہاد

آئندہ صفحات میں ان عنوانات پر الگ الگ بحث کی جائے گی۔

سوالات

۱۔ اُمّت اور قوم میں کیا فرق ہے؟ اُمّتِ مسلمہ کی امتیازی خصوصیات بیان کیجئے۔

۲۔ اُمّت کا مفہوم بیان کیجئے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اُمّتِ مسلمہ کے بنیادی خصائص بیان کیجئے۔

○

اُخوّت

مفہوم : اُخوت کے معنی ہیں : برادری - "اَخ" بھائی کو کہتے ہیں۔ اس کے مفہوم میں سگے بھائی کے علاوہ رشتہ کا بھائی، خاندان کا رکن، ہم مذہب، ہم قوم، ہم قبیلہ، ہم پیشہ اور دوست بھی شامل ہیں۔ اخوت اسلامی سے مراد ہے اُمّتِ مسلمہ کے افراد کا باہمی بھائی چارہ یا برادری۔ اسلامی برادری میں ہر کلمہ گو شامل ہے خواہ وہ کسی بھی قوم، قبیلے، رنگ، نسل سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ حاکم ہو یا محکوم، عالم ہو یا جاہل۔

اہمیت

اللہ تبارک و تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ نے مسلمانوں کے باہمی بھائی چارے اور برادرانہ تعلق پر بہت زور دیا ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (سُوْرَۃ الحجرات ۴۹ : ۱۰)

ترجمہ : "مسلمان تو بھائی بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو۔"

احادیث نبوی :

حجۃُ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک لاکھ سے زائد صحابہ رضؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

- اے لوگو ! میری بات سُنو اور سمجھو۔ جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ سب اہلِ اسلام کی ایک برادری ہے۔ کسی شخص پر اس کے بھائی کا مال حلال نہیں جب تک خود رُوا نہ کر دے۔ ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ [1]
- حدیث میں آیا ہے کہ اہلِ ایمان آپس میں ایک عمارت کی مثال ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔

صرف آپس میں دوستی رکھنے کا حکم :

اسلامی اخوت کا رشتہ ناقابلِ شکست ہے، کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ کوئی مسلمان اسے

---

[1] طبری، ابن ہشام، ترمذی ابواب تفسیر القرآن (سورۃ التوبہ)

توڑنا چاہے تو وہ اسلام سے ہی کٹ جاتا ہے۔ مسلمان کو قطعاً روا نہیں کہ اُمّتِ مسلمہ کو چھوڑ کر اغیار کے ساتھ قلبی روابط استوار کرے۔ قرآنِ حکیم میں صاف بتایا گیا ہے کہ مسلمان کی مُوالات (یعنی قلبی محبّت اور دوستی) اللہ تعالیٰ، اس کے رسُول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور جماعت مومنین ہی سے ہو سکتی ہے۔ دیگر اقوام سے اسے دنیاوی رسم وراہ رکھنے کی اجازت ہے۔ ان کے ساتھ شرافت اور صداقت سے پیش آنے کا حکم ہے۔ مگر ان سے مسلمان کا سا ربط قائم نہیں ہو سکتا جو ٹوٹ ہی نہ سکے۔ صاحبِ ایمان شخص کے دل کی دُنیا اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور مومنین کے لئے وقف رہتی ہے۔ وہ مسلمان بھائیوں کے ساتھ مہر و محبّت سے رہتا ہے قرآنِ حکیم کا مسلمانوں کے بارے میں ارشاد ہے: رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ یعنی وہ ایک دوسرے کے لئے پیکرِ رحمت ہوتے ہیں۔

باہم خلوص رکھنے کی تلقین:

اخوت کا اصل الاصول خلوص یا نیک نیتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک بار صحابۂ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ دین خلوص کا نام ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ خلوص کس کے لئے ہو؟ فرمایا، اللہ تعالیٰ کے لئے، مسلمانوں کے اماموں کے لئے اور ان کے عوام کے لئے۔[1]

جذبۂ اُخوّت کی تقویت کے لئے جہاد:

ہر مسلمان کو لازم ہے کہ وہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھے اور ان سے میل جول اور راہ و رسم بڑھاتا رہے۔ جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس سلسلہ میں کچھ واضح ہدایات دی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق مسلمانوں پر یہ ہیں:

(۱) سلام کا جواب دینا۔
(۲) مریض کی عیادت کرنا۔
(۳) جنازہ کے ساتھ ساتھ جانا۔
(۴) دعوت قبول کرنا۔
(۵) کوئی چھینک کر الحمد للہ کہے تو اسے یَرْحَمُکَ اللہ کہنا[2] (اسے شرع میں تشمیت کہتے ہیں)

---

[1] ریاض الصالحین، باب النصیحۃ۔
[2] الترغیب والترہیب (از بخاری، مسلم، ابوداؤد)

ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

جب کوئی آدمی کسی مریض کی عیادت کرتا ہے یا اپنے کسی بھائی کے پاس اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جاتا ہے تو ایک آواز دینے والا اسے آواز دیتا ہے کہ تو بھی خوب ہے اور تیرا چلنا بھی خوب ہے۔ تو نے جنت میں اپنا گھر بنا لیا۔[1]

احادیث میں میل ملاپ رکھنے اور تحائف کے لین دین کی بہت تاکید ہے۔

نااتفاقی کی ممانعت :

مسلمان کو مسلمان کے ساتھ بگاڑ پیدا کرنے کی اجازت نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ مسلمان کے لئے روا نہیں کہ مسلمان بھائی سے تین روز سے بڑھ کر تعلقات منقطع رکھے۔

جس قوم میں اتحاد نہ رہے وہ ضعف کا شکار ہو جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے :

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا ۚ (الانفال ۸ : ۴۶)

ترجمہ: اور آپس میں تنازع نہ کرو ورنہ تم کمزور دل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور ثابت قدم رہو۔

غیر مسلموں سے بارہا تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور بعض دفعہ جنگ کی نوبت بھی آجاتی ہے لیکن مسلمانوں کو آپس میں لڑنے جھگڑنے کا خیال تک نہیں آنا چاہیئے۔ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے قتال کرنا (یعنی اس کی جان پر حملہ کرنا) کفر ہے۔[2] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان مامون رہیں۔[3] آپؐ کی ایک مفصل حدیث میں ہے کہ :

حدیث نبوی :

" آپس میں حسد نہ کرو، محض دوسرے کے لئے قیمت بڑھانے کی بولی نہ دو، آپس میں بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو۔ ایک دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرو۔ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے۔ نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اسے حقیر جانتا ہے۔ آپؐ نے تین بار سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، تقویٰ یہاں ہے۔ ایک مرد کو اتنا ہی شر بہت ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔ ہر مسلمان کا سب کچھ دوسرے

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ [2] ترمذی جلد ۲، کتاب الایمان [3] بخاری کتاب الایمان

مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔[1]

ارشادِ نبوی ہے کہ مسلمان کو حلال نہیں کہ اپنے (مسلمان) بھائی کی طرف ایسی نگاہ سے بھی اشارہ کرے جس سے وہ رنجیدہ ہو۔[2]

باہمی حقوق یا اخوتِ اسلامی کی خصوصیات:

اہلِ اسلام کے ایک دوسرے پر بے شمار حقوق ہیں۔ ان کی بجا آوری اس خوش قسمت انسان کو ہی نصیب ہو سکتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سچا ایمان عطا کیا ہو۔ مختصراً ان حقوق کا مطالعہ درج ذیل عنوانوں کے تحت کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مسلمان کی مکمل خیر خواہی اور اعانت۔

(۲) اپنی ذات پر ترجیح۔

(۳) اس کے حق میں اچھا بولنا۔

(۴) ہر حال میں جماعت سے وابستگی۔

ذیل میں ہم ان عنوانوں پر الگ الگ بحث کریں گے۔

۱۔ مسلمان کی مکمل خیر خواہی اور اعانت:

رہبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے بھی وہ (بھلائی) نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔[3]

ایک مسلمان کا حق دوسرے مسلمان پر ایک جملہ میں یہ ہے کہ اس کا دل اور اس کی زبان اس کی خیر خواہ ہوں اور ضرورت پڑنے پر ہر جانی اور مالی ایثار کے لئے تیار ہو جائے۔ قرآن حکیم نے آگاہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ اس سے یہی مراد ہے کہ مومن کو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے بندوں کی خدمت کے لئے ہر وقت آمادہ رہے۔ اسلام بے شک اپنے پیروؤں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ سب نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے مستعد رہیں لیکن جو مقام اور خصوصیت اپنے مسلمان بھائیوں کے حقوق کی ہے اسے کوئی اور کیونکر پہنچ سکتا ہے۔

---

[1] اربعینِ نووی حدیث۔ ۳۵ [2] احیاءُ العلوم باب حقوق المسلم [3] صحیح مسلم، کتاب الایمان

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اس پر ظلم نہیں کرتا۔ اور نہ اس کو (مصیبت کے) حوالے کرتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کا حاجت روا ہو اللہ تعالیٰ اس کا حاجت روا ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی سے ایک دکھ ہٹائے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے قیامت کے دن اس سے ایک دکھ دور کرے گا۔ جو شخص دنیا میں مسلمان کی ستر پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر بروزِ قیامت پردہ ڈالے گا۔[1]

اہل مدینہ کے باہمی حقوق و فرائض کی فہرست :

ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اہلِ مدینہ کے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کی ایک مختصر مگر بنیادی فہرست مرتب فرمائی تھی۔ اس میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ ان تعلقات سے متعلق حسب ذیل فرائض عاید کئے گئے تھے۔

۱۔ مسلمانوں کے قلبی رفیق صرف مسلمان ہوں گے۔

۲۔ ایمان والوں کے دوست اور دشمن مشترک ہوں گے۔ کوئی مسلمان اسلام کے دشمن سے تنہا مصالحت نہیں کرسکتا۔

۳۔ اہلِ ایمان قرض تلے دبے ہوئے بھائیوں کی مدد کریں گے۔

۴۔ اگر مسلمانوں میں سے کوئی ظلم، سرکشی یا بغاوت کا مرتکب ہوگا تو سب پرہیزگار مسلمان اس کے خلاف ایک ہو کر اٹھیں گے۔

۲۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر :

مسلمان بھائیوں سے خیر خواہی، دینوی معاملات اور زندگی کے دکھ سکھ تک ہی محدود نہیں ہوتی، آخرت کی تیاری میں بھی اس کی مدد کرنی چاہیئے۔ اسلام نیک ہونے اور بنانے کا حکم دیتا ہے۔ برائی کی روک تھام اور نیکی کی اشاعت نہ ہو تو قوم اپنی قوت کھو بیٹھتی ہے۔ قرآن حکیم نے ہر مسلمان کے لئے حسب استطاعت امر بالمعروف یعنی اچھائی کی تلقین اور نہی عن المنکر یعنی برائی سے منع کرنا ایک ضروری فریضہ قرار دیا ہے۔

احادیث نبویہ :

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ایک دن فرمایا، کیا تمہیں اس چیز کا پتہ نہ دوں جس کا درجہ

---

[1] ترمذی ۔ ابواب صفۃ القیامۃ ، احیاء العلوم جزء ۲ حقوق المسلم

صیام وصلوٰۃ اور صدقہ سے افضل ہے؟ صحابہ رضؓ نے عرض کیا۔ کیوں نہیں؟ فرمایا، کشیدہ تعلقات کی درستی۔ [1]

انسان خود مدد کرنے سے قاصر ہو تو کسی اور ہی کو اس کی سفارش کر دے۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ صدقہ زبان سے افضل کوئی صدقہ نہیں۔ عرض کیا گیا، وہ کیسے؟ فرمایا، ایسی سفارش جس سے تو خون ریزی روکے، ایک کو دوسرے سے فائدہ دلوائے اور کسی سے ناپسندیدہ چیز کو دور رکھے۔ [2]

زبانی مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مسلمان کی بھلائی کے لئے دعا مانگی جائے اس دعا میں خلوص ہوتا ہے، اس لئے قبول ہو جاتی ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی دعا اتنی سرعت سے قبول نہیں ہوتی تھی کہ غائبانہ دعا۔

کسی مسلمان میں کوئی عیب نظر آئے تو اسے نہایت احتیاط سے خلوت میں آگاہ کر دیا جائے کہ اُسے دور کرے۔ کسی مسلمان کو روا نہیں کہ اسے اس کی خامی سے خبردار کیا جائے تو بُرا مانے۔

۲ - اپنی ذات پر ترجیح:

اسے ایثار بھی کہتے ہیں۔ یہ تعاون اور قربانی کی روح ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر ۵۹: ۹)

ترجمہ: اور وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی میں ہوں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک صحابیؓ کو بھیڑ کی سری تحفہ میں پیش کی گئی۔ انہوں نے کہا، میرا فلاں بھائی مجھ سے زیادہ حاجت مند ہے، اسے بھجوا دی۔ اس شخص نے آگے دوسرے کے لئے روانہ کر دی۔ اور سری سات آدمیوں سے ہو کر پہلے کے پاس لوٹ آئی۔

درخشاں مثالیں:

ایثار کی ایک درخشاں مثال مواخات کی ہے۔ مسلمانوں میں باہمی ایثار و محبت کی روح پیدا کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان میں وقتاً فوقتاً مواخات یعنی بھائی چارہ کرا دیتے تھے۔

یعنی مسلمانوں سے ارشاد فرما دیتے کہ تم آپس میں بھائی ہو۔ ان میں حقیقی بھائیوں کی طرح حقوق اور واجبات قائم ہو جاتے تھے۔

---

[1] ترمذی [2] احیاء العلوم حقوق الاخوۃ۔

انصار نے اپنے مواخاتی بھائیوں کے ساتھ نہایت ایثار کا سلوک کیا اور ان کا دل وجان سے ہاتھ بٹایا۔ اس کی وضاحت ایک ہی مثال سے ہو جاتی ہے۔ ایک انصاری سعدؓ بن الربیع نامی تھے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف ان کے بھائی قرار دیئے گئے۔ حضرت سعدؓ انہیں گھر لے گئے اور اپنا کل اثاثہ نصف نصف بانٹ دینا چاہا۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰنؓ نے لینے سے انکار کر دیا۔

اسلامی مواخات کو حقیقی اخوت پر بھی غلبہ حاصل تھا۔ آغاز میں مواخات کی ایک شرط یہ تھی کہ مواخاتی بھائی کے انتقال کے بعد بجائے حقیقی کے مواخاتی بھائی وارث ٹھہرتا تھا۔ تھوڑی مدت بعد جب مہاجرین اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے اور انہیں مزید اعانت کی حاجت نہ رہی تو وراثت کا یہ قاعدہ منسوخ ہو گیا۔

۳۔ مسلمان بھائی کے حق میں اچھا بولنا:

کوئی مسلمان دیکھے کہ کسی مسلمان کے خلاف ناحق تہمت تراشی ہو رہی ہے تو اس کا واجبی جواب دے۔ آبرو انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ مسلمان کی آبرو کو ناحق تیروں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی عزت کی حفاظت کی اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو گی۔

۴۔ ہر حال میں جماعت سے وابستگی:

سچے مسلمان کے دل میں یہ احساس خوب جاگزیں ہوتا ہے کہ وہ جماعت کا ایک مستقل رکن ہے اس کی زندگی جماعت کی زندگی سے جدا نہیں۔ وہ ملت کے نفع وضرر اور مسرت والم میں برابر کا ساجھی ہے۔ اسے کسی وقت جماعت کی بہبود اور ترقی سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ قوم کسی زوال کی زد میں آ بھی جائے تو وہ اس سے مایوس ہو کر اوروں کی طرف راغب نہ ہو بلکہ اس کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے ؎

ملّت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ (اقبال)

جماعتی خوشحالی اور آبرومندی کا یہی راز ہے کہ اس کے افراد آپس میں وابستہ رہیں، کوئی شخص قوم سے دل برداشتہ ہو کر اس کا ساتھ نہ چھوڑے۔ حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے۔ وہ قوم کی ہٹ دھرمی سے بددل ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کئے بغیر شہر سے نکل گئے۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت یونسؑ کا یہ اقدام پسند نہ آیا اور تنبیہ کے لئے انہیں مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیا۔ حالانکہ حضرت یونس علیہ السلام کا ناقابلِ اصلاح قوم سے الگ ہو جانا کوئی گناہ کی بات نہ تھی۔ انہوں نے اپنے

خیال میں ایک ٹھیک فیصلہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے درس دیا کہ اپنی قوم کا ساتھ کسی حال میں نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ تین چیزوں پر مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا؛ اطاعتِ الٰہی کا اخلاص اولوالامر سے خلوص اور جماعت سے وابستگی [1]

آپؐ کا ایک اور ارشاد ہے کہ جو اپنی جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اور اسی حالت پر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا [2] یعنی کافروں کی سی موت پائی۔

---

[1] الترغیب والترہیب کتاب العلم باب سماع الحدیث۔

[2] بخاری کتاب الفتن۔

تبلیغ

مفہوم : تبلیغ کے لغوی معنی ہیں، انتہا یا آخری ٹھکانے تک پہنچانا۔ محاورہ میں کہتے ہیں بَلَغَ مِنِّیْ کَلَامُکَ یعنی تیرے کلام نے مجھ پر انتہائی اثر کیا۔ اسی طرح بَالَغَ فِیہِ الْمَرَضُ کے معنی ہیں، اس کا مرض انتہائی شدت کو پہنچا۔

دینی اصطلاح میں تبلیغ سے مُراد ہے، اللہ تعالیٰ کا پیغام وضاحت کے ساتھ بندوں تک پہنچانا۔

قرآنِ حکیم میں اسے بلاغ بھی کہا گیا ہے۔ بلاغ اور تبلیغ کے ایک معنی ہیں۔

قرآن حکیم میں بلاغِ مُبین کی ترکیب بھی آتی ہے۔ بلاغ اور بلاغِ مُبین بہت حد تک ہم معنی ہیں لیکن بلاغِ مُبین نبی سے مختص ہے کیونکہ وہی اس کا پورا حق ادا کر سکتا ہے۔

قرآن حکیم میں تبلیغ کے لئے ابلاغ کا لفظ بھی آیا ہے۔ (الاعراف)

تبلیغ غیر مسلم کو بھی ہو سکتی ہے اور مسلم کو بھی۔ جہاں غیر مسلم کے کانوں میں اسلام کا پیغام پہنچانا ضروری ہے وہاں مسلم کو بھی برائیوں سے پرہیز کرنے اور نیکی کی طرف زیادہ سے زیادہ میلان بڑھانے کے لئے تبلیغ کی ضرورت رہتی ہے۔

اہمیّت :

۱۔ دُنیا کو اسلام کی ضرورت ہے :

اسلام مادی فلاح کے ساتھ ساتھ روحانی فلاح کا بھی ضامن ہے، اس لئے ہر عہد میں اسلام کی تبلیغ کی ضرورت رہی ہے۔ آج جبکہ دنیا روحانی تنزل اور مادی پریشانیوں کے پنجے میں گرفتار ہے۔ اس بات کی شدید تر ضرورت ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ موجودہ دنیا کو جس قدر روگ لگے ہوئے ہیں۔ ان کی شفا قرآنِ حکیم اور سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں ودیعت ہے۔ اس ودیعت کے امانت داروں کو امانت کا حق ادا کرنا چاہیئے۔

آج دنیا بھر کے سربراہ عالمی برادری کے طلب گار ہیں اور پکار رہے ہیں کہ جب تک عالمگیر پیمانہ پر ایک اخوت قائم نہیں ہوتی ہمارے دکھوں کا علاج نہ ہو سکے گا۔ اب یہ ثابت کرنا مسلمان کا کام ہے کہ اسلام نے اس برادری کو چودہ صدی پہلے ہی قائم کر کے دکھا دیا ہے۔ یہ وہ برادری ہے جس میں کالے اور گورے، شرقی اور غربی اور امیر و غریب سب کے لئے برابر کی گنجائش ہے۔

۲۔ گوشہ نشین کی نیکی بے کار ہے:

تبلیغِ اسلام کی ضرورت اسی لئے نہیں کہ اس میں دنیا کے اور لوگوں کا فائدہ ہے بلکہ اس لئے بھی ہے کہ اس میں ہر مسلمان کی اپنی بہتری ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے گھر میں صفائی کا خوب اہتمام کرے اور پورے محلہ میں عفونت پھیلی ہو تو وہ کیونکر بدبو اور وبائی جراثیم سے محفوظ رہ سکے گا۔ اردگرد کی انسانیت برائیوں میں لتھڑ گئی ہو تو اس سے نیک انسان بھی ضرر اٹھائیں گے۔ اس لئے جو آدمی نیکی سے پورا مستفیض ہونا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ برائی کا سدِباب کرے اور نیکی پھیلائے۔

۳۔ تبلیغ کے بغیر انسان خسارے میں ہے:

سورۃ العصر میں یہ حقیقت روشن کی گئی ہے کہ انسانی برادری خسارہ مند رہتی ہے سوائے ان کے جو حسب ذیل چار امور پر کاربند ہوں:

۱۔ صاحبِ ایمان ہوں۔
۲۔ صاحبِ عمل ہوں۔
۳۔ وہ ایک دوسرے کو حق کی تلقین کریں۔
۴۔ ایک دوسرے کو ثابت قدمی کی تلقین کریں۔

۴۔ جمود سے نیکی ختم ہو جاتی ہے:

اس صورت سے یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ نیکی ٹھہراؤ کا نام نہیں۔ یہ حرکتِ جاودانہ ہے۔ اس میں پھیلاؤ اور وسعت پیدا نہ کی جائے تو سکڑ جاتی ہے اور جلد یا بدیر ختم ہو جاتی ہے۔

اسلام کی نگاہ میں کاملاً اور حقیقتاً نیک وہ ہے جو اوروں کو بھی نیک بنانے کی تڑپ رکھتا ہو۔ جو نیکی اپنے اندر گم ہو اور اس کی روشنی اردگرد نہ پھیل رہی ہو۔ عین ممکن ہے وہ محض فریب ہو۔ مقید یا لنگڑی لولی نیکی جو انسانیت کی خدمت سے قاصر ہو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

۵۔ قرآن کا حکم: امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

نیکی کی اشاعت سے پہلے ضروری ہے کہ اسے بدی کی یورشوں سے محفوظ کر دیا جائے۔ جب تک برائی کا انسداد نہ ہو نیکی کی اشاعت مشکل ہے۔ اس لئے اسلام میں برائی کو روکنے کا حکم اور نیکی کو رائج کرنے کا حکم ساتھ ساتھ ہیں۔ اسے اَلْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّہْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ نیکی کی ہدایت اور برائی سے ممانعت کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے تبلیغ کے دو جزو ہیں: (۱) نیکی کی اشاعت اور (۲) برائی سے منع کرنا۔ ہر مسلمان اسلام کا مبلغ ہوتا ہے۔ اس کو مقدور بھر اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔ جب تک قوم میں

برائی کو روکنے والے افراد ہوتے ہیں۔ اس میں پنپنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ ملت میں تبلیغ و ارشاد اور تعلیم و تزکیہ کے فرائض انجام دینے والے گروہ کا وجود ضروری ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥

(آلِ عمران ۱۰۴)

ترجمہ: اور چاہیے کہ تم میں ایک جماعت ہو (جو) بھلائی کی طرف بلاتے ہوں اور نیکی کی ہدایت کرتے ہوں اور برائی سے منع کرتے ہوں اور وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔

۶۔ حدیث نبوی:

ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی امت کو فرمان ہے کہ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تمہیں اچھائی کا حکم دینا ہے اور برائی سے روکنا ہے ورنہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنے ہاں سے عذاب بھیج دے۔ پھر تم اسے پکارو گے اور تمہیں کوئی جواب نہ ملے گا۔[1]

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً یعنی مجھ سے سن کر آگے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی ہو۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاد کام رکھے جو میری حدیث کو سن کر اشاعت کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ میرے خطبہ کا سننے والا اسے غیر موجود آدمیوں تک پہنچائے۔

۷۔ ملت کی ذمہ داری اجتماعی ہے:

ملت کی ذمہ داریاں اجتماعی ہیں۔ ہم فقط اپنی اصلاح کر کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ فرد کی ہستی ملت سے وابستہ ہے۔ وہ اس کے خیر و شر میں حصہ دار ہے۔

۸۔ اخلاق کی تاثیر متعدی ہوتی ہے:

اخلاق میں متعدی تاثیر ہوتی ہے۔ اچھے اخلاق کو دیکھ کر دل میں نیکی کا رجحان پیدا ہوتا ہے اور برے اخلاق والوں کے ہاتھوں اور لوگ بھی برائیوں میں پڑ سکتے ہیں۔ اگر برائی کا مقابلہ قوت اور استقامت

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ ترمذی۔

سے نہ کیا جائے تو اس کا دائرہ نہایت تیزی سے پھیلتا ہے۔ بنو اسرائیل کی تاریخ کا ایک ورق یہ بھی ہے کہ جب ان میں برائی نے سر اٹھایا تو بھلائی کی تبلیغ کرنے والے آہستہ آہستہ اپنے فرض سے غافل ہو گئے۔ یہاں تک کہ علماء بھی اہلِ شر کے ہم نشین ہو گئے۔ نتیجہ یہ کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔

۹۔ برائی کی تاثیر بھی متعدی ہوتی ہے:

برائی کے وبائی جراثیم کو گردوپیش سے فنا کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جس قدر ہو سکے کوشش کرنی چاہیئے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے جو آدمی برائی دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے پھیر دے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو اپنی زبان سے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اپنے دل سے (اسے برا جانے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

۱۰۔ جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حتی الوسع جنگ سے گریز فرماتے تھے۔ جوابی کارروائی پر مجبور ہو جاتے تو آخر دم تک جنگ کو ٹالنے کی کوشش فرماتے اور دشمن کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ جنگِ خیبر میں یہود کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے روانہ ہوئے تو جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا، جناب! کیا اس وقت تک تلوار چلاؤں کہ وہ ہماری راہ پر آ جائیں۔ حضورؐ نے فرمایا، علیؓ! وقار و سکون کے ساتھ جا۔ جب ان کے روبرو ہو تو انہیں اسلام کی دعوت دے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق بتا۔ اللہ کی قسم! شخصِ واحد کا تیرے ہاتھ پر اسلام لانا سرخ اونٹوں سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔

جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تبلیغ بہت عزیز تھی۔ تبلیغ کی خاطر آپؐ نے بڑے بڑے دکھ اٹھائے لیکن ہمت نہ ہاری۔

۱۱۔ اُمّتِ مُسلِمہ کے ظہور کا مقصد ہی تبلیغ ہے:

قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ ط (۳ : ۱۰۴)

ترجمہ: تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نمودار کی گئی۔ تم نیکی کی ہدایت دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کے ظہور کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ برائی کو

روکے اور بھلائی کی تبلیغ کرے۔

تبلیغ کے طریقے :

تبلیغ کے دو طریقے ہیں :

(۱) زبانی ہدایت (۲) اخلاقی کشش

زبانی ہدایت :

زبانی تبلیغ صبر و تحمل اور حسنِ کلام سے ہونی چاہیئے جس کو مخاطب کیا جائے۔ ضروری نہیں وہ ہدایت کو فوراً قبول کرے۔ ہر آدمی کو اپنے خیالات اور اعمال سہانے نظر آتے ہیں۔ بارہا وہ تبلیغ کو اپنے عقاید اور نظریات میں دخل اندازی سمجھ کر بھڑک اٹھتا ہے۔ اس لئے انتہائی سکون کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ زبان سے کوئی ایسا کلمہ ادا نہ ہو جائے جو فساد پیدا کرے۔ قرآنِ حکیم نے اس بات سے بھی روکا ہے کہ مشرکین کے معبودوں کا ذکر ناشائستہ الفاظ میں کیا جائے، ورنہ مشرکین اور بگڑیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں ناشائستہ باتیں کریں گے۔

سُورَۃُ النَّحل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خطاب ہے :

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ (۱۶:۱۲۵)

یعنی (اے نبی!) آپؐ (لوگوں کو) اپنے رب کے رستہ کی طرف حکمت اور اچھے وعظ و نصیحت کے ساتھ دعوت دیں اور احسن بات کے ساتھ ان سے مباحثہ کریں۔

اس آیت میں تبلیغ کے لئے تین چیزوں کی ہدایت دی گئی ہے، یعنی حکمت، موعظۂ حسنہ اور احسن طریقہ سے مباحثہ۔

(۱) حکمت :

حکمت کے معنی ہیں وہ علم جس کے ہمراہ عمل بھی ہو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حکمت کے پیکر تھے۔ بے شمار لوگ آپؐ کے حُسنِ عمل کی تاثیر سے ایمان لائے۔ (اس موضوع پر مزید بحث آگے اخلاقی کشش کے عنوان سے ہوگی)۔

(۲) مَوعظۂ حسنہ :

اس سے مراد ہے عمدہ طریقے سے بات سمجھانا۔ اچھے عمل کے ہمراہ اچھے کلام میں بھی کشش ہوتی ہے۔ آدمی تبلیغ کرے تو الفاظ شیریں اور انداز دل نشین ہو۔

۳۔ مجادلۂ احسن :

کسی کی دلیل کے مقابلہ پر دلیل لانے کو مجادلہ کہتے ہیں۔ فریقِ مخالف اعتراض کرے، تو اس کا جواب صبر و تحمل، رواداری اور فراخدلی کے ساتھ اچھی دلیل اور منطقی پیرایہ میں دے۔ اگر وہ جہالت پر اتر آئے تو جب بھی نرمی اور دل جوئی سے قائل کرنے کی کوشش کرے۔ دلیل میں صداقت ہونی چاہیئے اور اس سے مقصود حق کا ثابت کرنا ہو نہ کہ فریقِ مخالف کا منہ بند کرکے شیخی بگھارنا۔ ایسی مناظرہ بازی سے تبلیغ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

کسی فرد یا گروہ کو تبلیغ کرتے ہوئے یہ اچھی طرح دیکھ لینا چاہیئے کہ کیا اسے دینِ اسلام کی کسی بات سے پہلے ہی اتفاق ہے یا نہیں۔ اگر کوئی ایسی صورت ہو تو پہل اس مشترکہ بات سے کرے تاکہ سننے والے کو مبلغ سے شاید کچھ موافقت ہو جائے اور اسلام کی صدا توجہ سے سنے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اختلافی امور کی طرف آئے۔

بعض اہلِ کتاب توحید کا ادّعا رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ارشاد فرمایا ہے کہ انہیں توحید کے کلمۂ مشترکہ کی طرف دعوت دیں کیونکہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر اس بنیاد پر ان سے فرمائیں کہ :

(۱) آؤ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کریں۔

(۲) اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

(۳) اللہ تعالےٰ ہی کو رب مانیں، کسی بندے کو رب کا درجہ نہ دیں۔

اخلاقی کشش :

اسی شخص کا کلام دل پر اثر کرتا ہے جو اپنے کہے پر عمل پیرا بھی ہو۔ نرے گفتار کے غازی کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ مبلغ کا کلام ہزار شیریں ہو۔ لیکن اس کا اخلاق دل آویز نہ ہو تو رائیگاں جاتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قرآنِ حکیم کا جو پیغام سنایا اور خود جس بات کی تلقین فرمائی اس پر مؤثر عمل بھی کرکے دکھایا۔ آپؐ مجسم قرآن تھے۔ آپؐ نے اپنی حیاتِ مبارک کا ایک ایک گوشہ نگاہِ عالم کے سامنے کھول کر رکھ دیا تاکہ کہنے والا یہ نہ کہے کہ زندگی کا فلاں گوشہ نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ اس میں (نعوذ باللہ) شاید کوئی خامی یا عیب ہو۔ بڑے بڑے اعداء بھی آپؐ کے اخلاقی اعجاز کے سامنے مہر بہ لب رہ جاتے تھے۔ ابوجہل ایسا کینہ پرور دشمن بھی آپؐ کے اخلاقی کمال کا معترف تھا۔

اشاعتِ اسلام کی تاریخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تبلیغ کا کارنامہ زبانی وعظ و پند سے زیادہ

عملی تاثیر کا مرہون تھا۔ ملّتِ اسلامیہ کا کردار رحمتِ الٰہی کی جھلک دکھاتا تھا۔ فاتح افواج جہاں جہاں پہنچیں وہاں کے رہنے والے ان کے حسنِ اخلاق سے مسحور ہو کر اسلام کے حلقہ بہ گوش ہوتے گئے۔ یہ حالت صدیوں رہی۔ خلافتِ راشدہ کے ایام پر نگاہ ڈالئے۔ اموی دور کا تصور آنکھوں کے سامنے لایئے اور غور کیجئے کہ وہ کیا مبارک دَور تھا۔ جب بحرِ اوقیانوس سے لے کر انڈونیشیا تک کا ایک عالم اسلامی عساکر اور افراد کے دل نواز کردار کا فریفتہ ہو کر دینِ اسلام کا جان و دل سے پیرو ہو گیا۔ آج بھی اسی حسنِ عمل کی ضرورت ہے۔

یوں تو ہر مسلمان کو جامع فضائل ہونا چاہیئے لیکن غیر مسلموں کے مقابل اس میں خصوصیت سے صبر و تحمل، عفو اور دل جوئی ایسے خصائص لازم ہیں تاکہ وہ اس کی سیرت کے اسیر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ سُورۃ حٰمٓ السَّجْدَۃ (آیت ۳۴) میں ارشاد ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝

ترجمہ: اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی تو ایسی بات سے جواب دے جو احسن ہے پھر اچانک وہ کہ تیرے اور اس کے درمیان عداوت تھی یوں ہو جائے گا جیسے پُرتپاک قلبی دوست۔

قرآنِ حکیم کی یہ آیات مسلم و غیر مسلم سب کے بارے میں ہیں۔ سُورۃ التوبہ (آیت ۶) میں اس مشرک کے بارے میں جو پناہ کا سائل ہو کر آئے حسبِ ذیل ہدایات آئی ہیں:

۱۔ اسے پناہ دو۔

۲۔ اسے قرآن سناؤ۔

۳۔ اسے اس کی پناہ کی جگہ پہنچا دو۔

حضرت علیؓ کی انصاف پروری کو دیکھ کر ایک یہودی کے اسلام لانے کا واقعہ گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔ ایران کا ایک آتش پرست گورنر حضرت عمرؓ کی سادگی دیکھ کر اسلام لے آیا تھا۔ اسلام کی تاریخ ایسے واقعات سے لبریز ہے۔ اگر اہلِ اسلام میں اخلاق کا فقدان ہو تو وہ لوگ جو قرآنِ حکیم اور اسلامی اصول سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف رخ کرتے ہیں اپنے قدم روک لیں گے۔ گویا وہ مسلمان جو اخلاق سے عاری ہوں تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ سُورۃ النحل (آیت ۹۴) میں

اس طرف واضح اشارہ ہے کہ جو لوگ قرار دستم میں نیک نیت نہیں ہوتے ان کی ایسی حرکات سے قبولِ اسلام میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا بڑا عذاب ہے۔

قرآنِ حکیم نے نومسلموں کی تالیفِ قلب یعنی دلجوئی کی بڑی تاکید کی ہے اور بیت المال سے ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لحاظ سے ان نومسلموں کو مُؤَلَّفَۃُ الْقُلُوْبِ کہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جن کے دلوں میں الفت پیدا کی گئی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان پر بڑی نوازش فرماتے تھے۔ حضرت صفوانؓ بن اُمیہ حالتِ شرک میں تھے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شدید دشمن تھے۔ ان کا بیان ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے حنین کی غنیمت سے مال دیا اس کے بعد بھی بخشش فرماتے رہے۔ آپؐ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو گئے۔

تبدیلِ مذہب میں جبر نہیں

قرآنِ حکیم کا اعلان ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲:۲۵۶) یعنی دین میں کوئی جبر نہیں

مسلمان کا فرض صرف اس قدر ہے کہ وہ اسلام کی دعوت کو بہ طریقِ احسن دنیا کے سامنے پیش کر دے۔ اس کے باوجود اگر کوئی روگردانی کرے تو اسلام شمشیر کے زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ سُوْرَۃُ النَّحل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ارشاد ہے:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

ترجمہ: پھر اگر یہ (کافر لوگ) پلٹ جائیں تو آپؐ کے ذمے صرف بلاغ مبین ہے۔

اسلام ہمیشہ تبلیغ سے پھیلا ہے۔ اس سلسلہ میں علماء اور صوفیۂ کرام نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ تاتار نے تقریباً آدھی اسلامی دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس دین کے نام لیوا ہو گئے۔ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان بادشاہوں کا دارالحکومت تھا وہاں مسلمان اقلیت میں رہے لیکن چین وغیرہ کے علاقے جہاں کبھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی وہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان اب بھی موجود ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کا فروغ اس کی حقانیت کے سبب تھا۔ اب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ دنیا کے سامنے اسلام کی صداقت کا ثبوت قولاً اور عملاً پیش کیا جائے۔

جہاد

جہاد کا مادہ جُہْد ہے جس کے معنی ہیں :

(۱) کوشش (۲) طاقت

جہاد کے معنی ہیں :

۱ ۔ کسی کے مقابلہ پر کوشش کرنا ۔

۲ ۔ دشمن سے جنگ کرنا ۔

۳ ۔ اپنی طاقت اور گنجائش کے بموجب قولاً اور عملاً بھرپور کوشش کرنا ۔

جہاد کے ہم معنی ایک اور لفظ مجاہدہ ہے لیکن یہ لفظ عموماً اپنے نفس کے خلاف جہاد کے معنی میں آتا ہے۔ حدیث میں مجاہدہ کو جہادِ اکبر اور جہاد کو جہادِ اصغر بھی کہا گیا ہے۔

مفہوم :

جہاد میں معنی و مفہوم کی ایک وسیع دنیا پوشیدہ ہے ۔ یہ مسلمان کی ساری زندگی پر حاوی ہے ۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کی رضا جو[ئی] کے لئے زندگی کے کسی بھی شعبے میں اسلامی تعلیمات کے مطابق جد و جہد کرے تو وہ جہاد ہے ۔ جہاد فکری، قولی، عملی، مالی، جانی ہر لحاظ سے ہو سکتا ہے۔ نفسیاتی خواہشات کو کنٹرول کرنا بھی جہاد ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور مخلوقِ خدا کی خدمت کے جذبے کے تحت علم و ہنر سیکھنا بھی جہاد ہے ۔

جہاد کی صورتیں یا اقسام :

جہاد کی صورتیں یا اقسام مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ اپنے نفس کے خلاف جہاد :

اپنے نفس کے خلاف جہاد سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو کنٹرول کرے اور ان کو اسلامی تعلیمات کے تحت لائے، اپنے دل کو آلائشوں سے پاک کرے۔ اسے تزکیۂ نفس یا تزکیۂ باطن بھی کہتے ہیں ۔ تمام انبیائے کرام کی طرح ہما[ر]ے نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرضِ منصبی بھی تعلیم اور تزکیہ تھا۔ آپؐ نے اپنے نفس کے خلاف جہاد کو جہادِ اکبر قرار دیا ہے کیونکہ دشمن کے خلاف لڑنا آسان ہے اور اپنے نفس [کے خلاف لڑنا بہت] مشکل کام ہے۔

۲۔ فکری جہاد :

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خدمتِ خلق کی غرض سے علم و ہنر سیکھے اور پھر اس علم و ہنر اور عقل و دانش کو خدمت خلق اور دین کی سربلندی کے لئے استعمال کرے۔ چنانچہ جو علماء، سائنس دان اور پیشہ ور ماہرین علم و مہارت کو اس جذبے سے حاصل کرتے اور اس مقصد کے لئے کام میں لاتے ہیں وہ بھی جہاد کرتے ہیں۔

۳۔ قولی و قلمی جہاد :

اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی زبان و قلم کی صلاحیتوں کو نیکی کے فروغ و اشاعت اور برائی کی بیخ کنی کے لئے استعمال کیا جائے۔ حدیث نبوی ہے کہ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہاد ہے۔

۴۔ مالی جہاد :

مالی جہاد سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے اس کی راہ میں اپنے مال کو خرچ کرنا۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دین کی سربلندی کے لئے، ملک و قوم کے دفاع کے لئے مال کو خرچ کیا جائے۔ دفاع کے لئے اسلحہ اور دوسرے سامان جنگ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کو فراہم کرنے کے لئے مال چاہیئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسی لئے جانی جہاد سے قبل مالی جہاد کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

جَاهِدُوا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ "اپنے اموال اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو"

۵۔ جانی جہاد :

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر، حق کی سربلندی اور اس کے دفاع کے لئے میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے کے لئے سینہ سپر ہو جائے۔ یہ جہاد کی سب سے اعلیٰ صورت ہے اور اصطلاحاً جہاد سے مراد یہی ہے۔ قرآنِ حکیم اور احادیث نبویہ میں اس کی بہت تاکید آئی ہے۔ جیسا کہ آگے جہاد کی فضیلت و اہمیت کے تحت بیان کیا جائے گا۔

جہاد اور حرب (جنگ) میں فرق :

جہاد اور عام جنگ میں بہت فرق ہے۔ جنگ ایک مطلق لفظ ہے۔ اس پر اگر نیکی، انسانیت اور شرافت کی پابندیاں لگا دی جائیں تو اسے جہاد کہا جائے گا۔ اسلام سے قبل عرب میں جنگ کے لئے حرب کا لفظ مستعمل تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لفظ کو کراہت کی نگاہ سے دیکھا، کیونکہ اس کے ساتھ عرب کی مدتِ مدید کی سنگ دلانہ اور وحشیانہ روایات وابستہ تھیں۔ آپؐ نے

عربوں کو جہاد کے لفظ سے روشناس کرایا۔ جہاد وہ جنگ ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں نیکی کی حفاظت کے لئے انتہائی مجبوری کی حالت میں لڑی جائے۔ اگر اس سے تجاوز ہو اور ظلم کی راہ دی جائے تو یہ جہاد نہ رہے گا، بلکہ اسے حرب کہیں گے۔ اسلام سے قبل عربوں کی خوں آشام طبیعت کو لفظِ حرب سے اتنی محبت تھی کہ بعض افراد کا نام حرب تھا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نام رکھنے سے منع فرمایا۔ حرب کے لفظ کو عربی لغت سے مٹانا مشکل تھا۔ اسے باقی رہنے دیا گیا۔ بعد میں اس کو اسلامی جنگوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ مگر اصطلاحی لفظ بہر حال جہاد ہے۔

ضرورت و اہمیت:

۱۔ زندگی برقرار رکھنے کے لئے جہاد ضروری ہے:

یہ زندگی تنازع للبقاء کی ہے یعنی باقی رہنے کے لئے برسرِ مقابلہ رہنا ہے۔ اس لئے زندگی میں جہاد سے کنارہ کشی ناممکن ہے۔ کائنات کا یہ کارخانہ تضاد اور مسابقت کے اصول پر چل رہا ہے۔ عناصر اور طبائع میں ازل سے مقابلہ جاری ہے۔ تاریکی اور روشنی، نرمی اور سختی، درستی اور نادرستی، صحت اور مرض، نیکی اور بدی کی جنگ روزِ آفرینش سے بھڑکتی چلی آئی ہے۔ اس کی آنچ کبھی ٹھنڈی نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔

۲۔ حق و باطل کی جنگ ازل سے جاری ہے:

حق اور باطل دو متقابل قوتیں ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کو دبانے کی کوشش کی ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی (اقبال)

حق و باطل کی جنگ میں حق کو یہ امتیاز رہا ہے کہ اس نے ہمیشہ عافیت کو بدامنی پر ترجیح دی ہے اگرچہ نیکی بجائے خود بدی کی حریف ہے لیکن اس کی چال راستی، خوش اسلوبی اور امن پسندی کی ہے۔ ادھر بدی کی روح یہ ہے کہ دوسروں کو ستایا جائے اور جو چیز اس کے برے مقاصد کی راہ میں آئے اسے آنکھیں بند کر کے مٹا دیا جائے۔ اس لئے وہ ہمیشہ نیکی پر حملہ آور ہوتی ہے۔ ادھر نیکی بھی ایک قوت ہے۔ ضعف یا عدمِ وجود کا نام نہیں۔ اس لئے زور دکھا کر سامنے آتی ہے۔ اور تصادم لامحالہ رونما ہو جاتا ہے۔

ہر قوت کے لئے ایک نہ ایک مخالف قوت اور ہر قوم کے لئے کوئی نہ کوئی حریف قوم ہوتی ہے۔ مسلمان اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ انہیں بھی روزِ اوّل سے بدخواہوں اور بدکیشوں سے واسطہ

رہا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انہیں ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس رہنے کا حکم دیا ہے۔

۳۔ قوت و شوکت بہترین دفاع ہے:

دشمن کی دشمنی ضرور نہیں کہ کھلے بندوں ہی ہو۔ دشمن دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی ظاہر اور پوشیدہ[1] جن اعداء کی عداوت ظاہر ہو ان کے خلاف تو غفلت کی تدابیر انسان کرتے ہی ہیں۔ لیکن ان دشمنوں سے بھی حذر چاہیئے جن کی عداوت ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے۔ وہ کسی وقت بھی گھات سے نکل کر دھاوا بول سکتے ہیں۔ ان کے اچانک حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ حسب استطاعت قوت فراہم کی جائے، سرحدوں کو مضبوط رکھا جائے اور قوت و شوکت کی وہ نمود ہو کہ دشمن کو قدم بڑھانے کا حوصلہ ہی نہ پڑے[2]

۴۔ قیام امن کے لئے جہاد ضروری ہے: دنیا میں امن کے قیام کے لئے جہاد از بس ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲:۲۵۱)

ترجمہ: اور اگر اللہ کا بعض (لوگوں) کو بعضوں کے ذریعے ہٹا دینا نہ ہوتا تو زمین میں بگاڑ پیدا ہو جاتا۔ لیکن اللہ جہانوں پر فضل کرنے والا ہے۔

۵۔ جہاد فرض کفایہ ہے:

اگر ضرورت پڑے تو ملت کے لئے جہاد کرنا فرض کفایہ ہے، یعنی اگر ان میں سے ضرورت کے مطابق کچھ لوگ جہاد نہ کریں گے تو سب گنہگار ہو جائیں گے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۲:۲۱۶)

تم پر قتال (جہاد) فرض کیا گیا ہے، اگرچہ وہ تمہیں ناپسند ہے اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (الحج ۲۲:۷۸)

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔

---

[1] دیکھو سورۃ الانفال آیت ۶۰ — [2] دیکھو سورۃ الانفال آیت ۶۰۔

جہاد کی اجازت کن حالات میں ہے؟

جہاد کی بعض صورتیں، یعنی اپنے نفس کے خلاف جہاد، قولی و قلمی جہاد، فکری جہاد اور مالی جہاد تو ہر وقت فرض ہیں لیکن اصل جہاد یعنی جانی جہاد یا قتال کی اجازت بعض مخصوص حالات میں ہوتی ہے۔ اسلام جنگجوئی کا علمبردار (MILITANT) نہیں ہے۔ یہ تو صلح و آشتی کا پیامبر ہے۔ قرآنِ حکیم کی تعلیم ہے کہ کوئی لاکھ بدخواہ اور زحمت رساں ہو اس سے حتی الوسع درگزر کیا جائے۔ اس کی مخالفتوں سے چشم پوشی کی جائے اور اس کی برائی کو حسنِ سلوک سے شرمسار کیا جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (المائدۃ ۵ : ۱۳)

ترجمہ: پس انہیں معاف کر دو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو۔ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

صلح دعوتِ اسلام کا دیباچہ ہے، اس لئے مسلمان کو صلح کی فضا پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔ لیکن دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صلح و آشتی کے دشمن ہوتے ہیں، فتنہ و فساد پیدا کرنے میں اُن کو لذت آتی ہے، وہ شیطنت سے کسی طور بھی باز نہیں آتے۔ جب ان کی شرانگیزی حد سے بڑھنے لگے تو ان کا استیصال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل صورتوں میں جہاد ضروری ہو جاتا ہے:

۱۔ دشمن اسلامی ملک پر حملہ آور ہو:

اگر دشمن اسلامی ملک پر حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے دفاع کے لئے جہاد کریں۔ ایسی صورت میں دنیا کی ہر قوم اپنا دفاع کرتی ہے اور دفاع نہ کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا جائے، پھر دشمن کی مرضی ہے کہ وہ ان کے جان، مال اور عزت و آبرو کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔ لہٰذا ایسی صورت میں مسلمانوں پر جہاد کو فرض کر دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ (۲ : ۱۹۰)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (الحج، ۲۲ : ۳۹)

ترجمہ: اجازت دے دی گئی ہے ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔

۲۔ دشمن اہلِ اسلام کو ظلم کا نشانہ بنائے :

مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لئے جہاد کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کی ترغیب دی گئی ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (سورۃ النساء، ۴:۷۵)

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کمزور کر کے دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔

۳۔ دشمن لوگوں پر مذہبی جبر کرے :

اگر دشمن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلنے سے روکے یا دین اور مذہب پر پابندیاں عائد کرے۔ اللہ تعالیٰ مذہب کے معاملے میں جبر و اکراہ کی اجازت نہیں دیتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے : لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ، یعنی دین کے بارے میں جبر نہ کیا جائے۔ اسی طرح قرآن حکیم میں فرمانِ خداوندی ہے :

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا (الحج، ۲۲:۴۰)

اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں، گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، یقیناً مسمار کر دی جائیں۔

۴۔ دشمن عہد شکنی کرے :

جو لوگ مسلمانوں سے معاہدہ کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی کریں ان کو سزا دینے کے لئے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ ارشادِ ربانی ہے :

الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝

وہ لوگ جن سے آپ نے معاہدہ کیا ہو پھر وہ ہر بار معاہدے کو توڑ دیتے ہوں اور وہ خدا کا خوف نہیں کرتے پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے لوگ

اس سے عبرت حاصل کریں۔ (الانفال: ۵۶ تا ۵۷)

۵۔ دشمن فتنہ و فساد پھیلائے:

اگر دشمن فتنہ و فساد پھیلائے تو فتنے کو دور کرنے کے لئے جنگ کرنے کا حکم ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ

تم ان سے لڑتے رہو تا آنکہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ (البقرۃ، آیت ۱۹۳)

۶۔ اگر مسلمانوں کا ایک گروہ بعد از صلح دوسرے گروہ پر زیادتی کرے:

اگر کہیں ایسی انہونی صورتِ حال پیش آجائے کہ مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں (جیسے آجکل عراق اور ایران آپس میں لڑ رہے ہیں) تو دوسرے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ تماشہ نہ دیکھیں بلکہ ان کے درمیان صلح کرا دیں۔ پھر صلح ہو جانے کے بعد اگر ان میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو اس زیادتی کرنے والے گروہ کے خلاف جنگ کرنی چاہیئے تا آنکہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ

(الحجرات، ۴۹: ۹)

پھر اگر (بعد از صلح) ان دو گروہوں میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو اس زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو تا آنکہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت پیش آئے تو ظاہر ہے یہ اسلام اور اہلِ اسلام کے لئے ایک خطرہ ہو گا۔ اس کا انسداد نہ کیا جائے تو مسلمان مٹ کر رہ جائیں گے۔ مسلمانوں کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ مل کر فتنہ خیز قوتوں کے خلاف جنگ کریں۔ اس جنگ میں ان کے لئے ز[illegible] کا سامان ہو گا۔[1]

مسلمان[illegible] قطعاً اجازت نہیں کہ دنیاوی اغراض اور مفادات کے لئے خون بہاتا پھرے۔ ا[illegible]تعالیٰ[illegible] منشاء [illegible] ہے کہ اس کی ذات سے حق کی سچائی اور باطل کی بے ثباتی ثابت کرے۔

ارشادِ ربّانی ہے:

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ۔

ترجمہ: (جنگ کا حکم اس لئے ہے) تاکہ حق، حق ہو کر رہے اور باطل، باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے (الانفال، ۸: ۸)

---

[1] دیکھو سورۃ الانفال۔ ۲۴

اسلام کے مجاہدین جب بھی میدانِ جہاد میں نکلتے ہیں حق کی مدافعت کے لئے سُورۃ الانفال کی پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صاف کہا ہے کہ میں نے آپ کو امرِ حق میں مدینہ سے نکال کر مشرکوں کے مقابلہ پر روانہ کیا۔

فتح کے اسباب :

جنگ کثرتِ نفوس سے نہیں جیتی جاتی۔[1] اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے درجِ ذیل احکام ہیں :

۱۔ **ذکرِ الٰہی :** اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو۔[2]

۲۔ **اطاعتِ رسول :** اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام مانو اور ان سے منہ نہ موڑو۔[3]

۳۔ **عاجزی :** کامیابی پر پھول نہ جاؤ، غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔

۴۔ **ثابت قدمی :** ثابت قدم رہو۔ فوج میں عزم و ثبات ہو وہ اپنے سے دس گنا لشکر کو زیر کر لیتی ہے اور اگر بہت کم ساز و سامان بھی ہو تو کم از کم دوگنے لشکر کو شکست دے سکتی ہے۔[4]

۵۔ **اتحاد و اتفاق :** متحد رہو۔ اگر تم میں اختلاف ہوا تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

سُورۃ الانفال ہمیں بتاتی ہے کہ جہاد کی پکار ہو تو درج بالا اصولوں کو سامنے رکھ کر جنگ میں بے خطر کود پڑنا چاہیئے۔ مسلمان جب صلح کے سب طریقے آزما چکیں اور آخر کار تلوار آزمانا ہی پڑے تو بے جگری سے لڑیں۔ جب تک دشمن ہتھیار نہ ڈالے لڑائی جاری رکھیں۔

قیدی ہاتھ آئیں تو حسنِ مروت سے انہیں اسلام کی دعوت دیں وہ مان لیں تو بہتر ورنہ جبر نہ کریں۔ کیونکہ تبدیل مذہب میں جبر نہیں۔

جہاد کی فضیلت :

اسلام میں جہاد کو بڑی فضیلت حاصل ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کی فضیلت کا بہت ذکر ملتا ہے، مثلاً :

دائمی و ابدی زندگی : اللہ کی راہ میں جان دینے والے کو دائمی و ابدی زندگی حاصل ہوتی ہے اور اسے مردہ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

---

[1] دیکھو سُورۃ الانفال۔ ۱۹

[2] دیکھو سُورۃ الانفال۔ ۴۵

[3] سُورۃ الانفال

[4] دیکھو سُورۃ الانفال

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (البقرۃ، آیت: ۱۵۵)

اور اللہ کی راہ میں جو قتل ہوں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس بات کا شعور نہیں ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (آل عمران، آیت ۱۶۹)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انہیں مُردہ نہ سمجھو بلکہ وہ تو زندہ ہیں، اپنے رب کے ہاں رزق دیئے جاتے ہیں۔

جہاد کرنے والے ہی ایمان میں صادق ہیں

اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہ کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ (الحجرات۔ آیت ۱۵)

جنّت کا وعدہ:

اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ نے جنّت کا وعدہ کیا ہے، ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ق وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ط وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، وہ (دشمن کو) قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کے ذمے تورات، انجیل اور قرآن میں برحق وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ پس تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ سے کیا ہے اور یہی عظیم کامیابی ہے۔

اللہ کے ہاں عظیم ترین درجہ:

جہاد فی سبیل اللہ کرنے والوں کا اللہ کے ہاں عظیم ترین درجہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ (التوبۃ، آیت ۲۰)

اللہ کے ہاں تو انہیں لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا۔ وہی لوگ کامیاب ہیں۔

اللہ اُن سے محبت کرتا ہے:

جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اللہ اُن سے محبت کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (سورۃ الصف، ۶۱:۴)

اللہ کو تو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

احادیث نبویہ:

نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی جہاد کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ چند احادیث مبارکہ کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ اسلام میں جہاد کی کس قدر فضیلت ہے:

- اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن محاذِ جنگ پر گزارنا دُنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔
  (ریاض الصالحین کتاب الجہاد)
- جو شخص اللہ کی راہ میں ایک تیر چلاتا ہے اسے ایک غلام آزاد کرنے کا بدلہ ملتا ہے۔
- اللہ تعالیٰ اس ایک تیر کے عوض جو اس کے راستے میں چلایا گیا ہے۔ تین اشخاص کو جنت میں داخل کرتا ہے۔ ایک اس کا بنانے والا، دوسرا چلانے والا اور تیسرا اس کا مہیا کرنے والا۔
- جس شخص کے پاؤں اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوں ان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ (بخاری)
- جنت میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص دنیا میں اس خیال سے دوبارہ آنے کو پسند نہیں کرے گا کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس کو پھر مل جائے مگر شہید کی خواہش ہوگی کہ وہ دنیا میں دوبارہ جائے اور دس مرتبہ شہید ہو، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ شہادت کا اجر و ثواب کیا ہے۔ (بخاری و مسلم)
- حضرت ابوذر غفاری رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: سب سے افضل کونسا عمل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔
  (بخاری و مسلم)

- اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے ایک صبح یا شام کا سفر دُنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور اللہ کی راہ میں دشمن کے مقابلے میں ٹھہرنا گھر کی ستر برس کی نمازوں سے بہتر ہے۔

جہاد کے آداب :

اسلام نے جنگ کی اجازت چونکہ ایک اعلیٰ نصب العین کے لئے دی ہے، دنیاوی مفادات کے لئے نہیں، اس لئے جہاد کے دوران میں کچھ باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور بعض سے روکا ہے۔ ہم ان کو جہاد کے آداب یا جنگ میں اصلاحات کہہ سکتے ہیں۔ نبی کریمؐ کوئی مہم روانہ کرتے وقت سالار لشکر کو جو ہدایات دیا کرتے تھے اور پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لشکرِ اُسامہؓ کو روانہ کرتے وقت جو ہدایات دی تھیں ان میں سے چند اہم ہدایات درج ذیل ہیں :

۱۔ لڑائی شروع کرنے سے قبل دشمن کو تین باتوں میں سے کسی ایک کے قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور اگر وہ قبول کرلے تو حملہ نہ کیا جائے : (الف) اسلام کی دعوت (ب) اسلامی ملک میں مسلمانوں کی پناہ میں آجائے۔ اس صورت میں اس کو جملہ شہری حقوق اور آزادیاں حاصل ہوں گی۔ (ج) اطاعت قبول کرکے جزیہ دینا قبول کرلے اور اپنے ملک میں مکمل خود مختاری کے ساتھ رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام لڑائی سے اجتناب کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

۲۔ بدعہدی اور بے وفائی نہ کی جائے۔

۳۔ بچوں، بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے۔

۴ بیماروں، زخمیوں، معذوروں، عبادت گاہوں میں مقیم مذہبی پیشواؤں سے تعرض نہ کیا جائے۔

۵۔ دشمن کے مکانات نہ جلائے جائیں۔

۶۔ پھلدار درخت نہ کاٹے جائیں اور نہ ہی فصلوں کو بلاوجہ نقصان پہنچایا جائے۔

۷۔ کھانے کی ضرورت کے سوا جانوروں کو تلف نہ کیا جائے۔

۸۔ قیدیوں میں غیروں کو قتل نہ کیا جائے۔

اسلام میں مُثلہ (اعضاء کا کاٹنا) تو جانوروں کا کرنا بھی ممنوع ہے۔ مُثلہ کی ممانعت تو عام ہے۔ لہٰذا جوش انتقام میں آکر کسی دشمن فوجی کا مُثلہ کرنا بھی ممنوع ہے۔

غنیمت : اس لفظ کا مادہ ہے، غَنِمَ یعنی اس نے حاصل کیا۔
غنیمت کے لُغوی معنی ہیں : حاصل کرنا۔

عرب میں اسلام سے پہلے حصولِ مال کا بڑا ذریعہ جنگ کی لوٹ تھا۔ اس لئے اسے بھی غنیمت کہنے لگے۔ ایک خیال ہے کہ اس کا مادہ غنم ہے جس کے معنی ہیں بھیڑ بکریاں۔ عربوں کے سرمایہ کا بڑا حصہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہوتے تھے۔ قبیلوں کی جنگ میں فریقِ غالب کو مغلوب کا جو مال ہاتھ آتا اس میں زیادہ تر بھیڑ بکریاں ہوتی تھیں۔ اس میں جنگ میں ہاتھ آئے ہوئے مال کو غنیمت کہنے لگے۔ غنیمت میں مال و اسباب کے علاوہ اسیرانِ جنگ بھی شامل ہیں۔

اس کے قریب المعنی ایک اور لفظ فَے ہے جو قرآن مجید میں آیا ہے۔ فَے اس مال کو کہتے ہیں جو کسی ملک یا قوم نے بغیر جنگ کے اسلامی ریاست کو پیش کیا ہو۔

غنیمت کے لئے قرآن حکیم نے انفال کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

غنیمت کے جائز ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ منتے تا فکر پر حملہ نہ کیا جائے۔ صرف مدافعتی جنگ میں غنیمت کی اجازت ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ جنگ خوب زور سے گرم ہو چکی ہو۔ اس میں چونکہ مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان ہوتا ہے اس لئے تلافی کے لئے غنیمت مباح اور حلال ہے۔ موجودہ عہد میں بھی مغلوب فریق سے تاوانِ جنگ وصول کیا جاتا ہے۔ غنیمت بھی درحقیقت تاوانِ جنگ ہی کا نام ہے۔ یاد رہے کہ اس کے لئے یہ شرط ازبس ضروری ہے کہ جنگ میں پہل دشمن نے کی ہو۔

شروع میں اسلامی فوج کی تنخواہیں مقرر نہ تھیں۔ انہیں مالِ غنیمت ہی سے حصہ ملتا تھا۔ غنیمت کا سب مال ایک جگہ جمع ہوتا تھا۔ پانچواں حصہ الگ ہو کر بیت المال یعنی قومی خزانے میں جاتا تھا۔ چار حصے مجاہدین پر تقسیم ہو جاتے تھے۔ جو حصہ بیت المال میں جاتا تھا اس کے سورۃ الانفال (آیت ۴۱) کی رو سے حسبِ ذیل پانچ مصارف ہیں:

(۱) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۲) ذوالقربیٰ (۳) یتامیٰ
(۴) مساکین (۵) ابن السبیل

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے حصے کا مال بھی عموماً دوسروں کو عطا کر دیتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا ہے:

مَالِیَ اِلَّا الْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ لَکُمْ

یعنی میرے لئے تو (خمس کا) صرف پانچواں حصہ ہے اور یہ بھی تمہیں لوٹا دیا جاتا ہے۔

جنگ میں قیدی بنانے کا رواج آج بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اسلام قیدیوں سے شفقت کا سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے جیسا کہ جنگِ بدر کے واقعات سے ظاہر ہے۔ ان کے ساتھ اخلاق کا

عمدہ نمونہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوں۔ انہیں قتل کرنے کی اجازت نہیں۔ قرآن حکیم کی ہدایت ہے کہ انہیں فدیہ لے کر یا بطورِ احسان رہا کر دیا جائے۔[1]

ان کا کوئی فدیہ دینے والا نہ ہو اور انہیں غلامی ہی میں رکھا جائے تو ان کے ساتھ برادرانہ اور مساویانہ سلوک کیا جائے۔ غلام کو اختیار ہے کہ کسی وقت اپنی قیمت دے کر جان چھڑا لے۔ اس کا مالک اس پر ظلم کرے اور حاکم عدالت کو اس کا ثبوت مل جائے تو وہ اس کی آزادی کا حکم دے سکتا ہے۔ لوگ غلامی کا اعتراض کرتے وقت لفظِ غلام کو اپنی لغت کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی مفہوم کے اعتبار سے غلام کی حیثیت بھائی کی سی ہے۔ یہاں تک کہ بعض صورتوں میں وہ اپنے مالک کا وارث بھی ہوتا ہے۔

سوالات

۱۔ اسلامی اخوت سے کیا مراد ہے؟ اخوت اسلامی کی ضرورت و اہمیت قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کیجئے۔

۲۔ اخوت اسلامی کی نمایاں خصوصیات قلمبند کیجئے۔

۳۔ تبلیغ کا مفہوم بیان کیجئے۔ اسلام میں تبلیغ کو جو اہمیت حاصل ہے قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کیجئے۔

۴۔ تبلیغ کے طریقے اور اس کی صورتیں بیان کیجئے۔ نیز تبلیغ کے فوائد پر روشنی ڈالئے۔

۵۔ جہاد سے کیا مراد ہے؟ جہاد اور جنگ میں کیا فرق ہے؟ جہاد کے آداب بیان کیجئے۔
(یا اسلام نے جنگ میں جو اصلاحات کی ہیں ان کو بیان کیجئے)

۶۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جہاد کی فضیلت و اہمیت بیان کیجئے۔

۷۔ جہاد اور قتال میں کیا فرق ہے؟ جہاد کی اجازت کن حالات میں ہے؟ (یا جہاد کی شرائط بیان کیجئے)

۸۔ غنیمت سے کیا مراد ہے؟ اس کے جائز ہونے کی شرط کیا ہے؟ نیز غنیمت کے مصارف قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کیجئے۔

---

[1] دیکھو سورۃ محمدؐ آیت ۴۔